کلامِ نبوت

جلد چہارم

مع ترجمہ و تشریح

مرتّبہ

محمد فاروق خاں

✪ غصب	۶۸	✪ تسعیر (نرخ مقرر کرنا)	۹۱
✪ سود	۶۹	✪ چراگاہ	۹۲
✪ رشوت	۷۷	✪ ضمان	۹۳
✪ قمار (جوا)	۷۸	✪ صلح	۹۴
✪ شراب کی بیع	۸۰	✪ حوالہ	۹۴
✪ حرام کی کمائی	۸۳	✪ جھاڑ پھونک پر اُجرت	۹۵
✪ مشتبہ چیزوں سے پرہیز	۸۵	✪ حقوق ملکیت کا احترام	۹۷
✪ قحبہ گری	۸۶	✪ لقطہ	۹۸
✪ شفعہ	۸۷		

مصارف یا تقسیمِ دولت

✪ انفاق کی اہمیت	۱۰۱	✪ عاریت (مستعار)	۱۳۱
✪ ناجائز اخراجات	۱۰۳	✪ ہبہ	۱۳۲
✪ مال ضائع کرنا	۱۰۵	✪ وقف	۱۳۵
✪ اقتصاد و توسط	۱۰۹	✪ قرض	۱۳۸
✪ احتکار یا ذخیرہ اندوزی	۱۱۰	✪ ودیعت	۱۴۶
✪ زکوٰۃ	۱۱۲	✪ حجر	۱۴۷
✪ صدقۂ فطر	۱۲۱	✪ تاوان	۱۴۸
✪ عام صدقات	۱۲۳	✪ قحط	۱۵۰
✪ تعاون و ہمدردی	۱۲۵	✪ قانون وراثت	۱۵۰
✪ سائل کا حق	۱۲۶	✪ وراثت	۱۵۷
✪ اجارہ	۱۲۶	✪ وصیت	۱۶۳
✪ ہدیہ	۱۲۸		

باب دوم

سیاست وحکومت

٭ سیاست وحکومت	۱۶۹	٭ ایجابی واصولی ریاست	۱۷۷
٭ اسلامی حکومت: امتیازی خصوصیات	۱۷۴	٭ اسلامی حکومت کے مقاصد	۱۷۹

اسلامی ریاست کی بنیادیں

٭ تصور کائنات وحیات	۱۸۲	٭ اطاعتِ رسولؐ	۱۸۶
٭ حاکمیت الٰہ	۱۸۳	٭ خلافت	۱۸۸

امارت

٭ اِمارت کی طلب	۱۹۱	٭ اجتماعی نظم	۲۰۳
٭ امیر کا انتخاب	۱۹۲	٭ امیر کی تعظیم	۲۰۷
٭ بہترین قیادت	۱۹۵	٭ اتحاد	۲۰۸
٭ بدترین قیادت	۱۹۸	٭ شورائیت	۲۰۹
٭ امیر کی ذمہ داری	۲۰۰		

نظم مملکت

٭ بیعت	۲۱۱	٭ حکومت کے حقوق وفرائض	۲۱۲

شہریت

٭ شہریت	۲۱۷	٭ اہل ذمہ یا غیر مسلموں کے حقوق	۲۲۳

نظامِ عدالت

✪ نظامِ عدالت	۲۲۹	✪ سفارش	۲۴۰
✪ منصبِ قضا	۲۲۹	✪ رشوت	۲۴۱
✪ قسم	۲۳۵	✪ صلح	۲۴۲
✪ گواہی	۲۳۷		

قانون سازی اور اجتہاد

✪ قانون سازی اور اجتہاد	۲۴۴	✪ حق تنسیخ	۲۵۶
✪ ضرورت و مصلحت کا لحاظ	۲۴۸	✪ اچھی چیزوں کا باقی رکھنا	۲۵۷
✪ مباحات	۲۵۲	✪ سزائیں	۲۵۹
✪ حق تنقید	۲۵۴		

باب سوم

اظہارِ دین

✪ اظہارِ دین	۲۸۱	✪ قیدی	۲۹۵
✪ جہاد	۲۹۰	✪ معافی اور درگزر	۲۹۶
✪ آدابِ جنگ	۲۹۳		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

قارئین کی خدمت میں کلام نبوت جلد چہارم پیش کرتے ہوئے ہمیں بے حد مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ خدا کا احسان اور اس کا خاص کرم ہے کہ اس نے اپنے دین کی خدمت کا یہ موقع عنایت فرمایا۔ اس پر ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

اس کتاب کی اس سے پہلے کی جلدوں میں عقائد ونظریات، عبادات، اخلاقیات اور معاشرتی احکام سے متعلق احادیث کا انتخاب پیش کیا جا چکا ہے۔ جلد چہارم میں ہم اسلامی معاشیات اور اسلامی سیاست سے متعلق احادیث کا انتخاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کو ایک کامل دین اور انسانی زندگی کے لیے ایک جامع نظام حیات کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسلام کی دیگر تعلیمات کی طرح معیشت اور سیاست سے متعلق اس کی تعلیمات اور ہدایات بھی مبنی بر عدل وانصاف ہیں۔ کاش انسانیت ان تعلیمات سے بہرہ مند ہو سکتی۔

اللہ نے توفیق دی تو کلام نبوت جلد پنجم میں ہم اسلامی دعوت اور اس کے اصول و آداب کے سلسلے کی احادیث کا انتخاب پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔

خاکسار

محمد فاروق خاں

بابِ اوّل

اِسلامی نظامِ معیشت

اِسلامی نظامِ معیشت

انسان کی زندگی میں معیشت ہی سب کچھ نہیں ہے پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن نے مال کو انسان کے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ چناں چہ ارشاد ہے:

وَلاَ تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا (النساء:۵)

''اپنے مال جسے اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے بدعقلوں کو نہ دو۔''

مال و دولت سے ہمارے کتنے ہی کام چلتے ہیں اور کتنے ہی اچھے اور تعمیری کام اس کے ذریعہ سے پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اس لیے مال کو خیر بھی کہا گیا ہے۔ حدیث میں صحیح اسناد کے ساتھ آیا ہے:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ (احمد)

''صالح آدمی کے لیے اچھا مال بہترین شے ہے۔''

نظامِ معیشت کے سلسلے میں عام طور پر چار پہلوؤں سے غور کیا جاتا ہے:

۱- پیدائش دولت (Production of wealth)

۲- تقسیم دولت (Distribution of wealth)

۳- مبادلۂ دولت (Exchange of wealth)

۴- صرف دولت (Consumption of wealth)

نظامِ معیشت میں ان سارے ہی پہلوؤں سے عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی معاشیات اس کی زندگی کے دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر نہ رہے۔ بلکہ وہ انسان کے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی وغیرہ تمام ہی شعبوں

کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ زندگی کے کسی شعبے سے وہ متصادم نہ ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بات نہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں پائی جاتی ہے اور نہ اشتراکی نظامِ معیشت میں اس کا کہیں سراغ ملتا ہے۔

غیر اسلامی نظامِ معیشت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مادّی نقطۂ نظر ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ ہر معاملہ میں عدل کو ملحوظ رکھا جائے۔ کسی کے ساتھ بھی ظلم نہ ہو۔ اس کی فکر بہت کم ہوتی ہے۔ جو شخص جہاں ہے وہ صرف اپنے حقوق کے تحفظ کی فکر میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح سے دوسروں کے حصوں پر بھی زیادہ سے زیادہ اس کا قبضہ ہو جائے۔ اسے یہ سوچنے کی فرصت نہیں کہ سماج میں کسی قسم کی بے اطمینانی نہ پائی جائے۔ معاشرہ کسی معاشی مصیبت سے دوچار نہ ہو۔ کم سے کم بنیادی ضروریات ہر ایک شخص کی پوری ہوں۔ غریب اور دولت مند کے درمیان غیر معمولی فرق پیدا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی شخص کو تو جسم و جان کے رشتہ کو باقی رکھنا مشکل ہو رہا ہو اور کسی کو محض اپنی دولت کی فراوانی میں اضافہ ہی کی فکر لاحق ہو۔ دولت کی فراوانی کے باوجود لوٹ کھسوٹ کے سوا اُسے اور کچھ نہ آتا ہو۔ ایثار اور فیاضی اور سماج کی معاشی ترقی جیسی باتوں کا اسے بھولے سے بھی خیال نہ آتا ہو۔

اسلام نے معیشت کو مستقل بالذات کوئی شعبہ قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس نے اس شعبے کا تعلق اپنے دوسرے روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی شعبہ ہائے حیات سے قائم کیا ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کے کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس سے اس کا پورا جسم متاثر ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح معاشرت، معیشت یا زندگی کے کسی شعبے میں اگر کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس سے زندگی کے دوسرے شعبے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ اسلامی نظامِ فکر و عمل کی درستی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے تمام ہی شعبے صحیح نہج پر استوار ہوں، اور ان کے درمیان باہم ہم آہنگی اور مطابقت (Co-ordination) بھی قائم رہے۔ ایک شخص اگر بہ ظاہر اسلام کے اخلاقی اصولوں کا احترام کرتا نظر آتا ہے لیکن معاش کے معاملے میں وہ اگر اسلامی اصولوں کا پاس و لحاظ نہیں رکھتا تو اسلامی نقطہ نظر سے اسے ہرگز بااخلاق و باکردار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے میں باہم تعاون کا جذبہ کارفرما ہو۔ اور حسد و عداوت کے بجائے لوگوں کے درمیان رفاقت کا جذبہ کام کر رہا ہو۔

اسلام کے نزدیک کائنات اور کائنات کے اندر پائی جانے والی تمام ہی چیزوں کا اصل مالک خدا ہے۔ اور خود انسان بھی اسی کی ملک ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○
(المائدۃ:۱۸)

''آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب پر بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور جانا بھی اسی کی طرف ہے۔''

خدا نے کائنات کو انسان کے لیے سازگار بنایا ہے اور اس نے انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ کائنات اور اس کے اندر پائی جانے والی اشیاء سے فائدہ اُٹھائے۔ البتہ اس سلسلے میں اسے خدا کے مقرر کیے ہوئے ضابطوں اور قوانین کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ (لقمان:۲۰)

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے، اور اس نے تم پر اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں پوری کردی ہیں۔''

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ (البقرہ:۲۹)

''وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا فرمایا جو زمین میں ہے۔''

ایک جگہ فرمایا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ
(الاعراف:۱۰)

''اور ہم نے زمین میں تمھیں اقتدار و اختیار عطا کر رکھا ہے اور اس میں تمہارے لیے زندگی کے ذرائع فراہم کیے۔''

معلوم ہوا کہ کائنات کی تمام چیزیں اور قوتیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اور خدا نے جو ذرائع اور وسائل فراہم کیے ہیں وہ کسی خاص طبقے کے نہیں بلکہ سارے ہی انسانوں کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان سے استفادے کے لیے کسی خاص رنگ و نسل کی شرط ہرگز نہیں رکھی ہے۔ البتہ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے ضابطوں اور قوانین کا لحاظ رکھے۔ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ہے: اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِىْ كِتَابِهٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِىْ كِتَابِهٖ وَ مَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ'' حلال وہ ہے جس

کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کر دیا۔ اور جن چیزوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے (یعنی جن کا ذکر نہیں فرمایا) وہ معاف ہیں۔"

پھر حلت اور حرمت کے احکام بھی یوں ہی نہیں دیے گئے ہیں بلکہ وہ اس قاعدے پر مبنی ہیں:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (الاعراف:۱۵۷)

"وہ (نبیؐ خدا کے حکم سے) ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔"

اس کی مزید وضاحت نبی ﷺ کی یہ حدیث کرتی ہے: لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ "اسلام میں نہ ضرر جائز ہے اور نہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا روا ہے۔" کوئی چیز اگر انسان کے لیے مضرت رساں ہے تو وہ حرام ہے اور اگر کوئی چیز منفعت بخش ہے تو وہ حرام نہیں بلکہ حلال قرار پائے گی۔

اسلام نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح معاشیات کے سلسلہ میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ کسی شخص پر ظلم نہ ہو اور نہ وہ کسی پر ظلم کرے۔ اسی لیے اس نے ان تمام ہی راستوں کو بند کر دینا چاہا ہے جن کے ذریعہ سے ظلم کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ اس نے کسب مال کے حرام طریقوں پر پابندی لگا دی اور حکم دیا ہے کہ حرام طریقوں سے مال کمانے سے اجتناب کیا جائے۔ قرآن میں صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء:۲۹) "اے ایمان لانے والو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ اِلّا یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے کوئی تجارت ہو۔" اس سلسلے میں اسلام میں چوری، خیانت، قحبہ گری (Prostitution)، شراب، جوا اور سود وغیرہ کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ زر پرستی اور حرصِ مال کی مذمت کرتے ہوئے بخل اور اکتناز یعنی جمع خوری (Hoarding) کی ممانعت کی گئی ہے، اور فضول خرچ لوگوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ ہر معاملہ میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسلام نے ایسے معاملات کو ناجائز ٹھہرایا ہے، جن سے نزاع کے دروازے کھلتے ہوں۔ مثلاً قیمت اور مال کا تعین نہ ہو یا خریدار نے مال کو دیکھا نہ ہو اور یہ یقین نہ کیا جا سکتا ہو کہ جو مال اسے دیا جائے گا وہ

لازماً اس پر راضی ہوگا۔ اسی اصول کے تحت ان معاملات کی بھی ممانعت کردی گئی ہے جن میں عوضین یعنی قیمت اور مال میں سے کسی ایک کی سپردگی کا اختیار معاملہ کرنے والے کے ہاتھ میں نہ ہو۔ مثلاً قیمت خریدار کے قبضہ میں نہ ہو یا بائع کے ہاتھ میں چیز نہ ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو چیز تمہارے ہاتھ میں نہ ہو اس کی بیع نہ کرو۔'' مفسدہ کے پیش نظر آپؐ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی گیہوں خریدے اس وقت تک بیع نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا۔'' خرید و فروخت کے معاملات میں مخالفت کی ایسی صورتوں کو بھی اختیار کرنے سے روک دیا گیا ہے جن سے لوگوں کے درمیان حسد اور مخاصمت پیدا ہونے کا امکان اور اندیشہ پایا جاتا ہو۔ اور ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ آگے بڑھ کر دوسرے لوگوں کو اکتساب رزق سے محروم کردیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

> ''آبادی سے نکل کر بنجاروں کو راستے میں نہ جا کر پکڑو۔ ایک شخص دوسرے کی بیع میں مداخلت کرکے اپنی بیع نہ کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کی بولی پر بولی نہ دے۔ اور دوسروں کو خریداری سے باز رکھنے کی غرض سے بولی نہ بڑھائی جائے۔ اور شہر والا گاؤں والے کی طرف سے بیع کا مختار نہ بنے۔''

نفع کمانے اور غلے کی قیمتیں گراں کرنے کے مقصد سے اسے روک رکھنا جائز نہیں، یہ عامۃ الناس کے لیے موجب نقصان اور تکلیف دہ ہے۔ اس سے نظام تمدن میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا ہے: ''احتکار کرنے والے ملعون ہیں۔''

اپنے مال اور رزق کی ترقی کے لیے سعی کرنا روا ہے۔ بلکہ تمدن کی بقا کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔ ایک مقام سے جا کر دوسرے مقام پر تجارت کرنا، لوگوں کے مال کو کوشش کرکے فروخت کرانا۔ بہتر سے بہتر چیزیں تیار کرنا۔ اپنی صلاحیت اور قابلیت کے ذریعہ سے کوئی مفید اور کارآمد چیز ایجاد کرنی۔ ایسے سارے ہی کاموں کو اسلام قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جن سے لوگوں کی معاشی حالت کے بہتر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہو۔ البتہ اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ذرائع وہ اختیار کیے جائیں جن میں تعاون کی روح پائی جاتی ہو۔ ایسے طریقوں کا اختیار کرنا ممنوع ہوگا جن سے سماج کا کوئی طبقہ شدید مشکل میں پڑتا ہو یا جو عوام الناس کا عرصۂ حیات تنگ کرنے کے مترادف ہوں۔

کوئی بڑا کاروبار تنہا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے افراد کا تعاون حاصل ہو۔ اسی لیے شرکت اور مضاربت اور مزارعہ وغیرہ کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ دو آدمی مل کر کوئی تجارتی کاروبار کرتے ہیں۔ ایک کا سرمایہ ہے اور دوسرے کی محنت۔ حسب معاہدہ وہ منافع باہم تقسیم کر لیتے ہیں۔ اصطلاح میں اسے مضاربت کہتے ہیں۔ مزارعہ کی شکل زراعت میں اختیار کی جاتی ہے۔ ایک شخص زمین اور بیج فراہم کرتا ہے دوسرا کاشت کرنے میں اپنی محنت صرف کرتا ہے۔ اس طرح جو غلہ پیدا ہو اس میں دونوں شریک ہوں، یہ مزارعت ہے۔ معاشی تعاون اور اشتراک عمل کی ایسی تمام ہی صورتیں جائز ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ فریقین کے درمیان جو شرائط طے ہوں ان کی پوری پابندی کی جائے۔ البتہ معاہدہ اور شرائط میں اس کا لحاظ ضروری ہے کہ وہ ایسی نہ ہوں جن میں حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے لیا گیا ہو۔

کمائی کے ناجائز طریقوں کو ترک کرنے کے بعد انسان کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کے لیے جائز طریقے اختیار کرے۔ زراعت یا تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے دولت کمانے کا اُسے پورا اختیار ہے۔

دولت کہاں خرچ ہو؟ خرچ کرنے کے صحیح طریقے کیا ہیں؟ اس سلسلے میں صحیح رہنمائی ہمیں اسلام ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مادہ پرست ذہن کے لوگ تو مال کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرنا جانتے ہیں۔ یا پھر ایسے لوگ اپنے مال کو بڑھانے اور اس میں اضافہ کرنے کی غرض سے اسے کاروبار وغیرہ میں لگاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی ذاتی ضروریات پر معقول حد کے اندر خرچ کرنے کے علاوہ خرچ کی بہت سی مدات ہیں جو اپنی ذات پر خرچ کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً حق کے فروغ و اشاعت کے لیے مال خرچ کرنا۔ سماجی بہبود کے کاموں میں اپنا مال صرف کرنا، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور محتاجوں اور مسافروں اور حاجت مندوں کی حاجت روائی میں یا غلامی سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے یا قرض کے بوجھ سے لدے ہوئے لوگوں کو قرض سے سبکدوش کرانے وغیرہ میں مال خرچ کرنا۔ اس طرح کا انفاق کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ اسی طرح اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم رشتہ دار، پڑوسی، اجنبی پڑوسی اور ہم نشینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور تنگ حال لوگوں کی مدد کرنے میں بھی اپنا مال خرچ کریں

جو راہِ خدا میں ایسے گھِر گئے ہوں کہ زمین میں اپنی روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔(۱)

خرچ کی ایک اہم مد مالی کفارے بھی ہیں۔ اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی تلافی کے لیے اسلام میں مالی کفارے مقرر کیے گئے ہیں۔ مثلاً جو شخص قسم کھا کر قسم توڑ دے تو اسے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا ان کو کپڑا دینا ہوگا یا پھر ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اور جو ایسا نہ کر سکے تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ (المائدہ:۸۹)

پھر زکوٰۃ کو اسلام کے پانچ ارکان ___ ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ___ میں سے تیسرا رکن قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ ہمیشہ ہی اسلام کا رکن رہی ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم میراث کے ذریعہ سے بھی اسلام مال کو مرتکز رکھنے کے بہ جائے اسے آدمی کے قرابت داروں میں پھیلا دیتا ہے۔ وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ اسلام نے آدمی کو اپنے مال کے سلسلے میں وصیت کرنے کا بھی حق دے رکھا ہے۔ وہ جن کو مستحق سمجھتا ہو انھیں اپنے ترکہ میں سے حصہ دینے کی وصیت کر سکتا ہے۔ وہ اس کا بھی مجاز ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیت کر دے۔ البتہ دو تہائی اس کا مال لازماً میراث کے قانون کے مطابق تقسیم ہوگا۔ اسے ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ عام صدقہ اور خیرات کی بھی اسلام تلقین کرتا ہے۔ صدقات کے ذریعے سے غریبوں اور حاجت مندوں کے ساتھ احسان اور مواساۃ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ محتاج ہی نہیں جو کھاتے

---

(۱) ۱۹۹۸ء میں معاشیات کے شعبے میں نوبل پرائز حاصل کرنے والے پروفیسر امرتیہ سین اپنے مطالعہ، تحقیقات اور تجربات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نجی منافع کے اردگرد گھومتے رہنے کے بجائے معاشیات کا محور سماجی فلاح و بہبود ہونا چاہیے۔ معاشی نظام میں احسان اور خدمتِ خلق کی روح کی کارفرمائی ضروری ہے۔ سرمایہ اور بازار پر مبنی آج کی معاشیات میں اخلاق اور انسانی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کی شکایت رسکن نے بھی آج سے ایک صدی قبل Unto the last میں کی تھی۔ پروفیسر سین کے نزدیک اکنامکس کو ویلفیئر اکنامکس (Welfare Economics) ہونا چاہیے۔ جب تک آپس کے سماجی تعلقات اور باہم ایک دوسرے کے حقوق کی قدر و قیمت کو اہمیت نہیں دی جاتی کسی ملک کے معاشی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ملک کے صرف سرمایہ دار طبقہ کی خوش حالی کو ملک اور قوم کی خوش حالی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نظامِ معیشت ناقص اور ظالمانہ ہے جس میں غریبوں، محتاجوں، بے روزگاروں اور افلاس زدہ لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ایک چونکا دینے والی حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۴ء کا بنگال کا قحط جس میں ۳۰ لاکھ لوگوں کی موت واقع ہوئی تھی۔ اناج کی کمی کے سبب سے نہیں بلکہ ان لوگوں کی نااہلیت کی وجہ سے ہوئی تھی جو حکومت کی طرف سے غلہ کی تقسیم پر مامور تھے۔

پیتے لوگ ہیں ان کے ساتھ بھی اظہار اخوت ومواساۃ ہدیہ اور تحفہ ہے۔ شارع نے صدقہ کی ہی نہیں، ہدیہ بھیجنے کی تلقین بھی کی ہے۔ تا کہ سماج کے ہر طبقہ کے ساتھ اخوت ومودّت کا رشتہ استوار ہو سکے۔

خرچ کا ایک اہم ذریعہ وقف ہے یعنی کوئی مال یا جائداد حاجت مندوں کے حق میں اس طرح بخش دیا جائے کہ اصل ہمیشہ باقی رہے۔ اس کے منافع سے حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی رہے۔

اِسلامی معیشت

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ‌ن الْخُدْرِیِّ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اِنَّ ھٰذَا الْمَالَ خَضِرَۃٌ حُلْوَۃٌ وَ نِعْمَ صَاحِبُ الْمُسْلِمِ لِمَنْ اَخَذَہٗ بِحَقِّہٖ فَجَعَلَہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَ مَنْ لَّمْ یَاْخُذْہُ بِحَقِّہٖ فَھُوَ کَالْاٰکِلِ الَّذِیْ لَایَشْبَعُ وَ یَکُوْنُ عَلَیْہِ شَھِیْدًا یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''یہ مال سرسبز اور لذت بخش ضرور ہے اور مسلمان کا مال تو کیا ہی اچھا ہے! جو اسے حق کے ساتھ حاصل کرے پھر اسے خدا کے راستے میں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرتا رہے۔ اس کے برخلاف جو شخص اسے حق کے ساتھ حاصل نہیں کرتا (بلکہ ناجائز طریقے سے حاصل کرتا ہے) وہ اس کھانے والے شخص کی طرح ہے جسے کبھی سیری حاصل نہیں ہوتی اور وہ مال اس کے خلاف قیامت کے روز شاہد ہوگا۔

تشریح: اس ارشادِ گرامی سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی معیشت کا اصل امتیازی وصف کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مال وزر خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ لذیذ بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ لیکن اس کے باوجود انسان کی زندگی میں مال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے۔ درحقیقت اس شخص کے لیے ایک خوش گوار شے ہے جو مال کے حاصل کرنے میں جائز اور صحیح طریقے اختیار کرتا ہے اور اس کے خرچ کرنے میں بھی جائز مصارف کا خیال رکھتا ہے۔ مال کہاں خرچ کرنا چاہیے اور کہاں نہیں؟ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ واقف ہوتا ہے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوتا ہے۔ پھر ایک

مومن اور مسلم شخص سے ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ حصولِ مال میں جائز اور ناجائز طریقوں کے درمیان فرق کرے گا۔ وہ مال حاصل کرنے کے لیے ایسے طریقے ہرگز اختیار نہیں کرے گا جو ظلم اور زیادتی پر مبنی ہوں گے۔ اسی طرح مال کے خرچ کرنے میں بھی وہ خودغرضی سے کام نہیں لے گا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کسی کو مال اس لیے نہیں دیتا کہ وہ اسے محض اپنی ذات پر اور تعیش کے کاموں میں خرچ کرے۔ بلکہ آدمی کی اپنی ذاتی ضروریات کے علاوہ مال کے اہم مصارف اور بھی ہیں۔ مثلاً دین کی خدمت، یتیموں، مسکینوں، ضرورت مندوں اور مسافروں کی حاجت روائی وغیرہ مال اور سرمایہ کے اہم مصارف میں سے ہیں۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ کسی قوم و ملک میں اگر معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں تو وہ اصلاً اس لیے نہیں پیدا ہوتے کہ دنیا میں غذا اور ذرائع اور وسائل کی کمی ہے یا آبادی کی کثرت اس کا اصل سبب ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خوراک اور زندگی کی ضروری اشیاء میں غریبوں اور حاجت مندوں کے حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے باوجود انسانیت کے ایک حصے کے لیے خوش حالی اور دوسرے بڑے حصے کے لیے بھوک اور افلاس کو روا رکھا گیا ہے۔ اس نظامِ معیشت کو غیر انسانی اور غیر فلاحی نظام معیشت ہی کہا جائے گا۔ عام انسانوں اور ان کے مسائل کا نہ مطالعہ کیا جاتا ہے اور نہ اس سلسلے میں انسانی اقدار اور اخلاقی تقاضوں کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے۔ جس سے عام انسانوں کے معاشی مسائل کے حل کی راہ نکل سکے۔ اسلام نے دولت مند اور صاحب ثروت لوگوں کے مال میں غریبوں اور مسکینوں اور ضرورت مندوں کا حق رکھا ہے۔ اور سب ہی کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرنے پر اُبھارا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ مال اور سرمایہ ہی کو زندگی میں سب کچھ سمجھتے ہیں ان کی حرص اور طمع کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ مال وزر حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں وہ جائز و ناجائز میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ حلال ہو یا حرام جس طرح بھی ممکن ہو انھیں تو صرف اپنی دولت میں اضافہ کرنے ہی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ ایسے لوگ نہ مستحقین اور ناداروں کا حق پہچانتے ہیں، اور نہ انھیں دوسروں کی تکلیف اور ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی حرص کا خاتمہ کبھی نہیں ہوتا۔ وہ حقیقی سکون اور قناعت کی لذت سے ناآشنا ہی رہتے ہیں۔ ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہوتی ہے جو مسلسل کھاتا رہتا ہے لیکن اسے سیری حاصل نہیں ہوتی۔ کھانے کے باوجود اس کی

بھوک کبھی مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ یا پھر اس کی مثال استسقاء کے مریض کی سی ہوتی ہے جس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ وہ جتنا پانی پیتا ہے اتنی ہی زیادہ اس کی پیاس شدت اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

دولت کی حیثیت

﴿۱﴾ عَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: اَرْسَلَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہُ ﷺ: اَنِ اجْمَعَ عَلَیْکَ سِلَاحَکَ وَ ثِیَابَکَ ثُمَّ ائْتِنِیْ۔ قَالَ فَاَتَیْتُہٗ وَھُوَ یَتَوَضَّأُ فَقَالَ: یَا عَمْرُو، اِنِّیْ اَرْسَلْتُ اِلَیْکَ لِاَبْعَثَکَ فِیْ وَجْہٍ یُسَلِّمُکَ اللّٰہُ وَ یُغَنِّمُکَ وَ اَزْعَبُ لَکَ زُعْبَۃً مِنَ الْمَالِ۔ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، مَاکَانَتْ ھِجْرَتِیْ لِلْمَالِ وَمَا کَانَتْ اِلَّا لِلّٰہِ وَ لِرَسُوْلِہٖ، قَالَ: نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔

(شرح السنۃ، احمد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے پاس کہلا بھیجا کہ ”اپنے ہتھیاروں اور اپنے کپڑوں کو اکٹھا کرلو اور میرے پاس آ جاؤ۔“ حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ اس وقت وضو کر رہے تھے۔ فرمایا: ”اے عمرو، میں نے تمھیں اس لیے بلا بھیجا کہ میں تمھیں ایک سمت روانہ کروں۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے اور تمھیں مال غنیمت عطا فرمائے اور کچھ مال میں بھی تمھیں دوں۔“ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ، میری ہجرت مال و دولت کے لیے نہ تھی۔ وہ تو محض اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا مال نیک شخص کے لیے اچھی شے ہے۔“

تشریح: ایک روایت کے مطابق حضرت عمرو ابن العاصؓ نے ۵ ھ میں اسلام قبول کیا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ نبی ﷺ نے انھیں عمان کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ اغلب ہے کہ یہ روایت اسی موقع سے متعلق ہو جب حضور ﷺ انھیں عامل و حاکم بنا کر عمان بھیج رہے تھے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مال و دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں مال کوئی قابلِ نفرت شے نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ شرط یہ ہے کہ مال صالح ہو یعنی وہ حرام اور ناجائز ذرائع سے حاصل کیا ہوا نہ ہو اور وہ اس شخص کے ہاتھ میں ہو

جو مردِ صالح ہو۔ کیوں کہ مال کو صحیح طریقے سے وہی خرچ کرسکتا ہے۔ غیر صالح شخص کے ہاتھ میں پہنچ کر مال ضائع ہی ہوگا۔ وہ اسے غلط مصارف میں خرچ کرکے اپنی عاقبت ہی خراب کرے گا۔ دوسروں کو اس کے مال سے کوئی فائدہ پہنچے اس کی توقع اس سے نہیں کی جاسکتی۔

اچھا مال اچھے شخص کے لیے اچھی چیز ہے۔ یہ کوئی بُری شے نہیں ہے۔ نیک شخص اگر مالدار ہے تو وہ اس پوزیشن میں ہوگا کہ وہ خیر اور بھلائی کے ان کاموں کو بہ آسانی انجام دے سکے جن کی انجام دہی سرمایہ اور دولت کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔

شرح السنہ کی ایک روایت میں **نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ** کے بجائے یہ الفاظ آئے ہیں:

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ

''اچھی شے ہے اچھا مال مردِ صالح کے لیے۔''

مال کو خدا نے انسان کی بقا اور قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ مال نعمت ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں ہے: **وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا** (النساء:۵) ''اور اپنے مال جسے اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے بدعقلوں کو نہ دو۔''

〈۲〉 وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ ِالْخُدْرِیِّؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِحَقِّهٖ وَوَضَعَهٗ فِیْ حَقِّهٖ يَنْعَمُ الْمَعُوْنَةُ هُوَ وَمَنْ اَخَذَهٗ بِغَيْرِ حَقِّهٖ كَالَّذِیْ يَاْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَ يَكُوْنُ عَلَيْهِ شَهِيْدًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''یہ مال ہرا بھرا اور دل آویز ہے۔ جو شخص اسے جائز طریقے سے حاصل کرے اور جائز مصارف میں خرچ کرے تو وہ بہترین مددگار ہے۔ اور جو شخص اسے ناجائز طریقے سے حاصل کرے تو وہ اس شخص کے مانند ہوتا ہے جو کھاتا رہتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور وہ مال قیامت کے روز اس کے خلاف شاہد ہوگا۔''

تشریح: اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مال آدمی کے لیے نعمت بھی ہے اور وہ اس کے لیے مصیبت بھی بن سکتا ہے۔ اس کا انحصار آدمی کے اس رویہ پر ہے جو وہ مال و دولت کے سلسلے میں

اختیار کرتا ہے، جو لوگ حصول مال کے لیے ناجائز اور غلط طریقے اختیار نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اس کے لیے جائز اور درست ذرائع اختیار کرتے ہیں اور مال کو جائز مصارف ہی میں خرچ کرتے ہیں۔ مال سے جہاں وہ اپنی ذاتی ضرورتیں پوری کرتے ہیں وہیں وہ اسے اپنے رشتہ داروں، محتاجوں، مسکینوں پر اور دین کے کاموں میں بھی خرچ کرتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کو وہ اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے ان کا مال مصیبت نہیں بلکہ بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مال سے ان کی معیشت بھی درست رہتی ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ خدا کی خوشنودی اور رضا بھی حاصل کرتے ہیں۔

اس کے برخلاف کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے یہاں مال و دولت کو مقصودِ حیات کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ دولت کے حاصل کرنے میں جائز و ناجائز کی کوئی تمیز نہیں کرتے۔ بس دولت حاصل ہونی چاہیے خواہ وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔ اس کے لیے وہ دوسروں کے حقوق بھی غصب کر سکتے ہیں اور سودی کاروبار بھی چلا سکتے ہیں۔ وہ نہ ضرورت مندوں اور محتاجوں کے حقوق پہچانتے ہیں اور نہ ان کی دولت دین کے کسی کام آتی ہے۔ ایسے لوگ دولت کے سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی حصول دولت کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی ہوتی ہے جو کھاتا ہے مگر اس کی بھوک مٹتی نہیں۔ اسے کبھی سیری حاصل نہیں ہوتی۔ وہ بھوکا کا بھوکا ہی رہتا ہے۔ یہ حال تو اس کا اس موجودہ زندگی میں ہوتا ہے۔ رہی آخرت کی زندگی تو وہاں بھی وہ گرفتار عذاب رہے گا۔ وہ مال جس کی طلب میں اس کی زندگی گزری اس بات کا واضح ثبوت بن جائے گا کہ وہ خدا کا نافرمان رہا ہے۔ اس نے ناجائز ذرائع سے مال حاصل کیے اور پھر اسے خدا کی بغاوت اور ناپسندیدہ کاموں میں صرف کیا۔ اسے نہ کبھی خدا یاد آیا اور نہ حق داروں کے حقوق اسے یاد آئے۔ جب دولت کے کمانے میں جائز و ناجائز طریقوں میں فرق نہ کر سکا تو اس سے اس کی توقع کی بھی نہیں جاسکتی تھی کہ دولت کا اس کے یہاں کوئی صحیح مصرف بھی ہوسکتا ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: رَاٰی سَعْدٌ اَنَّ لَهٗ فَضْلاً عَلٰی مَنْ دُوْنَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَ تُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَآئِكُمْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت مصعبؒ بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ (میرے والد) حضرت سعدؓ کو گمان ہوا کہ

انھیں اپنے سے کمتر پر فضیلت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھیں مدد اور رزق محض تمھارے کمزوروں اور ناداروں کی وجہ سے ملتا ہے۔“

تشریح: حضرت سعدؓ شجاعت، سخاوت اور جود و کرم میں ممتاز تھے۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ ضعیف و ناتواں اور مفلس لوگوں کے مقابلے میں انھیں فضیلت حاصل ہے۔ نبی ﷺ نے اس خیال وگمان کی اصلاح کی غرض سے وہ بات فرمائی جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ آپؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے سوچنے کا یہ انداز مناسب نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں تو ان کے لیے عزت واحترام کا جذبہ ہونا چاہیے جو بہ ظاہر ان کے مقابلے میں کمتر دکھائی دیتے ہیں۔ شکستہ دلوں اور ناداروں پر خدا کی خاص توجہ ہوتی ہے جن کے دلوں میں اخلاص و ایمان کی دولت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی دعائیں خدا کی جناب جلد قبول ہوتی ہیں۔ دشمنوں کے مقابلے میں اگر فتح ونصرت حاصل ہوتی ہے یا دولت ہاتھ آتی ہے یا کاروبار اور تجارت میں نفع حاصل ہوتا ہے تو اس میں ان ناداروں اور شکستہ حالوں کی دعاؤں کا بھی دخل ہوتا ہے جو بہ ظاہر کمزور اور کمتر نظر آتے ہیں۔

(۴) وَعَنْ رَجُلٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَابَأْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَالصِّحَّةُ لِمَنِ اتَّقٰى خَيْرٌ مِّنَ الْغِنٰى وَطِيْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِيْمِ. (احمد، ابن ماجہ)

ترجمہ: نبی ﷺ کے صحابہ میں سے ایک شخص سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”ایسے شخص کے لیے دولت مندی کوئی بری شے نہیں جو اللہ عزوجل کا ڈر رکھے اور متقی کے لیے صحت دولت سے بہتر ہے اور شادمانی اور خوش دلی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔“

تشریح: دولت خدا کی بخشی ہوئی ایک نعمت ہے بہ شرطے کہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی ہو۔ آدمی اگر خدا سے ڈرتا رہے اور مال و دولت کو اس کے صحیح مصارف میں خرچ کرے تو دولت کے ذریعے سے وہ خدا کی خوش نودی اور جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرسکتا ہے۔ حضرت عثمانؓ دولت مند اور صاحبِ ثروت تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کی۔ اس پر خدا کے رسولؐ کی طرف سے انھیں بڑی بڑی بشارتیں ملیں۔ لیکن بالعموم لوگ مال و دولت پاکر بہک

جاتے ہیں۔ اور دولت کا صحیح استعمال نہ کر کے وہ اعلیٰ مقام حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں جسے وہ بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔

صحت اور دل کا نشاط اور خوشی یہ سب خدا کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں۔ کسی کو اگر یہ نعمتیں حاصل ہیں تو اسے خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اس کو ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جن سے کتنے ہی لوگ محروم ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ صحت کا درجہ دولت سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی ہو۔ یعنی آدمی خدا سے ڈرتا ہو۔ اگر تقویٰ نہ ہو تو صحت کس کام کی۔ ایسا شخص تو اپنی قوت اور توانائی غلط راہوں میں ہی ضائع کرے گا اور اس کے نتیجے میں خدا کا غضب ہی اس کے حصے میں آسکے گا۔

〈۵〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔“

تشریح: اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے مال و دولت کو کتنی اہمیت دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کی زندگی میں دولت کے علاوہ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جو مال و دولت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن مال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مال دنیا میں انسان کی بقا اور قیام کا ذریعہ ہے۔ اپنے مال کی حفاظت میں اگر کوئی شخص مارا جاتا ہے تو اس کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دنیا کے لیے جان دی۔ اسلام میں دین و دنیا کی اس طرح کی تفریق کا تصور نہیں پایا جاتا۔ جس نے مال و دولت کی حفاظت میں جان دی جو خدا کی عطا تھی۔ اور وہ صحیح اور جائز مصارف میں صرف کرنے کے لیے تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔

〈۶〉 وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدِؓ بْنِ مَالِكٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ ذُرِّيَّتَكَ اَغْنِيَآءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ (بخاری)

ترجمہ: حضرت عامر بن سعدؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم اپنی اولاد کو مال دار چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں محتاج چھوڑو کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔“

تشریح: یعنی دینی اعتبار سے یہ کوئی غلط بات نہیں ہے کہ آدمی اس بات کی فکر رکھے کہ اس کے پیچھے اس کی اولاد کی معاشی حالت بہتر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ محتاج ہو اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو۔

نبی ﷺ کے ارشاد کا ایک پس منظر بھی ہے۔ جس سے اس حدیث کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی عیادت کے لیے حضور ﷺ تشریف لائے۔ انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں اپنے کل مال کی وصیت کر جاؤں (کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے) آپؐ نے فرمایا: نہیں انھوں نے نصف مال کی وصیت کی خواہش ظاہر کی۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ انھوں نے تہائی کے لیے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا: ''ثلث میں مضائقہ نہیں، ثلث بھی زیادہ ہے۔ تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ جاؤ وہ اس سے بہتر ہے کہ ان کو محتاج چھوڑ جاؤ کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ تم جو بھی بہ غرض ثواب خرچ کروگے وہ صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں اٹھا کر دوگے وہ بھی صدقہ میں محسوب ہوگا۔'' مطلب یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے اگر مال تم چھوڑوگے تو ایسا نہیں ہے کہ اس کا شمار نیکی میں نہ ہو۔ اپنی بیوی کو جو کھلاتے پلاتے ہو وہ بھی تمہارے نیک اعمال میں شمار ہوتا ہے۔ مومن کو نیکی کا حریص ہونا چاہیے لیکن اسے یہ بھی جاننا چاہیے کہ نیکی کا تصور اسلام میں بہت وسیع ہے۔ اس کی کوئی خاص ایک شکل نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام نیکی ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے اچھے جذبے کے ساتھ جو بھلائی کرے گا اس کا شمار بھی اس کی نیکیوں ہی میں ہوگا۔

‹۷› وَعَنْ حَكِيْمِ ابْنِ حِزَامٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ هٰذَا الْمَالَ خَضِرَةٌ حُلْوَةٌ فَمَنْ اَخَذَهٗ بِطِيْبِ نَفْسٍ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَمَنْ اَخَذَهٗ بِاِشْرَافِ نَفْسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهٗ فِيْهِ وَكَانَ كَالَّذِيْ يَاْكُلُ وَلَا يَشْبَعُ وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى. (بخاری)

ترجمہ: حضرت حکیم ابن حزامؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ مال تر و تازہ اور دل آویز و شیریں ہے، پس جو شخص اسے پاکیزگیِ نفس کے ساتھ لے گا اس کے لیے اس میں برکت ہوگی اور جو کوئی اسے بخل نفسی کے ساتھ لے گا، اس کے لیے اس میں برکت نہ ہوگی۔ اور وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔ اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

تشریح: مال ایک نعمت اور دل آویز شے ہے۔ اسے حاصل کرنا برا نہیں لیکن ضروری ہے کہ اس کے ساتھ پاکیزگیِ نفس (ایک روایت کے مطابق سخاوتِ نفسی) ہو۔ مال حاصل کرنا ہی نہیں آدمی کو اچھے اور نیک کاموں میں خرچ کرنا بھی آتا ہو۔ یہ بات اگر ہے تو مال میں برکت ہوگی، مال اس کے لیے باعثِ خیر ہوگا۔ لیکن مال حاصل کرنے والا اگر بخیل ہے تو وہ مال دار ہو کر بھی افلاس زدہ ہی رہے گا۔ اس کی حرص کبھی ختم ہونے کی نہیں ہے۔ اوپر والا ہاتھ یعنی دینے والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ (لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہے۔ یہ کہہ کر نبی ﷺ نے اس پر اُبھارا ہے کہ آدمی کا حوصلہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ دینے والا بننے کی کوشش کرے نہ کہ وہ لینے والا محتاج ہو۔

﴿۸﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَفٰى بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ يُّضَيِّعَ مَنْ يَّقُوْتُ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کے لیے یہی گناہ بہت ہے کہ اپنی روزی ضائع کرے یا جن لوگوں کی روزی اس کے ذمے ہے ان کو تباہ کرے۔

تشریح: یعنی گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ آدمی مال ضائع کرے اور غیر ضروری اور فضول کاموں میں خرچ کرے۔ جن کی کفالت اس کے ذمے ہے ان کی اسے فکر نہ ہو بلکہ اپنی دولت وہ کہیں اور صرف کرتا ہو۔ اس طرح وہ مال بھی ضائع کرنے کا مرتکب ہوگا اور انھیں بھی تباہ حال کر کے چھوڑے گا جن کی کفالت کا وہ ذمے دار ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے ضرورت مند بوڑھے ماں باپ یا اپنے بچوں پر مال خرچ نہ کر کے وہ مال کہیں اور خرچ کرتا ہے تو اس کے گنہگار ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

﴿۹﴾ وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَةِ وَ سَعْيًا عَلٰى اَهْلِهٖ وَ تَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ لَقِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حَلَالًا مُكَاثِرًا مُفَاخِرًا مُرَائِيًا لَقِىَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص حلال اور جائز

طریقے سے دنیا (کے مال و اسباب) اس غرض سے حاصل کرے تاکہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے بچ سکے، اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کر سکے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان وسلوک کر سکے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودہویں رات کے چاند کے مانند ہوگا۔ اس کے برخلاف جو شخص حلال طریقے سے ہی دنیا اس غرض سے حاصل کرے تاکہ اس کے مال میں اضافہ ہو، وہ لوگوں پر فخر جتائے اور اسے نام ونمود حاصل ہو تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ مال کی طلب اور اس کے حصول کی فکر کوئی غیر اسلامی بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مال کے حاصل کرنے کے ذرائع و وسائل جائز ہوں۔ آدمی کے لیے مال بہ ذات خود کوئی مقصود نہ ہو بلکہ وہ اپنی عزت کی حفاظت اور اہل وعیال کی کفالت کے لیے کسبِ مال کرتا ہے اور اس کی غرض اس سے یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے بھی کام آسکے مثلاً اپنے پڑوسیوں کے ساتھ احسان وسلوک کر سکے تو ایسا شخص اس شان کے ساتھ اپنے رب سے ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ مثل ماہتاب روشن ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اس کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں ہے۔ وہ مال کو بڑھاتا ہی جاتا ہے۔ اور حصول دولت سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں دولت کی فراوانی ہو، وہ اپنے مال پر فخر جتا سکے اور دنیا میں اسے شہرت اور نام و نمود حاصل ہو تو اس کے حصے میں خدا کا غصہ اور غضب ہی آئے گا۔ اور اگر کہیں اس کی دولت ناجائز اور حرام طریقوں سے جمع ہوئی ہے تب تو اور زیادہ یہ اس کے لیے وبال جان ہوگی۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: قَالَ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنْ اَجْمَعَ الْمَالَ وَ اَكُوْنَ مِنَ التَّاجِرِيْنَ وَلٰكِنْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنْ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ. (شرح السنۃ)

ترجمہ: حضرت جبیر بن نفیرؓ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری جانب یہ وحی نہیں کی گئی ہے کہ میں مال و دولت جمع کروں اور تاجر بنوں بلکہ میری طرف وحی یہ کی گئی ہے کہ اپنے رب کی حمد کی تسبیح کرو اور سجدہ گزاروں میں شامل ہو اور اپنے رب کی عبادت اور بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ جو یقینی ہے وہ تمہارے سامنے آجائے۔''

تشریح: اس حدیث میں قرآن (سورۃ الحجر: ۹۸،۹۹) کے حوالے کے ساتھ اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ انسان کی زندگی میں اصل اور دائمی قدر و قیمت کی حامل کون سی چیز ہے۔ مال و دولت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ تجارت بھی معیوب نہیں۔ لیکن اس کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی کی غرض و غایت مادی نہیں ہوسکتی۔ زندگی کا اصل مفہوم و منشا ہے خدا کی پہچان اور اس سے تعلق پیدا کرنا۔ ہمیں خدا کی خوبیوں اور اس کے حسن و کمال کا شعور ہو۔ یہی چیز ہے جو مہذب ذہن و دل کے لیے باعثِ سکون اور باعثِ صد راحت ہوسکتی ہے۔ زندگی کا اصل سرمایہ یہی ہے کہ ہماری زندگی خدا کی نافرمانی میں نہیں بلکہ اس کی طاعت و بندگی میں بسر ہو۔ اور زندگی کے آخری لمحات تک ہم اس پر قائم رہیں۔ یہ بات اگر حاصل نہیں ہوسکی تو خواہ دنیا کی ساری دولت وثروت سمٹ کر ہمارے پاس جمع ہوجائے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ دولت و ثروت کے باوجود ہم زندگی میں ناکام و خاسر قرار پائیں گے۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ مِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيكَرِبَ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: لَيَاْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لاَ يَنْفَعُ فِيْهِ اِلاَّ الدِّيْنَارُ وَالدِّرْهَمُ (احمد)

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا کہ جس میں دینار اور درہم کے سوا کوئی چیز فائدہ نہ دے گی۔"

تشریح: یعنی مال و زر کے حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ایک ایسا وقت آئے گا کہ مال کی اہمیت حد درجہ بڑھ جائے گی۔ اپنے دین و ایمان کی حفاظت اور آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے لیے مال ناگزیر ہوجائے گا۔ اس وقت تنگ دست اور افلاس زدہ کے لیے اس بات کا اندیشہ ہوگا کہ وہ اپنے وقار ہی کو نہیں بلکہ کہیں وہ اپنے دین و ایمان ہی کو نہ بیچ کھائے۔

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ عُمَرَ يَقُوْلُ: كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يُعْطِيْنِي الْعَطَاءَ فَاَقُوْلُ اَعْطِهِ اَفْقَرَ اِلَيْهِ مِنِّيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: خُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ وَ تَصَدَّقْ بِهٖ فَمَا جَآءَكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَ اَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَّلاَ سَائِلٍ فَخُذْهُ وَ مَالاً فَلاَ تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ

نبی ﷺ مجھے کچھ عطا فرماتے تو میں کہتا کہ آپ اسے اس شخص کو دیجیے جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو۔ یہاں تک کہ ایک بار آپؐ نے مجھے کچھ مال دیا تو میں نے عرض کیا کہ یہ آپؐ اس کو دے دیں جو مجھ سے زیادہ حاجت مند ہو۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''اسے لے کر مال دار ہو اور اس کو صدقہ کرو۔ اگر یہ مال تمہارے پاس اس طرح آئے کہ نہ تو تمہیں اس کا انتظار ہو اور نہ تم مانگنے والے ہو تو اس کو لے لو اور جو نہ آئے تو اس کے پیچھے اپنے نفس کو نہ لگاؤ۔''

تشریح: یعنی مال مل رہا ہو تو اس کی قدر کرنی چاہیے۔ البتہ تمہیں مال کا حریص نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ اس کے انتظار میں رہنا چاہیے کہ کوئی تمہیں مال لا کر دے گا۔ اگر بغیر طلب اور لالچ کے مال مل رہا ہے تو اسے لے لینا چاہیے۔ اگر تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تو اس سے تم دوسروں کی حاجت روائی کر سکتے ہو، جو مال تمہیں نہ ملے تو پھر ایسے مال کے لالچ میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔

کسبِ معاش

(جائز وناجائز)

کسبِ معاش کی اہمیت

(۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لاَ یَقْبَلُ اِلاَّ طَیِّبًا وَّ اَنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِہٖ الْمُرْسَلِیْنَ فَقَالَ یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا وَّ قَالَ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَارَزَقْنٰکُمْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ پاک ہے، پاک چیزوں ہی کو وہ قبول فرماتا ہے۔ اور اللہ نے مومنین کو بھی اسی چیز کا حکم دیا جس کا حکم اس نے رسولوں کو دیا ہے۔ چناں چہ اس کا ارشاد ہے: اے رسولو، عمدہ پاک چیزیں کھاؤ اور صالح عمل کرو۔(۱) اور فرمایا ہے: اے ایمان لانے والو، پاک عمدہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں۔''(۲)

تشریح: معلوم ہوا کہ دین یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا پینا ترک کردے۔ بلکہ دین حقیقت میں یہ ہے کہ آدمی کھائے لیکن پاک وطیب چیز کھائے۔ حرام کی کمائی سے دور رہے۔ اور کھا پی کر زمین میں فساد برپا نہ کرے بلکہ وہ اچھے کردار اور اچھے اخلاق کا حامل بن کر رہے۔ رسولوں کے علاوہ اہل ایمان کو بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے پاک اور طیب رزق سے کھائیں۔ اپنے منہ میں کوئی ایسا لقمہ نہ لے جائیں جو حرام کمائی کا ہو۔ کھانے پینے میں جائز وناجائز، پاک و

---

(۱) سورۃ المومنون:۵۱

(۲) سورۃ البقرہ:۱۷۲

ناپاک میں امتیاز کرنے والے سے اس بات کی توقع کی جائے گی کہ زندگی کے دیگر معاملات میں بھی اسے اچھے اور برے کی تمیز ہوگی۔ وہ زندگی میں ان ہی اعمال کو اختیار کرے گا جو صالح ہوں گے۔ برے کاموں سے وہ ہمیشہ دور رہے گا۔

〈۲〉 وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلْتُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ وَ اِنَّ اَوْلَادَکُمْ مِنْ کَسْبِکُمْ. (ترمذی، نسائی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو کچھ تم کھاتے ہو اس میں سب سے پاک اور بہتر وہ ہے جو تمہیں اپنی کمائی سے حاصل ہوئی ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔''

تشریح: یعنی اپنی اولاد کی کمائی کھانے میں تمہارے لیے کوئی عار کی بات نہیں ہے۔ اولاد کی کمائی تمہاری اپنی کمائی ہے۔

〈۳〉 وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خُدِیْجٍ قَالَ: قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْکَسْبِ اَطْیَبُ؟ قَالَ: عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِہٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَبْرُوْرٌ. (احمد)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کون سی کمائی سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کر کے کمانا اور ہر دیانت دارانہ بیع (خرید و فروخت، تجارت)۔''

تشریح: اسلام نہ تو مفت خوری کو پسند کرتا ہے اور نہ وہ اس کو جائز ٹھہراتا ہے کہ آدمی حصولِ رزق کے لیے ایسے ذرائع و وسائل اختیار کرے جن کا شمار دھوکہ دھڑی، ظلم و زیادتی اور استحصال (Exploitation) کے کاموں میں ہوتا ہے۔ حصولِ رزق کے لیے آدمی کو محنت و مشقت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے وہ تجارت بھی کرسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنی تجارت میں وہ شریعت کے احکام کا پورا لحاظ رکھے۔

〈۴〉 وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا اِسْتِعْفَافًا عَنِ الْمَسْئَلَۃِ وَ سَعْیًا عَلٰی اَھْلِہٖ وَ تَعَطُّفًا عَلٰی جَارِہٖ لَقِیَ اللّٰہَ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَوَجْھُہٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ وَ مَنْ طَلَبَ الدُّنْیَا حَلَالًا مُکَاثِرًا

مُفَاخِرًا مُرَائِيًا لَقِيَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ. (البيهقى فى شعب الايمان)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص دستِ سوال دراز کرنے سے بچنے، اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرنے اور اپنے ہم سایہ کے ساتھ احسان کرنے کی غرض سے جائز طریقے سے دنیا حاصل کرے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح (روشن) ہوگا۔ اس کے برخلاف جو شخص اپنی دولت میں اضافہ کرنے، لوگوں پر فخر جتانے اور نام ونمود کے لیے جائز طریقے سے ہی دنیا حاصل کرے تو وہ (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا۔''

تشریح: اسلامی نقطۂ نظر سے حصول مال کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ہم اپنی ذاتی ضروریات پوری کریں اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کریں بلکہ دولت کے حصول کا مقصد اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہماری دولت دوسروں کے کام آئے۔ مثال کے طور پر جیسا کہ اس حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم اپنے ہم سایہ پر احسان کریں۔

جس نے دولت جائز طریقے سے حاصل کی لیکن مقصد اس کا صحیح نہ تھا اس کا انجام یہ ہوگا کہ خدا اس پر سخت غضب ناک ہوگا اور اگر غلط مقاصد کے لیے وہ دولت حرام اور ناجائز طریقے سے حاصل کرتا تو اس کا کیا حشر ہوگا یہ آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ مِقْدَامٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: قَالَ مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ وَ اِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاؤُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت مقدامؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''اس شخص سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھائے۔ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کھاتے تھے۔''

تشریح: یعنی بہترین روزی وہ ہے جو آدمی کے اپنی محنت کا صلہ ہو۔ خدا کے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت بھی یہی رہی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے محنت ومشقت کر کے کھاتے تھے۔

〈۶〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ: لَاَنْ یَّحْتَطِبَ اَحَدُکُمْ حُزْمَةً عَلٰی ظَهْرِهٖ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یَّسْأَلَ اَحَدًا فَیُعْطِیَهٗ اَوْ یَمْنَعَهٗ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی لکڑیاں جمع کر کے اپنی پیٹھ پر گٹھا لاد کر لائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کے سامنے اپنی حاجت رکھے پھر وہ اس کو دے یا نہ دے۔''

تشریح: اسلام عزتِ نفس کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرنے اور سائل بن کر ان کے سامنے جانے کی ذلت گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اسے بیچ کر اپنی ضروریات پوری کرے۔

〈۷〉 وَعَنْ ثَوْبَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَکَفَّلَ لِیْ اَنْ لَّا یَسْأَلَ النَّاسَ فَاَتَکَفَّلُ لَهٗ بِالْجَنَّةِ (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے گا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دوں گا۔''

تشریح: اپنی ساری امیدیں اور توقعات ایک خدا سے وابستہ ہوں۔ آدمی کے سوچنے کا انداز یہ ہو کہ اس سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے لیکن وہ خود لوگوں سے بے نیاز ہو۔ وہ لوگوں کا سہارا تلاش نہ کرے۔ ایسے شخص کو جو سکون اور قلبی راحت حاصل ہوگی اس کا عام آدمی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ پھر اس کا یہ طرزِ عمل اسلام کے مزاج کے اس قدر مطابق ہے کہ خدا کے رسول ﷺ اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتے ہیں۔

محنت اور مزدوری

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ثَلٰثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَ رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَکَلَ ثَمَنَهٗ وَ رَجُلٌ نِ اسْتَاْجَرَ اَجِیْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَ لَمْ یُعْطِهٖ اَجْرَهٗ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز ان کے خلاف میں مقدمہ کھڑا کروں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرا واسطہ دے کر کوئی معاہدہ کیا پھر اسے توڑ دیا۔ دوسرا وہ جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھائی اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا، اس سے پورا کام لیا اور اس کو اس کی مزدوری نہ دی۔''

تشریح: یہ تینوں ہی کام نہایت ظالمانہ ہیں۔ ایک عہد شکنی، معاہدہ اور عہد و پیمان اگر خدا کے نام سے کیا گیا ہو پھر تو اس کا توڑنا اور بھی سنگین جرم ہوگا۔ دوسرے کسی آزاد شخص کو اغوا کر کے اسے کسی کے ہاتھ بیچ دینا اور اس کی قیمت کھانا انتہائی شرم ناک کام ہے۔ تیسرے کسی مزدور سے کام تو پورا لینا اور اس کو مزدوری اور اجرت سے محروم رکھنا، یہ اور اس طرح کی حرکات حد درجہ ظالمانہ ہیں۔ اس طرح کے ظلم کو روا رکھنے والوں کے خلاف خدا مدعی ہوگا اور انھیں ان کے ظلم کا مزا چکھائے گا۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَعْطُوا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُـهٗ. (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔''

تشریح: مزدور کو مزدوری دینے میں ٹال مٹول سے کام لینا کھلا ہوا ظلم ہے۔ مزدور کو مزدوری دینے میں حتی الامکان تاخیر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مزدور کو مزدوری فوراً ادا کر دی جائے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مزدور سے کام لینے سے پہلے اس کی مزدوری طے کر لینی چاہیے۔ حدیث میں ہے: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ اسْتِئْجَارِ الْاَجِيْرِ حَتّٰى يُبَيَّنَ لَهٗ اَجْرُهٗ (احمد) ''رسولِ خدا ﷺ نے مزدور کی مزدوری اس پر واضح کیے بغیر اسے مزدور رکھنے سے منع فرمایا ہے۔''

تجارت اور خرید و فروخت

(۱) عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِیْ غَرْزَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ اِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت قیس بن ابی غرزہؓ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے طبقۂ تجار، خرید و فروخت میں بے فائدہ باتیں اور قسم کھانے کی صورتیں پیش آتی ہیں لہٰذا خرید و فروخت (تجارت) کے ساتھ صدقہ و خیرات کو ملائے رکھو۔''

تشریح: کسبِ معاش کے لیے تجارت اور کاروبار کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن چوں کہ اس کاروبار میں بے احتیاطی کے اندیشے بھی رہتے ہیں، آدمی کاروبار میں لغو اور بے فائدہ باتیں بھی کرتا ہے اور اپنے گاہکوں کو مطمئن کرنے کے لیے قسمیں بھی کھانے لگتا ہے جو کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ اس سے آدمی کو بچنا چاہیے۔ تجارت کے ساتھ صدقہ و خیرات بھی کرتے رہنا چاہیے تاکہ اگر کچھ ناپسندیدہ باتوں کا صدور ہو گیا ہو تو یہ صدقہ اس کا کفارہ ہو سکے۔ اور خدا کی ناراضی اور اس کے غضب سے آدمی محفوظ رہ سکے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عُبَيْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلتُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فُجَّاراً اِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَ بَرَّ وَ صَدَقَ. (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت عبید بن رفاعہ اپنے والد (حضرت رفاعہ ابن رافعؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے روز تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ ہوگا سوائے ان تاجروں کے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا، پورا حق ادا کیا اور سچ پر قائم رہے۔''

تشریح: تاجروں کا حشر فاجروں کے ساتھ اس لیے ہوگا کہ تجارت میں اکثر لوگ دروغ گوئی اور فریب دہی سے نہیں بچتے۔ البتہ ایسے تاجر اس سے مستثنیٰ ہیں تجارت میں جن کا طرزِ عمل برّ و تقویٰ کے خلاف نہیں ہوتا۔ ہر حال میں جو سچائی پر قائم رہتے ہیں۔ نہ کذب بیانی سے کام لیتے ہیں اور نہ کسی قسم کا فریب کرتے ہیں۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِيَّاكُمْ وَ كَثْرَةَ الْحَلْفِ فِی الْبَيْعِ فَاِنَّهٗ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''خرید وفروخت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیوں کہ اس سے کاروبار میں فروغ تو (وقتی طور پر) ہوتا ہے لیکن پھر برکت زائل ہوجاتی ہے۔''

تشریح: یعنی شروع میں لوگ قسموں کا اعتبار کر کے خریداری کی طرف جھکتے ہیں۔ اور یہ چیز منفعت کا سبب بنتی ہے لیکن انجام کار اس سے برکت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ آدمی کا اعتبار باقی نہیں رہتا۔ لوگ لین دین میں تامل کرنے لگ جاتے ہیں۔ کبھی مال بھی تلف ہوجاتا ہے جس سے تجارت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْمُسْلِمُ اَخُوا الْمُسْلِمِ لاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ بَاعَ مِنْ اَخِيْهِ شَيْئًا وَّ فِيْهِ عَيْبٌ اِلاَّ بَيَّنَهُ لَهُ. (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرے اور وہ عیب دار ہو۔ الا یہ کہ عیب کو صاف صاف اس سے بیان کردے۔''

تشریح: یعنی چیز میں اگر کوئی عیب یا نقص ہے تو خریدار کو اس عیب سے باخبر کرنا ضروری ہے۔ اگر عیب سے خریدار کو بے خبر رکھ کر سامان فروخت کیا جاتا ہے تو یہ اپنے بھائی کو فریب دینا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا۔

﴿۵﴾ وَعَنْ مِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: كِيْلُوْا طَعَامَكُمْ يُبَارَكْ لَكُمْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکربؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اپنا غلہ ناپ لیا کرو، تمہارے لیے برکت دی جائے گی۔''

تشریح: غلہ کو ناپ تول کر رکھنے والا عملاً اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ غلہ کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اس لیے وہ اسے غلط طریقے پر خرچ بھی نہیں کرسکتا۔ یہ چیز برکت کی موجب ہے۔ اس کے علاوہ پیمانوں میں برکت کی نبی ﷺ نے دعا بھی فرمائی ہے۔ (بخاری)

﴿۶﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَصْحَابِ الْكَيْلِ وَالْمِيْزَانِ

اِنَّكُمْ قَدْ وُلِّيْتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيْهِمَا الْاُمَمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ناپنے اور تولنے والوں سے فرمایا: ”تمہارے ہاتھ میں دو کام ایسے ہیں، (یعنی ناپنے اور تولنے کے کام) جن کی وجہ سے تم سے پہلے کی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں۔“

تشریح: یعنی پہلے ایسی قومیں گزری ہیں جن کے لوگ ناپ تول کو درست نہیں رکھتے تھے۔ جب کچھ لیتے تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے لیکن جب کسی کو دیتے تو ناپ تول میں کمی کر دیتے تھے۔ جب یہ برائی بہت بڑھ گئی تو خدا کا عذاب ان پر نازل ہوا اور وہ قومیں ہلاک ہو کر رہ گئیں۔ ایسی قوموں میں سرفہرست حضرت شعیبؑ کی قوم کا نام لیا جاتا ہے۔ اس حدیث میں لوگوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ناپ تول میں کمی کرنے سے بچیں کیوں کہ یہ چیز خدا کے غضب کا سبب بن سکتی ہے۔

﴿۷﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: غَلاَ السِّعْرُ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعِّرْ لَنَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَاِنِّي لَاَرْجُوْا اَنْ اَلْقٰى رَبِّيْ وَلَيْسَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِيْ بِمُظْلِمَةٍ بِدَمٍ وَلاَ مَالٍ.

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک بار غلہ گراں ہو گیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہمارے لیے نرخ مقرر فرما دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا، وہی تنگی پیدا کرنے والا اور فراخی دینے والا ہے۔ اور میں تو اس بات کا امیدوار اور خواہش مند ہوں کہ میں اپنے رب سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر تم میں سے کسی کے خون اور مال کا مطالبہ نہ ہو۔“

تشریح: ”اللہ ہی نرخ مقرر کرتا ہے۔“ یعنی گرانی اور ارزانی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی لوگ تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں اور کبھی اللہ رزق میں کشادگی اور فراخی پیدا کر دیتا ہے۔ حالات کے تحت چیزیں گراں ہوتی ہیں اور حالات ہی کے تحت ان میں ارزانی آتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی چیز کی پیداوار بڑھ جائے تو لازماً اس کا اثر اس کے نرخ پر پڑے گا۔ اس کا بھاؤ گر جائے گا۔ اس کے برعکس پیداوار کی کمی سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس طرح لوگوں کی مانگ (Demand) بھی چیزوں کے نرخ کو متاثر کرتی ہے۔ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوگی اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔

مصنوعی طور پر ارزانی پیدا کرنے کی کوشش غلط اور اصول معاشیات کے خلاف ہے۔ اس لیے حکومت کی طرف سے جبراً نرخ مقرر کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ ایک ظلم کی صورت ہوسکتی ہے۔ اس کا برا نتیجہ بھی سامنے آسکتا ہے کہ کاروبار بند ہو جائے۔ مخلوق خدا مصیبت میں مبتلا ہو کر رہے۔ چیزوں کے نرخ کے اتار چڑھاؤ کے پیچھے کچھ معاشی عوامل کام کرتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا صحیح نہ ہوگا۔ البتہ حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تاجروں پر نظر رکھے کہ بے قید معیشت کا طریقہ نہ اپنائیں۔ مخلوق خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ہمدردی، خیر خواہی اور انصاف کا ہو۔ اس سلسلے کی کچھ باتوں کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

﴿۸﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ اِنِّيْ اُخْدَعُ فِي الْبُيُوْعِ فَقَالَ: اِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَكَانَ الرَّجُلُ يَقُوْلُهٗ۔ (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ میں خرید و فروخت کے معاملے میں فریب کھا جاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم جب خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو کہہ دیا کرو کہ فریب نہیں۔'' چنانچہ وہ اسی طرح کہہ دیا کرتا تھا۔

تشریح: یعنی یہ کہہ دیا کرو کہ کوئی ایسی چیز اختیار نہ کرنا جس سے میں دھوکا کھا جاؤں اور مجھے نقصان پہنچ جائے۔ اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کو دھوکہ یا فریب میں مبتلا کیا جائے۔ اس لیے اگر تمہیں خدا کا خوف ہے تو مجھے کسی طرح کا دھوکہ ہرگز نہ دینا۔

خرید و فروخت کے کچھ اصول و آداب

﴿۱﴾ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَ اِذَا اشْتَرٰى وَ اِذَا اقْتَضٰى. (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس شخص کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائے گا جو اس وقت نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لے جب وہ مال فروخت کرے اور جب وہ خریدے اور جب وہ قرض کا تقاضا کرے۔''

تشریح: خوش گوار معاشرت کے لیے ضروری ہے کہ لوگ باہم ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ ہر معاملہ میں تعاون کا جذبہ ان کے اندر پایا جاتا ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب

کہ لوگ باہم ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھ کر معاملہ کریں۔ کسی کو غیر نہ سمجھیں۔ پھر ہر ایک آدمی یہی چاہتا ہے کہ خدا اس پر مہربان ہو۔ اس کے ساتھ خدا کا معاملہ سخت گیری کا نہ ہو۔ پھر زندگی میں یہی نرمی اور مسامحت کا رویہ اسے بھی اختیار کرنا چاہیے۔ وہ نرمی اور خوش اخلاقی سے کسی حال میں بھی دست بردار نہ ہو۔

〈۲〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَایَسِمُ الرَّجُلُ عَلٰی سَوْمِ اَخِیْهِ الْمُسْلِمِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے۔“

تشریح: اس لیے کہ یہ جذبۂ اخوت کے منافی ہے۔ بھائی کو بھائی کا خیر خواہ ہونا چاہیے نہ کہ کچھ اور۔

〈۳〉 وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَایَبِیْعُ الرَّجُلُ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْهِ وَلَا یَخْطِبُ عَلٰی خِطْبَةِ اَخِیْهِ اِلَّا اَنْ یَّاذَنَ لَهٗ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ کوئی اپنے بھائی کے نکاح کے پیغام پر اپنے نکاح کا پیغام بھیجے اِلّا یہ کہ اس کو اس کی اجازت دے دی جائے۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ کسی سے اس کا خرید و فروخت کا معاملہ ہو رہا ہو یا اس نے کہیں نکاح کا پیغام بھیجا ہے تو پھر اس میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر فریقین معاملہ ترک کر دیں تو اس صورت میں دوسرا شخص اس سے خرید و فروخت کا معاملہ کر سکتا ہے یا نکاح کا پیغام بھیج سکتا ہے۔

〈۴〉 وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُتَبَایِعَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِالْخِیَارِ عَلٰی صَاحِبِهٖ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا اِلَّا بَیْعَ الْخِیَارِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”فروخت کرنے والا اور خریدنے والا دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے پر اس وقت تک اختیار حاصل ہے (کہ چاہیں تو خرید و فروخت کے معاملہ کو باقی رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں) جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے

جدا نہ ہوں۔ الا یہ کہ ان کی بیع بشرط خیار ہو۔''

تشریح: یعنی بیع میں اگر خریدار نے یہ شرط کر لی ہے کہ ایک یا دو تین روز تک مجھے یہ اختیار رہے گا کہ میں چاہوں گا تو خریدی ہوئی چیز رکھوں گا ورنہ واپس کر دوں گا۔ اس صورت میں بیع میں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بعد بھی معاملہ فسخ کر دینے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ بصورتِ دیگر یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔

امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک شرط اور قرار داد کے بغیر فریقین کو اس وقت تک معاملہ کو فسخ کرنے کا اختیار حاصل رہتا ہے جب تک وہ اس جگہ موجود ہیں جہاں سودا طے ہوا ہے۔ اسے ''خیارِ مجلس'' کہتے ہیں۔ مجلس سے الگ ہونے کے بعد یہ اختیار باقی نہ رہے گا۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ خیارِ مجلس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ''ایک دوسرے سے جدا ہونے'' کا مطلب مجلس سے الگ ہونا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تجارتی معاملہ کی گفتگو کا پایۂ تکمیل کو پہنچ جانا یعنی خرید وفروخت کے معاملہ کا بالکل طے ہو جانا اور لین دین کا مکمل ہو جانا ہے۔ اب اگر پہلے سے معاملہ کو فسخ کرنے کی شرط نہیں لگائی گئی ہے تو اب کسی بھی فریق کو یک طرفہ معاملہ فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ البتہ باہم رضا مندی سے معاملہ کو فسخ کر سکتے ہیں۔
امام شافعیؒ مالم یتفرقا (جب وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں) سے مراد خیارِ مجلس لیتے ہیں۔
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تفرق اور علیحدگی سے مراد مکانی تفرق نہیں بلکہ معاملاتی تفرق ہے۔ ان کے نزدیک جب تک بات بالکل طے نہ ہو جائے اور گفتگو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک ہر فریق کو اپنی پیش کش کو واپس لینے کا اختیار حاصل ہوگا اس کے بعد کسی کو یہ اختیار حاصل نہیں رہے گا۔ تفرق سے وہ معاملاتی تفرق مراد لیتے ہیں جیسا کہ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے: وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ (النساء: ۱۳۰) ''اگر دونوں ـــــ خاوند و بیوی ـــــ الگ ہی ہو جائیں تو خدا اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے نیاز کر دے گا۔'' ظاہر ہے اس آیت میں الگ اور جدا ہونے کا مفہوم کوئی مکانی جدائی نہیں ہے بلکہ شوہر و بیوی کے درمیان وہ جدائی ہے جو طلاق کے ذریعہ سے واقع ہوتی ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِیْ بَيْعِهٖ.

(مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: ایک بیع میں دو بیع مثلاً کوئی شخص کسی سے اس طرح کا معاملہ کرے کہ میں اپنی فلاں چیز تمہارے ہاتھ ۱۰ ہزار روپے میں فروخت کرتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم اپنی فلاں چیز میرے ہاتھ پانچ ہزار روپے میں فروخت کر دو۔ بیع کا یہ معاملہ جائز نہ ہوگا۔ ہر سودا الگ الگ ہونا چاہیے۔ ایک بیع میں دو بیع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ یہ چیز اگر نقد لیتے ہو تو مثلاً ۱۰۰ روپے میں لے سکتے ہو اور اگر اُدھار لیتے ہو تو ایک سو پچیس روپے دینے ہوں گے۔ اور بیع کا معاملہ ہو جائے اور یہ یقین نہ کریں کہ کس بیع پر معاملہ ہوا۔ نقد پر ہوا یا اُدھار پر۔ اس طرح بیع میں بیع کا معاملہ کرنا جائز نہ ہوگا۔ معاملہ میں ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ اور لین دین ہر قسم کے دباؤ اور جبر سے پاک ہونا چاہیے تاکہ نہ تو کسی کو اذیت پہنچے اور نہ کسی کو نقصان برداشت کرنا پڑے۔

﴿۶﴾ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَايَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ وَلَاشَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ وَّلَا رِبْحُ مَالَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَالَيْسَ عِنْدَكَ۔

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرض اور بیع کو ایک دوسرے سے متعلق کرنا جائز نہیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ بیع میں دو شرطیں کی جائیں اور نہ یہ درست ہے کہ اس چیز سے نفع اٹھایا جائے جو اپنے قبضے میں نہیں آئی۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس چیز کو فروخت کیا جائے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔''

تشریح: یہاں تجارت کا ایک اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کے لیے اس چیز کا بیچنا جائز ہے جو اس کے پاس ہے اور اسی چیز سے اسے نفع حاصل کرنے کا حق پہنچتا ہے جو اس کے قبضے میں ہو۔ بہ صورت دیگر طرح طرح کی خرابیوں اور قباحتوں کے پیدا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

﴿۷﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِیِّؓ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِسْتَعْمَلَ رَجُلاً عَلٰی خَيْبَرَ فَجَاءَ بِتَمرٍ جَنِيْبٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَكُلُّ تَمرِ خَيْبَرَ

هٰكَذَا؟ قَالَ: لاَ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَنَاخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰـذَا بِصَاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلاَثِ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لاَتَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيْبًا. (نسائی)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل مقرر کیا۔ وہ (ایک عمدہ قسم کی کھجوریں) جنیب کھجوریں لایا۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہیں؟'' اس نے عرض کیا کہ بہ خدا، نہیں، اے اللہ کے رسول، اسے ہم دو صاع کھجور دے کر ایک صاع یا تین صاع کے بدلے دو صاع خریدتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو بلکہ معمولی کھجوروں کو سکوں کے بدلے فروخت کرو اور پھر سکّوں سے جنیب کھجوریں خرید لو۔''

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوا کہ معمولی کھجور اگر عمدہ کھجور جنیب سے بدلتے تو ایک صاع میں دو گنے کا فرق ہوتا تھا اور دو صاع کھجور جنیب صرف ڈیوڑھے پر یعنی تین صاع کے بدلے میں مل سکتی تھی۔ یعنی ایک صاع سے دوسرے صاع تک شرح تبادلہ میں نمایاں فرق تھا۔ قیمت متعین نہ رہی۔ حضور ﷺ نے اس خرابی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی کہ کھجور کی یہ خرید و فروخت سکوں کے ذریعہ سے کی جائے۔ اس طرح نقصان کا احتمال باقی نہ رہے گا اور ایک متعین شرح سے یہ خرید و فروخت ہو سکے گی۔

﴿۸﴾ وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍؓ قَالَ اشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلاَدَةً فِيْهَا ذَهَبٌ وَ خَرَزٌ بِاثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَكْثَرَ مِنَ اثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: لاَ تُبَاعُ حَتّٰى تُفَصَّلَ. (نسائی)

ترجمہ: حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کے روز ایک ہار بارہ دینار میں خریدا جس میں سونا تھا اور نگینہ بھی۔ میں نے (خریدنے کے بعد) نگینہ الگ کیا تو سونا بارہ دینار سے زیادہ نکلا۔ اس کا ذکر میں نے نبی ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''جب تک سونے کو علیحدہ نہ کر لیا جائے، اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے۔''

تشریح: اس سلسلہ کی دیگر روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح خیبر کے موقع پر

حضور ﷺ کو اطلاع ملی کی مجاہدین مال غنیمت کو بڑی بے دردی سے فروخت کر رہے ہیں۔ وہ ایک اوقیہ کی چیز دو تین دیناروں کے عوض فروخت کر رہے ہیں تو آپؐ نے لوگوں کو اس طرزِ عمل سے روکا اور فرمایا کہ کم از کم اتنی قیمت تو وصول ہونی چاہیے جتنے کا وہ سونا یا چاندی ہے۔ کم از کم جانبین میں سونے اور چاندی کا وزن تو برابر ہو۔ حضرت فضالہ نے سونے کا ایک جڑاؤ ہار بارہ دینار میں لیا تھا۔ اس میں نگینہ جڑا تھا۔ نگینہ الگ کر کے تولا تو صرف سونا ہی بارہ دینار سے زیادہ وزن کا تھا۔ حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آیندہ ایسی صورت میں سونے کو علیحدہ کر کے فروخت کیا جائے تا کہ جانبین میں سے کسی کو نقصان اُٹھانا نہ پڑے۔

﴿۹﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلاً بِمِثْلٍ، سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَداً بِيَدٍ فَاِذَا اخْتَلَفَ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ اِذَا كَانَ يَداً بِيَدٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”سونے کا سونے کے ساتھ، چاندی کا چاندی کے ساتھ گیہوں کا گیہوں کے ساتھ، جو کا جو کے ساتھ، کھجور کا کھجور کے ساتھ، نمک کا نمک کے ساتھ تبادلہ ہو تو یہ تبادلہ برابر برابر اور دست بدست ہونا چاہیے۔ اور اگر اصناف مختلف ہوں تو پھر اجازت ہے جس طرح چاہو خرید و فروخت کرو البتہ لین دین کا دست بدست ہونا ضروری ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں جن چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ بہ طور مثال کے بیان ہوئی ہیں۔ چناں چہ صحابہؓ، تابعین اور ائمہ نے ان چھ چیزوں پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا ہے جو ان کے ساتھ علت میں یکسانیت کی حامل ہیں۔ یعنی جو ناپی جانے والی، وزن کی جانے والی اور کھائی جانے والی ہیں اور جو ذخیرہ کی شکل میں رکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً غلہ کے تمام اقسام، تیل اور شہد وغیرہ۔

جنس اگر مختلف ہے تو تول یا ناپ میں کمی بیشی جائز ہے بشرطیکہ معاملہ اُدھار کا نہ ہو۔ مثلاً سونے کی بیع اگر چاندی کے ساتھ ہو تو وزن میں کمی بیشی جائز ہے۔ دونوں کا وزن برابر ہو، یہ ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح گندم کی بیع اگر کھجور کے ساتھ ہو تو لین دین میں دونوں کا ہم وزن ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی ایک اُدھار نہ ہو۔ چناں چہ نبی ﷺ کا

ارشاد ہے: إِذَا اخْتَلَفَ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ (مسلم) ’’جب یہ اشیاء مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو جب کہ لین دین دست بدست ہو۔‘‘

یہاں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اگر لین دین ایسی دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے جو نہ تو جنس میں ایک ہیں اور نہ ایسا ہی ہے کہ دونوں ہی ناپی یا تولی جاتی ہوں تو ایسی چیزوں میں لین دین اُدھار بھی ہوسکتا ہے اور اس میں برابر برابر کی شرط بھی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً گیہوں کو روپے سے خریدتے ہیں تو نسیہ (اُدھار لین دین) بھی جائز ہے اور چیز کے برابر برابر ہونے کے بجائے اس میں کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے۔

جن چیزوں میں اُدھار معاملہ کرنا جائز نہیں ہے وہ ایسی صورت میں ناجائز ہے جب کہ مقصود چیزوں میں تبادلے کا ہو۔ جیسے کوئی نئے گیہوں سے پرانے گیہوں کو بدلنا چاہتا ہے تو یہ تبادلہ اُدھار درست نہ ہوگا۔ لیکن جہاں مقصود تبادلہ نہ ہو بلکہ ایک چیز اپنے پاس نہیں ہے۔ اُدھار لینے سے مقصود کام نکالنا ہے کہ جب اپنے پاس وہ چیز ہوگی تو اتنی واپس کردیں گے جتنی اُدھار لی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اپنے پاس آٹا نہیں ہے پڑوسی سے ایک کلو آٹا اُدھار لے لیا۔ یہ جائز ہے کیوں کہ یہاں مبادلہ کرنا اصل مقصود نہیں ہے۔ اگر پاس ہوتا تو ادھار لیتے ہی کیوں۔

〈۱۰〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ. (ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص کسی مسلمان کے ساتھ اِقالہ کا معاملہ کرلے (یعنی اس کی فروخت کی ہوئی یا خریدی ہوئی چیز کی واپسی پر راضی ہوجائے) تو اللہ قیامت کے روز اس کی غلطی و گناہ کو بخش دے گا۔‘‘

تشریح: لین دین مکمل ہوجانے کے بعد کبھی ایک فریق اپنی مصلحت سے معاملہ کو فسخ کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً فروخت کی ہوئی چیز واپس لینی چاہتا ہے یا خریدی ہوئی چیز کو وہ واپس کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے قانوناً فریق ثانی معاملہ فسخ کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن نبی ﷺ ترغیب دیتے ہیں کہ اگر دوسرا فریق ایثار سے کام لے اور اپنے بھائی کی رعایت سے معاملہ کو فسخ کر کے اس کی چیز اسے واپس کردے یا اپنی چیز واپس لے لے تو یہ ایک بڑی نیکی ہے۔ خدا بھی قیامت کے روز اس پر کرم فرمائے گا اور اس کی خطاؤں کو معاف فرمائے گا۔

〈۱۱〉 عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمَدِیْنَةَ وَهُمْ یُسْلِفُوْنَ فِی الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَیْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ اَسْلَفَ فِیْ شَیْءٍ فَلْیُسْلِفْ فِیْ کَیْلٍ مَعْلُوْمٍ وَ وَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰی اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اس وقت وہاں کے لوگ پھلوں میں ایک سال، دو سال اور تین سال کے لیے بیع سلم کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ”جو شخص بیع سلم کرے تو اسے چاہیے کہ معین پیمانہ، معین وزن اور معین مدت کے ساتھ بیع سلم کرے۔“

تشریح: یعنی پیشگی قیمت دے کر کہتے کہ ایک سال، دو سال یا تین سال کے بعد پھل پہنچا دینا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بیع سلم جسے سلف بھی کہا جاتا ہے کچھ شرائط کے ساتھ درست ہے۔ بیع سلم میں خریدی جانے والی چیز کی قیمت پہلے ادا کر دی جاتی ہے، چیز بعد میں لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ۲۰۰ روپے میں ۱۶ کلو گیہوں خریدتا ہے اور وہ روپے ادا کر دیتا ہے اور صاحب معاملہ سے یہ طے کر لیتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد فلاں قسم کا گیہوں تم سے لوں گا۔ یہ بیع سلم ہے۔ یہ بیع شرعاً جائز ہے بہ شرطے کہ اس کی تمام شرطیں واضح ہوں اور وہ پوری کی جائیں۔ کوئی چیز مبہم نہ رہے تاکہ اختلاف کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔

یہ بھی درست ہے کہ فروخت کی جانے والی چیز موجود ہو اسے خریدی جائے اور قیمت ادھار رکھی جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے اُدھار قیمت پر اونٹ خریدا تھا۔

〈۱۲〉 وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلاً اِبْتَاعَ غُلَامًا فَاَقَامَ عِنْدَهٗ مَا شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ وَجَدَ بِهٖ عَیْبًا فَخَاصَمَهٗ اِلَی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَرَدَّهٗ عَلَیْهِ فَقَالَ الرَّجُلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدِ اسْتَغَلَّ غُلَامِیْ فَقَالَ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ. (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی سے غلام خریدا۔ اور وہ اس کے پاس جتنا خدا نے چاہا رہا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ غلام میں ایک عیب ہے۔ وہ اس معاملہ کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فیصلے کے لیے پہنچا۔ آپ نے (اس عیب کی وجہ سے) غلام کو واپس کرنے کا حکم دے دیا۔ اس پر مدعا علیہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، اس نے میرے غلام سے کام لیا

ہے۔(لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ملنا چاہیے) آپؐ نے فرمایا: نفع کا مستحق وہی ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہے۔"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خریدی ہوئی چیز میں اگر کوئی عیب نکل آئے جس سے خریدار کو آگاہ نہ کیا گیا ہو تو خریدار معاملہ کو فسخ کرسکتا ہے۔ اسے "خیارِ عیب" کہتے ہیں۔ آپؐ کے ارشاد والخراج بالضمان (نفع کا مستحق وہی ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہے) میں ایک ایسا بنیادی اصول بیان ہوا ہے جس سے فقہاء نے سیکڑوں مسائل میں شریعت کا حکم نکالا ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ غلام خریدار کے یہاں مرجاتا یا کسی حادثہ میں اس کا کوئی عضو ناکارہ ہوجاتا تو یہ نقصان خریدار ہی برداشت کرتا۔ اس لیے ان دنوں میں خریدار نے غلام سے جو فائدہ اُٹھایا ہے وہ اس کا حق تھا۔ لہٰذا معاوضہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بے قید معیشت کی روک تھام

﴿۱﴾ عَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: نَهَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَنْ اَبِيْعَ مَالَيْسَ عِنْدِیْ.

(ترمذی)

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزامؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس سے منع فرمایا کہ جو چیز میرے پاس موجود نہ ہو میں اس کی بیع کا معاملہ کسی سے کروں۔

تشریح: یعنی جو چیز اپنے پاس موجود نہ ہو اور نہ وہ اپنی ملکیت میں ہو اس کی بیع صحیح نہ ہوگی۔ کیوں کہ اس طرح دونوں فریق کو تکلیف دہ صورت پیش آسکتی ہے۔ ممکن ہے وہ چیز دستیاب نہ ہو۔

اگر چیز تو اپنے پاس ہے لیکن اپنی ملکیت میں نہ ہو تو مالک کی اجازت کے بغیر اس کی بیع نہیں کرنی چاہیے۔ اگر بیع کردی تو یہ بیع مالک کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اگر وہ منظوری دے دیتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بیع صحیح ہوجائے گی بہ صورت دیگر یہ بیع کالعدم قرار پائے گی۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ بیع سرے سے صحیح نہ ہوگی خواہ مالک منظوری دے یا نہ دے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَشْتَرُوْنَ الطَّعَامَ مِنَ الرُّكْبَانِ عَلٰى عَهْدِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَيَبْعَثُ عَلَيْهِمْ مَنْ يَّمْنَعُهُمْ اَنْ يَّبِيْعُوْهُ حَيْثُ اشْتَرَوْهُ حَتّٰى يَنْقُلُوْهُ

حَيْثُ يُبَاعُ الطَّعَامُ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں لوگ سواروں سے غلہ خریدتے تھے، تو نبی ﷺ کسی کو ان کے پاس بھیجتے کہ وہ انھیں اس جگہ غلہ بیچنے سے منع کرے جہاں اسے خریدا ہے۔ یہاں تک کہ غلہ وہاں منتقل ہو جائے جہاں غلہ بکتا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اشیاء منقولہ میں سے کوئی چیز خریدتا ہے تو جب تک وہ اس چیز کو اپنے قبضے میں نہ لے لے اسے فروخت کرنا صحیح نہ ہوگا۔ قبضے میں لینے کی صورت یہ ہے کہ اسے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ امام مالکؒ کے نزدیک قبضے سے پہلے غلہ کا بیچنا جائز نہیں ہے باقی چیزوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک قبضے سے پہلے دوسرے کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں ہے خواہ وہ اشیاء منقولہ میں سے ہو جیسے غلہ وغیرہ یا عقار یعنی زمین اور مکان۔

﴿۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ: نَهَى النَّبِيُّ ﷺ اَنْ يُّبَاعَ الطَّعَامُ اِذَا اشْتَرَاهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهٗ.

(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس غلہ کو بیچنے سے منع فرمایا جس کو خریدا ہے جب تک کہ اس کو قبضے میں نہ لے لے۔

﴿۴﴾ وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا تَلَقَّوُا السِّلَعَ حَتّٰى يُهْبَطَ بِهَا اِلَى السُّوْقِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''تم سامان لانے والوں سے جا کر نہ ملو (اور اس وقت تک ان سے کوئی معاملہ نہ کرو) جب تک وہ بازار میں پہنچ کر اپنا مال نہ اُتارے۔''

تشریح: ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شہر والوں کو نقصان وضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس سے ایک بڑی خرابی یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ سارا غلہ یا مال چالاک لوگوں کے قبضے میں آجاتا ہے پھر وہ زیادہ سے زیادہ داموں پر عام صارفین کے ہاتھوں بیچتے اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مال اگر بازار میں آکر بکے تو وہ مناسب نرخ پر بک سکے گا اور عام ضرورت مند مناسب داموں پر اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں گے۔

〈۵〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَا تَلَقُّوا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرٰی مِنْهُ فَاِذَا اَتٰی سَیِّدُهُ السُّوْقَ فَهُوَ بِالْخِیَارِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم آگے بڑھ کر غلہ وغیرہ لانے والے قافلے سے نہ ملو۔ جو جا کر ملا اور کچھ سامان خرید لیا پھر مال کا مالک بازار میں آیا تو اسے اختیار حاصل ہوگا (کہ وہ چاہے تو معاملہ کو فسخ کر دے)۔“

تشریح: تاجر جو باہر سے مال لا کر فروخت کرتا ہے اسے یہ معلوم ہو جائے کہ خریدار نے کھلا فریب کیا ہے اور اصل نرخ کے مقابلے میں اس سے سستے داموں پر مال لے لیا ہے تو اس صورت میں وہ بیع کو فسخ کر کے اپنا مال واپس لے سکتا ہے۔

〈۶〉 وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَا تَلَقُّوا الرُّكْبَانَ لِبَیْعٍ وَلَا یَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوا الْاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَیْرِ النَّظْرَیْنِ بَعْدَ اَنْ یُّحْلِبَهَا اِنْ رَضِیَهَا اَمْسَكَهَا وَ اِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَ صَاعًا مِّنْ تَمْرٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”غلہ وغیرہ لانے والے قافلہ سے مال خریدنے کے لیے آگے جا کر نہ ملو۔ اور تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے اور (نمائشی خریدار بن کر سودے کی) قیمت بڑھانے کا کام نہ کرو۔ اور کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال اپنے پاس رکھ کر فروخت کرنے کا کام نہ کرے۔ اور اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو۔ اور اگر کوئی اُسے خرید لیتا ہے تو اسے دوہنے کے بعد اختیار ہے چاہے تو اسے اپنے پاس رکھے اور چاہے تو واپس کر دے اور ایک صاع (تقریباً ۴ سیر) کھجور دے دے۔“

تشریح: یہ ایک اہم ہدایت ہے کہ کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی دکان دار سے کوئی چیز خریدے تو دوسرے تاجر کے لیے یہ بات جائز نہ ہوگی کہ وہ مداخلت کر کے گاہک سے یہ کہے کہ خریدی ہوئی چیز واپس کر دے میں کم قیمت پر تجھے یہ چیز دیتا ہوں، اسی طرح اس کے لیے یہ بھی درست نہیں ہے کہ بائع (بیچنے والے) سے کہے کہ یہ بیع فسخ کر دے میں یہ چیز اس سے زیادہ قیمت پر خرید لوں گا۔ یہ طریقہ نہایت خود غرضی پر مبنی ہے۔ اس سے باہم عداوت اور دشمنی پیدا ہوگی اور شر و فساد رونما ہوگا۔

حدیث کے اصل الفاظ ہیں ''وَلاَ تَنَاجَشُوْا'' نجش کے معنی ہیں رغبت دِلانا اور فریب دینا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ ہو رہا ہے۔ تیسرا آدمی آ کر بکنے والی چیز کی تعریف کرنے لگے یا اس کی زیادہ قیمت لگا دے جب کہ اس کا مقصد خود مال خریدنے کا نہ ہو بلکہ اصل خریدار کو راغب کرنا اور اسے فریب دینا ہو۔

دیہات یا شہر سے دور رہنے والا جو سامان غلہ وغیرہ فروخت کرنے کی غرض سے شہر میں لے آئے تو کسی شہری کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس سے یہ کہے کہ یہ سامان میرے پاس رکھ دے میں اسے اپنے پاس روک کر آج کے بعد زیادہ قیمت پر جب اس کے دام چڑھ جائیں گے فروخت کروں گا۔ اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ مثلاً اس سے اشیاء کی مصنوعی قلت ہو جائے گی۔ عام ضرورت مندوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چیزیں گراں ہو جائیں گی۔ اس کے برخلاف اگر باہر سے مال لانے والوں کا مال فوراً بک جائے اور ہاتھوں ہاتھ انھیں اپنے مال کی قیمت مل جائے تو وہ بازار میں دوسرا مال لاسکیں گے۔ ان کی تجارت کو فروغ حاصل ہوگا اور مخلوق خدا بھی پریشانی سے بچ سکے گی۔

اس حدیث میں نبی ﷺ یہ ہدایت کرتے ہیں کہ جس جانور کو فروخت کرنا ہے اس کا دو ایک وقت دودھ دوہنا بند نہ کرو تا کہ تھن دودھ سے خوب بھر جائے اور گاہک سمجھے کہ یہ جانور بہت دودھ دینے والا ہے اور زیادہ قیمت پر وہ اسے خریدنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اب اگر خریدار کو دھوکا دیا گیا ہے تو وہ اس بیع کو فسخ کر سکتا ہے اس صورت میں وہ ایک صاع کھجور جانور کے مالک کو پیش کر دے۔ مسلم کی ایک روایت میں ہے فَاِنْ رَدَّھَا مَعَھَا صَاعاً مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ (اگر اس کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع غلہ دے دے مگر گیہوں نہ دے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھجور کے بجائے گیہوں کے علاوہ کوئی غلہ بھی ایک صاع دیا جا سکتا ہے۔ یہ حکم اس لیے ہے کہ جانور کے مالک کی دل شکنی نہ ہو اور معاملہ خوشگواری کے ساتھ ختم ہو جائے۔

〈۷〉 وَعَنْهُ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ. (مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دوسری بیع کے معاملہ کو ممنوع قرار دیا۔

تشریح: یعنی ہر سودا الگ الگ ہونا چاہیے۔ ابہام ایذا کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ اس میں

دوسرے کا مال ناحق کھانے کا امکان بھی رہتا ہے۔ ایک بیع میں دو بیع کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ یہ چیز اگر نقد لیتے ہوتو سو روپے میں دے دوں گا لیکن اُدھار لیتے ہوتو ایک سو پچیس روپے دینے ہوں گے۔ اسی پر بیع ہو جائے اور یہ تعین نہ کریں کہ کون سی بیع پختہ ہوئی نقد یا اُدھار۔

ایک بیع میں دو بیع (ڈبل سودا) کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میں تیرے ہاتھ اپنا یہ مکان فروخت کرتا ہوں بہ شرطے کہ تو اپنی فلاں چیز میرے ہاتھ پر فروخت کردے۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص مثلاً ۱۰ دینار کے عوض دو مختلف قسم کی چیزوں میں سے ایک فروخت کرتا ہے اور بیع کا معاملہ ہو جاتا ہے جب کہ اس کا تعین نہیں کیا گیا کہ مشتری (خریدار) نے ان دو میں سے کون سی چیز خریدی ہے۔

〈۸〉 وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَايَحِلُّ سَلَفٌ وَ بَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِىْ بَيْعٍ وَلَا رِبْحِ مَالَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَالَيْسَ عِنْدَكَ. (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''قرض اور بیع ایک دوسرے سے متعلق کر کے جائز نہیں۔ بیع میں دو شرطیں کرنی بھی درست نہیں اور اس چیز سے نفع اٹھانا بھی درست نہیں جو ابھی اپنے قبضے میں نہ آئی ہو اور اس چیز کی بیع جائز نہیں ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔''

تشریح: قرض اور بیع دو الگ الگ معاملے ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے منسلک کرنا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص کسی کے ہاتھ کوئی چیز اس شرط کے ساتھ فروخت کرتا ہے کہ تمہیں اتنے روپے مجھے قرض دینے ہوں گے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی کو کچھ روپے قرض دے اور اس کے ساتھ اپنی کوئی چیز مقروض کے ہاتھ اصل قیمت سے زائد پر فروخت کرے۔ مقروض یہ زائد قیمت محض اس لیے ادا کرے گا کہ وہ بیچنے والے کا مقروض ہے۔ درحقیقت یہ سود خواروں کا نکالا ہوا ایک حیلہ ہے۔ اس سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

دو شرطوں کی بات اتفاقی معلوم ہوتی ہے۔ بیع میں ایک شرط بھی درست نہیں ہے۔ مثلاً

کوئی لکڑی خرید رہا ہے اور وہ بیچنے والے شخص سے یہ کہے کہ اسے کاٹ کر اور اُٹھا کر فلاں جگہ پہنچانا ہوگا۔ اسی طرح ایسی شرط لگانی جس سے بیع کا مقصد ہی فوت ہو جائے جائز نہیں۔ مثال کے طور پر فروخت کرنے والا خریدار سے کہے کہ تم اس کو آگے فروخت مت کرنا۔ یا اسے فلاں کو ہبہ نہیں کرو گے۔ یا وہ یہ شرط لگائے کہ میں یہ چیز تمہارے ہاتھ بیچ رہا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے کہ تم اپنی فلاں چیز میرے ہاتھ فروخت کر دو یا مجھے اپنی رقم بہ طور قرض دے دو۔

مثلاً ایک شخص نے کوئی چیز خریدی مگر وہ چیز ابھی فروخت کرنے والے شخص ہی کے پاس ہے۔ اس عرصے میں بیچنے والا اس چیز سے کوئی فائدہ اٹھاتا ہے تو خریدار اپنی طرف اس فائدے کو منتقل کرنے کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اگر وہ چیز خدانخواستہ ضائع ہو جاتی تو نقصان بیچنے والے ہی کو برداشت کرنا پڑتا۔ اس لیے اس چیز سے اگر کوئی نفع حاصل ہو تو وہ بھی بیچنے والے ہی کو ملنا چاہیے۔ خریدار کا اس پر کوئی حق نہ ہوگا۔

﴿۹﴾ وَعَنْ مَعْمَرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ (مسلم)

ترجمہ: حضرت معمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے (گراں فروخت کرنے کی غرض سے) غلہ روکا وہ گنہگار رہے۔''

تشریح: گراں فروشی کے ارادے سے کسی ایسی چیز کو روک رکھنا جس سے انسان یا حیوان کی غذائی ضرورت پوری ہوتی ہو احتکار ہے۔ مثال کے طور پر لوگوں کو غلہ کی شدید ضرورت ہو اور کوئی شخص غلہ خرید کر اس ارادے سے اپنے پاس روکے رکھے، فروخت نہ کرے کہ جب غلہ زیادہ گراں ہو جائے گا تب اسے فروخت کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو سکے۔ یہ احتکار ہے۔ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ارزانی کے زمانے میں اگر کوئی غلہ خرید کر رکھ چھوڑتا ہے یا اپنی زمین سے پیدا ہونے والے غلہ کو جمع رکھتا ہے کہ اسے مناسب وقت فروخت کرے گا جب اسے مناسب دام ملیں گے تو اسے احتکار نہیں کہیں گے۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كَفَّارَةٌ. (رزین)

ترجمہ: حضرت ابو اُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا ''جس نے غلہ کو چالیس روز تک روکے رکھا پھر وہ اسے خیرات بھی کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ نہیں ہوگا۔''

تشریح: مخلوق پریشان ہے اور وہ چالیس روز تک زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچنے کے ارادے سے غلہ کو روک رکھتا ہے۔ نہ تو بازار میں لاتا ہے اور نہ مخلوق خدا کو اس سے غذائی ضرورت پوری کرنے کا موقع دیتا ہے۔ تو خدا کی نگاہ میں وہ اتنے بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے پورے غلہ کو خدا کی راہ میں خیرات بھی کر دے تو اس سے تلافیٔ مافات ممکن نہیں۔

〈۱۱〉 وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْ لَمْ يَزَلْ فِيْ مَقْتِ اللّٰهِ اَوْ لَمْ تَزِلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهٗ. (ابن ماجہ)

ترجمہ: واثلہ بن اسقعؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص کسی عیب دار چیز کو فروخت کرے اور اس کے عیب سے خریدار کو آگاہ نہ کرے تو وہ ہمیشہ خدا کے غضب میں رہتا ہے۔“ یا آپؐ نے یہ فرمایا: ”فرشتے اس پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔“

تشریح: عیب دار شے دے کر خریدار کو اس نے گھاٹے میں ڈال دیا۔ اس لیے وہ بھی مستقل طور پر غضب خداوندی کا مستحق ہو گیا یا وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ خدا کے فرشتے مسلسل اس پر لعنت بھیجتے رہیں۔

〈۱۲〉 وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ فِی الْبَيْعِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے بیع میں ملامسہ اور منابذہ سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: شریعت نے اپنے احکام میں اس کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ کسی شخص کو معاملات میں دھوکا نہ ہو۔ ملامسہ اور منابذہ سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ اس میں دھوکا کھانے کا امکان رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے طرفین میں سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ملامسہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے کپڑے کو ہاتھ لگائے لیکن اُلٹ پلٹ کر صحیح ڈھنگ سے نہ دیکھے اور معاملہ کر لے۔ منابذہ یہ ہے کہ طرفین اپنا اپنا کپڑا ایک دوسرے کی طرف پھینکیں اور پھر یہی ان کے مابین بیع قرار پائے۔ جب کہ ضروری تھا کہ وہ چیز کو بہ غور دیکھتے اور جانچ پرکھ میں تساہل سے کام نہ لیتے۔

〈۱۳〉 وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ وَهُوَ بِمَكَّةَ: اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسولِ خداﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا جب کہ آپؐ مکہ میں تھے کہ ''بے شک اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی بیع حرام قرار دی ہے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حرام اور گندی اور پلید چیزوں کی تجارت درست نہیں ہے۔ ایسی چیزیں جو فرد اور معاشرہ کے لیے تباہ کن ہوں ان کو آمدنی کا ذریعہ بنانا شریعت کے لحاظ سے کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔ شریعت تو اس لیے نازل ہوئی ہے کہ اخلاق و شرافت اور پاکیزگی کی حفاظت ہوسکے۔ اسی لیے اسلام نے قحبہ گری اور اس کی آمدنی کو حرام قرار دیا ہے۔

کاروبار میں شرکت

‹۱› عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ رَفَعَهٗ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَقُوْلُ: "اَنَا ثَالِثُ الشَّرِیْکَیْنِ مَالَمْ یَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ فَاِذَا خَانَهٗ خَرَجْتُ مِنْ بَیْنِهِمَا." (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا ہوں جب تک ان میں سے کوئی اپنے دوسرے شریک کے ساتھ خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اور جب وہ خیانت پر اُتر آتا ہے تو میں ان کے بیچ سے ہٹ جاتا ہوں۔''

تشریح: رزینؒ نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ وَجَاءَ الشَّیْطَانُ'' اور پھر شیطان ان کے درمیان آجاتا ہے۔''

اس حدیث سے کاروبار میں شرکت کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ شرکت کے سبب کاروبار میں ترقی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ شرکاء باہم ایک دوسرے کے ساتھ خیانت اور بددیانتی سے کام نہ لیں۔ جب تک شرکاء دیانت اور امانت داری پر قائم رہتے ہیں خدا کی معیت انھیں حاصل رہتی ہے۔ خدا ان کے کاروبار کو برکت عطا فرماتا ہے اور کاروبار کو نقصان سے بچاتا ہے۔ لیکن جب شرکاء بددیانتی سے کام لینے لگتے ہیں تو پھر خدا کے بجائے شیطان درمیان میں آجاتا ہے اور وہ اپنا تسلط جمالیتا ہے، جس کا انجام سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہوسکتا۔

جب دو یا زیادہ اشخاص اپنا مال جمع کرکے اس سے مشترکہ طور پر تجارت کریں یا اسے کسی صنعت وغیرہ میں لگائیں تو اسے شرکت کا معاملہ کہتے ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

مثلاً زیادہ اشخاص مشترک مال سے تجارت کرتے ہیں کہ اصل مال کی نسبت سے ہر ایک کو نفع ملے گا اور خسارہ بھی اسی نسبت سے شرکاء میں تقسیم ہوگا۔ ہر ایک کو اس میں تصرف کا حق حاصل ہوگا۔ اسے اصطلاح میں شرکت عنان کہتے ہیں۔

دو یا دو سے زیادہ پیشہ ور اس شرط پر شرکت میں کام کریں کہ جو نفع بھی حاصل ہوگی وہ طے شدہ نسبت سے باہم تقسیم کرلیں گے۔ اسے شرکت اعمال یا شرکت تقبل کہتے ہیں۔

شرکت کی ایک شکل یہ ہے کہ دو یا زیادہ اشخاص تاجروں سے مال لاکر اسے فروخت کرتے ہیں اور وہ منافع باہم برابر برابر تقسیم کرلیتے ہیں اور اگر نقصان ہوتا ہے تو اس میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اسے شرکت وجوہ کہتے ہیں۔

شرکت کی ایک قسم شرکت مفاوضہ ہے۔ اس میں شرکاء یہ طے کرلیتے ہیں کہ وہ مال میں تصرف اور مفاوضہ میں شریک رہیں گے۔ شرکت مفاوضہ میں شرکاء ایک دوسرے کے وکیل اور کفیل ہوتے ہیں۔ اس میں حصہ دار دوسرے کو مالی و بدنی اشتراک کے جملہ اختیارات تفویض کردیتا ہے۔ بیع، شراء اور مضاربہ کے اختیارات کا حامل ہر شریک ہوتا ہے۔ منافع اور خسارہ کی جو شرح وہ طے کرلیں اسی کے مطابق نفاذ ہوگا۔

اس طرح شرکت کے معاملات درست ہیں۔ شرط یہ ہے کہ شریعت کے اصول و ضوابط کو کسی پہلو سے نظر انداز نہ ہونے دیں۔ اس سلسلے کی تفصیلات فقہ کی کتابوں سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

مضاربت

﴿۱﴾ عَنْ صُهَيْبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ثَلَاثٌ فِيهِنَّ الْبَرَكَةُ الْبَيْعُ اِلٰى اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَ اِخْلَاطُ الْبُرِّ بِالشَّعِيْرِ لِلْبَيْتِ لاَ لِلْبَيْعِ. (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”تین چیزیں ایسی ہیں جن میں برکت ہوتی ہے۔ ایک مقرر وقت کے وعدہ پر مال بیچنا، مضاربت اور گیہوں میں جو ملانا گھر کے خرچ کے لیے، فروخت کرنے کے لیے نہیں۔“

تشریح: خریدار کو قیمت کی ادائیگی کے لیے مہلت دینے سے کاروبار میں سہولت ہوتی ہے اور کاروبار ترقی کرتا ہے۔ اور کسی کے لیے آسانی اور سہولت کا خیال رکھنا بذات خود بڑی نیکی

ہے۔

اصل میں لفظ مقارضہ آیا ہے۔اس سے مراد مضاربت ہے۔لغت میں ضرب کے معنی مارنے اور چلنے پھرنے کے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد تلاش رزق میں ہاتھ پیر مارنا اور دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ قرآن میں بھی ہے: وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (المزمل:۲۰) ''اور کچھ دوسرے لوگ اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرتے ہوئے زمین میں سفر کرتے ہیں۔''

نبی ﷺ نے خود حضرت خدیجہؓ کے روپے سے اس طریقے سے تجارت کی ہے۔ عام صحابہ کرامؓ بھی لوگوں کو روپے دے کر یا ان سے روپے لے کر تجارت کرتے رہے ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ نے مضاربت کی بنیاد پر تجارت کی ہے۔

کاروبار میں اگر خسارہ ہو جاتا ہے تو یہ خسارہ مال کے مالک یا جس فریق کی رقم صرف ہوتی ہے اسے برداشت کرنا ہوگا۔ عامل کے لیے اس کی محنت و مشقت کا خسارہ کم نہیں ہے۔ اسے مزید خسارے میں شریک نہیں کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ صرف روپے میں مضاربت کو صحیح قرار دیتے ہیں۔لیکن امام مالکؒ کے نزدیک مال اور سامان وغیرہ میں بھی مضاربت کا معاملہ کیا جا سکتا ہے۔یعنی کسی کا مال اور سامان ہو اور کسی کی محنت ہو۔ وہ مال کے بیچنے کا کام کرے۔نفع میں دونوں فریق شریک ہوں گے۔ البتہ سامان کو بیچ کر جو روپے حاصل ہو اس سے اگر مضاربت کی جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی یہ مضاربت جائز اور صحیح ہوگی۔

مضاربت کی اصطلاح حنفی اور حنبلی فقہاء استعمال کرتے ہیں۔ شافعی اور مالکی قراض کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ قراض لفظ قراضہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کاٹنا کے ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنے سرمایہ میں سے کچھ کاٹ کر سرمایہ کاری کے لیے وقف کرتا ہے اس لیے اسے قراض کہا جاتا ہے۔ مضاربت یا قراض میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرے فریق کی جانب سے محنت اور جدوجہد کی رسد ہوتی ہے۔ نتیجتاً جو نفع ہو وہ فریقین میں پہلے سے طے شدہ بنیادوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

وکالت

﴿۱﴾ عَنْ حَکِیْمِ بْنِ حِزَامٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ بَعَثَ مَعَہٗ بِدِیْنَارٍ لِیَشْتَرِیَ لَہٗ بِہٖ اُضْحِیَّۃً فَاشْتَرٰی کَبْشًا بِدِیْنَارٍ وَبَاعَہٗ بِدِیْنَارَیْنِ فَرَجَعَ فَاشْتَرٰی اُضْحِیَّۃً بِدِیْنَارٍ فَجَاءَ بِھَا وَ بِدِیْنَارِ الَّذِیْ اِسْتَفْضَلَ مِنَ الْاُخْرٰی فَتَصَدَّقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِالدِّیْنَارِ فَدَعَا لَہٗ اَنْ یُّبَارَکَ لَہٗ فِیْ تِجَارَۃٍ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک دینار دے کر بھیجا کہ وہ آپؐ کے لیے قربانی کا جانور خرید لائیں۔ چناں چہ انھوں نے اس سے ایک مینڈھا (یا دنبا) خریدا اور اسے دو دینار میں فروخت کر دیا۔ پھر وہ لوٹے اور قربانی کا جانور انھوں نے ایک دینار میں خرید لیا اور آ کر آپؐ کی خدمت میں قربانی کے جانور کے ساتھ وہ دینار بھی پیش کر دیا جو دوسرا جانور (یعنی پہلا خریدا ہوا جانور) فروخت کر کے بچایا تھا۔ آپؐ نے وہ دینار صدقہ کر دیا اور حکیم بن حزامؓ کے حق میں دعا کی کہ خدا ان کی تجارت میں برکت عطا فرمائے۔

تشریح: حضرت حکیم بن حزامؓ نے خرید و فروخت کا معاملہ نبی ﷺ کی طرف سے یعنی آپؐ کے وکیل کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے وکالت کا اعتبار کیا ہے۔ وکالت کا مطلب ہے اپنے حقوق و مال کے تصرف یعنی لینے دینے میں کسی کو اپنا قائم مقام بنانا۔ جو معاملہ یا کام آدمی خود کر سکتا ہے۔ جس میں اس کے لیے کوئی قباحت نہ ہو اس میں وہ کسی دوسرے کو اپنا وکیل بھی بنا سکتا ہے۔ شخصی حقوق کے علاوہ حقوق اللہ میں بھی جن میں نیابت ہو سکتی ہے وکالت بھی درست ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی تقسیم، حج اور عمرہ کسی فوت شدہ شخص یا معذور کی جانب سے ادا کرنا۔ جن عبادات میں کوئی آدمی کسی دوسرے کا نائب نہیں بن سکتا ان میں کسی کو وکیل بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے نماز اور روزہ میں کسی کو وکیل مقرر نہیں کر سکتے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عُرْوَۃَ بْنِ الْجَعْدِ الْبَارِقِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَعْطَاہُ دِیْنَارًا لِیَشْتَرِیَ شَاۃً فَاشْتَرٰی لَہٗ شَاتَیْنِ فَبَاعَ اِحْدٰھُمَا بِدِیْنَارٍ وَ اَتَاہُ بِشَاۃٍ وَ دِیْنَارٍ فَدَعَا لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فِیْ بَیْعِہٖ بِالْبَرَکَۃِ فَکَانَ لَوِ اشْتَرٰی تُرَابًا لَرَبِحَ فِیْہِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عروہ بن الجعد بارقی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک دینار

دیا کہ وہ آپؐ کے لیے ایک بکری خرید لائیں۔ انھوں نے اس سے دو بکریاں خرید لیں پھر ان میں سے ایک بکری کو ایک دینار میں فروخت کر دیا اور حضورؐ کو (واپس آکر) ایک بکری بھی دی اور ایک دینار بھی۔ (ان کی اس ذہانت پر) رسول اللہ ﷺ نے ان کے خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا فرمائی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اگر مٹی بھی خرید لیتے تو اس میں بھی ان کو نفع ہو جاتا۔

﴿۳﴾ وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰی خَیْبَرَ فَاَتَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَسَلَّمْتُ عَلَیْهِ وَ قُلْتُ اِنِّیْ اَرَدْتُ الْخُرُوْجَ اِلٰی خَیْبَرَ۔ فَقَالَ: اِذَا اَتَیْتَ وَكِیْلِیْ فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا، فَاِنِ ابْتَغٰی مِنْكَ آیَةً فَضَعْ یَدَكَ عَلٰی تَرْقُوْتِهٖ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا تو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے آپؐ کو سلام کیا اور عرض کیا کہ میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب تم وہاں میرے وکیل سے ملو تو پندرہ وسق کھجور اس سے لے لینا۔ اگر وہ تم سے کوئی نشانی مانگے تو اپنا ہاتھ اس کے ہانس (ہنسلی) پر رکھ دینا۔''

تشریح: بعض روایتوں میں عَلٰی تَرْقُوْتِهٖ کے بجائے عَلٰی تَرْقُوْتِكَ آیا ہے، یعنی نشانی طلب کرنے پر اپنا ہاتھ اپنی ہنسلی پر رکھ دینا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کوئی کسی شخص کو کسی مقام پر اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے۔

جس شخص کو آں حضرت ﷺ نے خیبر میں اپنا وکیل مقرر فرمایا تھا اُسے آپؐ نے یہ ہدایت دے رکھی ہوگی کہ اگر کوئی شخص میری طرف سے تم سے کچھ طلب کرے تو اس سے اس کا ثبوت مانگنا کہ وہ واقعی میرا فرستادہ ہے۔ اگر وہ ثبوت میں اپنا ہاتھ ہانس (حلق) پر رکھ دے تو سمجھ لینا کہ وہ میرا بھیجا ہوا ہے۔ آپؐ نے حضرت جابرؓ کو نشانی بتا دی تا کہ وکیل ان کو ۱۵ وسق کھجوریں دیدے۔

نیلام کے طریقے پر خرید و فروخت

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَاعَ حِلْسًا وَ قَدَحًا فَقَالَ: مَنْ یَّشْتَرِیْ هٰذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ فَقَالَ رَجُلٌ اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمٍ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ یَّزِیْدُ عَلٰی دِرْهَمٍ فَاَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَیْنِ فَبَاعَهُمَا مِنْهُ. (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (بچھانے کا) ایک ٹاٹ اور ایک

پیالہ اس طرح فروخت کیا کہ آپ نے فرمایا: ''یہ ٹاٹ اور پیالہ کون خریدے گا؟'' ایک شخص نے عرض کیا کہ میں یہ دونوں چیزیں ایک درہم میں لے سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کون ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے؟'' ایک شخص نے دو درہم آپؐ کو پیش کر دیے تو آپؐ نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ نیلام کے طریقے پر بھی خرید وفروخت کر سکتے ہیں۔ نیلام کے جس واقعہ کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اس کی تفصیل سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں ملتی ہے۔ ایک مفلس انصاری نے حضورؐ کی خدمت میں آ کر آپؐ سے اعانت کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے گھر میں کچھ سامان ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔ آپؐ کے حکم سے انھوں نے یہ دونوں ہی چیزیں خدمت میں حاضر کر دیں۔ آپؐ نے ان کو نیلام کر دیا۔ نیلام کرتے وقت آپؐ نے من یزید (کون اس سے زیادہ قیمت دے گا؟) دو تین دفعہ فرمایا تو ایک صاحب نے دو درہم آپ کو دیے۔ آپ نے انصاری صحابی سے فرمایا کہ ایک درہم سے تو کھانے پینے کا کچھ سامان گھر والوں کو دے دو اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لے آؤ۔ جب وہ کلہاڑی لے کر آئے تو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اس میں لکڑی کا دستہ لگایا اور فرمایا کہ یہ کلہاڑی لے کر جنگل جاؤ اور لکڑیاں لا کر فروخت کرو۔ پندرہ روز سے پہلے میرے پاس نہ آنا۔ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ یہاں تک کہ اس کمائی کے نتیجے میں ان کے پاس دس درہم جمع ہو گئے۔ انھوں نے اپنے گھر والوں کے لیے غذائی سامان اور کچھ کپڑا وغیرہ خریدا۔ اس کے بعد نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ محنت کر کے گزارا کرنا تمہارے لیے اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھرو اور قیامت میں تمہارے چہرے پر اس کا داغ اور نشان ہو۔

زراعت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ یَغْرِسُ غَرْساً اَوْ یَزْرَعُ زَرْعاً فَیَاْکُلُ مِنْهُ طَیْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِیْمَةٌ اِلَّا کَانَ لَهٗ صَدَقَةٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی مومن شخص

درخت کا پودا لگائے یا کاشت کرے پھر اس میں سے پرند کھائے یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو یہ اس شخص کے حق میں لازماً صدقہ ہوگا۔''

تشریح: یعنی زراعت اور درخت لگانے سے نہ صرف یہ کہ آدمی زراعت کی پیداوار اور درختوں کے پھلوں سے فائدہ اُٹھاتا اور اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرتا ہے بلکہ وہ اپنی پیداوار کا کچھ حصہ کارِ خیر میں صرف کر کے نیکیاں بھی کما سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چرند، پرند اور انسان اس کی پیداوار اور ثمرات میں سے کچھ کھا لیتے ہیں اور اس طرح بہ ظاہر اسے جو نقصان پہنچتا ہے اس کا بھی خدا کے یہاں اسے اجر و ثواب ملے گا۔ وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا۔

﴿۲﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَعْطٰی خَیْبَرًا الْیَهُوْدَ اَنْ یَّعْمَلُوْهَا وَیَزْرَعُوْهَا وَلَهُمْ شَطْرُ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمین وہاں کے یہودیوں ہی کے سپرد کر دی کہ وہ اس میں کام کریں اور اس میں کاشت کریں۔ جو کچھ اس میں پیدا ہوگا اس کا نصف حصہ ان کا ہوگا۔

تشریح: صحیح مسلم کی روایت میں اس کی صراحت بھی ملتی ہے کہ قابلِ کاشت زمینوں کے علاوہ خیبر کے نخلستان بھی رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے یہودیوں کے سپرد اس شرط پر کیے تھے کہ پیداوار کے نصف حصے کے وہ حق دار ہوں گے۔ گویا یہ معاملہ بٹائی کا ہوا۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمْرٍو قَالَ: قُلْتُ لِطَاؤُسٍ لَوْ تَرَکْتَ الْمُخَابَرَةَ فَاِنَّهُمْ یَزْعُمُوْنَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰی عَنْهُ قَالَ: اَیْ عَمْرٍو وَ اُعْطِیْهِمْ وَ اُعِیْنُهُمْ وَ اِنَّ اَعْلَمَهُمْ اَخْبَرَنِیْ یَعْنِیْ اِبْنَ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَنْهَ عَنْهُ وَلٰکِنْ قَالَ: اَنْ یَّمْنَحَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّاْخُذَ عَلَیْهِ خَرْجًا مَعْلُوْمًا. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عمرو (بن دینار تابعی) بیان کرتے ہیں کہ میں نے طاؤس (تابعی) سے کہا کہ آپ بٹائی پر زمین اٹھانا ترک کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ کیوں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اے عمرو، میں لوگوں کو کاشت کے لیے زمین بھی دیتا ہوں اور اس کے علاوہ بھی ان کی اعانت کرتا ہوں۔ مجھے لوگوں میں سب سے بڑے عالم یعنی عبداللہ بن

عباسؓ نے بتایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے (زمین کو بٹائی یا لگان پر اٹھانے سے) منع نہیں فرمایا تھا۔ البتہ یہ فرمایا تھا کہ "تم میں سے کوئی اپنی زمین اپنے بھائی کو کاشت کے لیے (بغیر معاوضہ کے) دے دے تو یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ وہ اس پر کوئی متعین لگان وصول کرے۔"

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں بعض حضرات یہ خیال رکھتے تھے کہ اپنی زمین کو بٹائی پر دینا درست نہیں ہے۔ لیکن یہ روایت بتاتی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے ناجائز قرار نہیں دیا تھا بلکہ آپؐ کا منشا یہ تھا کہ اپنے کسی بھائی کو اگر بغیر کسی معاوضہ کے زمین دے دی جائے تو بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے بیان اور وضاحت کی روشنی میں حضرت طاؤسؒ اپنی زمین بٹائی پر اٹھاتے تھے اور کاشت کے اخراجات میں وہ کاشت کاروں کی اعانت بھی کر دیا کرتے تھے۔ البتہ مجہول چیز پر مزارعت سے آپؐ نے منع فرمایا ہے چناں چہ رافع بن خدیجؓ کی حدیث ہے: كُنَّا مِنْ اَكْثَرِ الْاَنْصَارِ حَقْلاً فَكُنَّا نُكْرِى الْاَرْضَ عَلٰى اَنَّ لَنَا هٰذِهٖ وَلَهُمْ هٰذِهٖ فَرُبَّمَا اَخْرَجَتْ هٰذِهٖ وَلَمْ تُخْرِجْ هٰذِهٖ فَنَهَانَا عَنْ ذَالِكَ (بخاری، مسلم) "انصار میں ہمارے پاس کھیت زیادہ تھے اور ہم زمین کرایے پر دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح کہ اس قطعہ کی آمدنی ہماری ہوگی اور فلاں قطعہ کی آمدنی عامل کی ہوگی۔ پھر بعض اوقات اس قطعہ میں آمدنی ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی۔ پس نبی ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا۔"

پھلوں کی بیع

〈۱〉 عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا نَهَى الْبَائِعَ وَالْمُشْتَرِىَ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیع سے منع فرمایا جب تک کہ ان میں پختگی نہ آجائے۔ آپؐ نے بیچنے والے کو بھی منع فرمایا اور خریدار کو بھی۔

تشریح: یعنی جب تک پھل تیار نہ ہو جائے نہ انھیں بائع کو بیچنا چاہیے اور نہ خریدار کو خریدنا ہی چاہیے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: نَهٰى عَنْ بَيْعِ النَّخْلِ حَتّٰى تَزْهُوَ وَعَنِ السُّنْبُلِ حَتّٰى يَبْيَضَّ وَيَامَنَ الْعَاهَةَ "حضورؐ نے کھجور کی فصل کی بیع سے منع فرمایا جب تک کہ ان میں سرخی نہ آجائے اور کھیت کی بالوں کی بیع سے بھی منع فرمایا جب تک کہ ان پر سفیدی نہ

آ جائے اور تباہی کا خطرہ باقی نہ رہے۔"

عرب میں جہاں کہیں کھجور، انگور وغیرہ کے پھلوں کی پیداوار ہوتی تھی وہاں کے لوگ پھل تیار ہونے سے پہلے ہی جب کہ وہ درخت ہی پر ہوتے فروخت کر دیتے۔ اسی طرح کھیت میں غلہ بھی تیاری سے قبل فروخت کر دیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ کیوں کہ اس طرح بیع کرنے میں اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ کھیتی یا پھلوں کی فصل پر ناگہانی کوئی آفت آ جائے مثلاً آندھی یا ژالہ باری سے پھل یا غلہ ضائع ہو جائے یا ان کو کوئی بیماری وغیرہ لگ جائے تو خریدار کو سخت خسارہ ہوگا۔ اس صورت میں قیمت کے ادا کرنے میں نزاع پیدا ہو سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے مفاسد اور خطرات کی بنا پر اس بیع کی ممانعت فرما دی۔

(۲) وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى تَزْهِيَ، قِيْلَ وَ مَاتَزْهِيَ؟ قَالَ: حَتّٰى يَحْمَرَّ قَالَ اَرَأَيْتَ اِذَا مَنَعَ اللّٰهُ الثَّمْرَةَ بِمَا يَاْخُذُ اَحَدُكُمْ مَالَ اَخِيْهِ. (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کے بیع کی ممانعت فرمائی جب تک کہ ان پر رونق نہ آ جائے۔ عرض کیا گیا کہ رونق آ جانے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: "مطلب یہ ہے کہ سرخی آ جائے۔" پھر آپؐ فرمایا: "بتاؤ اگر اللہ پھل عطا نہ فرمائے (یعنی کسی وجہ سے پھل تیار ہونے سے پہلے ہی ضائع ہو جائیں) تو تم میں سے کوئی کس چیز کے بدلے میں اپنے بھائی سے مال وصول کرے گا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر پھلوں کو ایسا نقصان پہنچتا ہے کہ خریدار کچھ نہ پا سکا تو پھر تم اس سے کس چیز کی قیمت وصول کرو گے۔ اس لیے باغ کو اس وقت فروخت کرنا چاہیے جب پھل تیار ہو جائیں اور نقصان پہنچنے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ شریعت کے پیش نظر درحقیقت ہر فریق کے مفاد کی حفاظت ہے۔

(۳) وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ السِّنِيْنَ وَ اَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے (باغات کو) چند سالوں کے لیے

فروخت کرنے سے منع فرمایا اور آپؐ نے ناگہانی آفات (سے پہنچنے والے نقصان) کو وضع کردینے کا حکم دیا۔

تشریح: یعنی چند سالوں کے لیے باغ کی فصل کا ٹھیکہ دینا صحیح نہ ہوگا۔ کس کو معلوم ان چند سالوں میں پھلوں کی فصل کیسی رہے گی۔ اس اندیشہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس دوران فصل پر کوئی ناگہانی آفت بھی آسکتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ خریدار کو سخت نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور قیمت ادا کرنے میں دشواری پیش آسکتی ہے جس کی وجہ سے معاملہ نزاع کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ اس لیے اس طرح کا ٹھیکہ دینا ہی صحیح نہ ہوگا۔

اگر باغ کی فصل فروخت کرنے کے بعد پھلوں پر کوئی آفت آجاتی ہے تو باغ کے مالک کا فرض ہے کہ وہ نقصان کا اندازہ کرکے طے شدہ قیمت میں تخفیف کردے۔ اور اگر پوری قیمت لے چکا ہے تو اس میں سے وہ مناسب رقم اپنے پاس رکھے باقی قیمت خریدار کو واپس کردے۔ تجارت اور کاروبار کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور ایثار و قربانی کے رویہ کو یکسر فراموش کرجائیں۔

غیر آباد زمین کو آباد کرنا

〈۱〉 عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهُ قَالَ: مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَهِىَ لَهُ وَلَيْسَ لِعِرْقِ ظَالِمٍ حَقٌّ. (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مالک)

ترجمہ: حضرت سعیدؓ بن زید سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص مردہ اور ویران زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے اور ظالم کی رگ کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔“

تشریح: بخاری کی ایک روایت میں ہے: مَنْ اَعْمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا ”جو شخص ایسی زمین کو آباد کرتا ہے جو کسی کی ملکیت میں نہیں ہے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی محنت اور مشقت سے کسی ویران و بنجر زمین کو قابلِ کاشت بناتا ہے تو وہ زمین اس شخص کی ہوجائے گی بہ شرطے کہ وہ پہلے سے کسی کی ملک نہ ہو اور عام لوگوں کی کوئی مصلحت اور ضرورت اس سے وابستہ نہ ہو۔ مثلاً لوگوں کے مویشی وہاں بیٹھتے ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس زمین کے مالک ہونے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ حاکم وقت کی اجازت

حاصل ہو۔ حاکم کی اجازت کے بعد ہی وہ اس زمین کا مالک قرار پائے گا۔ اگر کسی کی آباد کردہ زمین میں پانی کا چشمہ نکل آیا تو وہ اس کا مستحق ہے کہ پہلے اپنی زمین سیراب کرے۔ پھر اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی آباد کی ہوئی زمین میں درخت لگاتا یا کاشت کرتا ہے تو اس سے وہ اس زمین کا مالک نہیں بن جائے گا۔

﴿۲﴾ وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ اَحَاطَ حَائِطاً عَلٰى الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت حسن (بصری) حضرت سمرہؓ سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”جو شخص کسی غیر آباد زمین پر دیوار کھڑی کر کے اسے گھیر لے۔ اس زمین کا وہی مالک ہے۔“

تشریح: افتادہ زمین کو اپنی ملکیت میں لینے کے لیے احیا یعنی اسے آباد کرنا ضروری ہے۔ آباد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کاشت کی جائے یا درخت لگایا جائے۔ پانی کے لیے کنویں کھودے جائیں۔ اس حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے غیر آباد زمین پر دیوار کھینچ دی تو وہ زمین اس کی ہو جائے گی۔ اس کا حق دوسروں سے بڑھ کر ہوگا۔ دیوار کھینچنے سے اغلب ہے کہ سکونت کے لیے دیوار کھینچنی مراد ہو۔

عام نعمتیں

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ. (ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تین چیزیں یعنی پانی، گھاس اور آگ ایسی ہیں جن میں تمام ہی مسلمان شریک ہیں۔“

تشریح: بعض چیزیں خدا نے ایسی پیدا کی ہیں جن کو سب کے لیے عام رکھا ہے۔ مثلاً ہوا، روشنی پانی وغیرہ۔ اس حدیث میں جن تین نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان سے ہر فرد کو فائدہ اٹھانے کا حق پہنچتا ہے۔ ان میں کسی کی ذاتی ملکیت و خصوصیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پانی سے مراد دریا،

جھیل، تالاب اور کنویں کا پانی ہے۔ کنواں کھدوانے یا ہینڈ پائپ وغیرہ لگوانے کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے پانی استعمال کرنے پر پابندی لگادے۔ اگر کسی کی آباد کی ہوئی زمین میں پانی کا چشمہ جاری ہوجاتا ہے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ پہلے اپنی زمین سیراب کرے پھر اس کے بعد فاضل پانی سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روکنا صحیح نہ ہوگا۔

گھاس۔ سے مراد وہ گھاس ہے جو جنگل میں قدرتی طور سے اُگی ہوئی ہو۔ اس سے سبھی فائدہ اٹھائیں گے۔

آگ لینے سے کسی کو منع کرنا انتہائی بخل کی بات ہے۔ بعض علماء کے نزدیک سنگ چقماق کے لینے سے بھی روکنا صحیح نہ ہوگا بہ شرطے کہ وہ موات یعنی افتادہ زمین میں پایا جاتا ہو۔ چقماق وہ پتھر ہے جس کے مارنے سے آگ نکلتی ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لاَ یُبَاعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِیُبَاعَ بِهِ الْكَلاَءُ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی ضرورت سے زائد پانی کو نہ بیچا جائے کہ اس کے ذریعہ سے گھاس فروخت کی جائے۔''

تشریح: پانی کے گرد بالعموم گھاس پائی جاتی ہے۔ لوگوں کے جانور اس میں چریں گے۔ اور گھاس چرنے کے بعد وہ پانی بھی لازماً پئیں گے۔ اب اگر پانی کا مالک قیمت لیے بغیر پانی پینے نہیں دیتا تو جن لوگوں کے جانور گھاس چریں گے وہ پانی خریدنے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح پانی کی قیمت لینی حقیقت میں گھاس کی قیمت لینی ہوئی جو درست نہیں ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ممانعت تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔

معدنیات

﴿۱﴾ عَنْ اَبْیَضَ بْنِ حَمَّالٍ الْمَأْرِبِیِّ اَنَّهٗ وَفَدَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَقْطَعَهُ الْمِلْحَ الَّذِیْ بِمَارِبَ فَاَقْطَعَهٗ اِیَّاهُ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا اَقْطَعْتَ لَهُ الْمَاءَ الْعِدَّ قَالَ فَرَجَعَهٗ مِنْهُ قَالَ وَسَأَلَهٗ مَاذَا یُحْمٰی مِنَ الْاَرَاكِ

قَالَ مَالَمْ تَنَلْهُ اَخْفَافُ الْاِبِلِ. (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابیض بن حمال ماربیؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر نمک کی وہ کان مانگی جو مارب میں تھی۔ آپؐ نے وہ کان انھیں جاگیر میں دیدی۔ جب وہ (ابیضؓ) واپس ہوئے تو ایک شخص (یعنی اقرع ابن حابس تمیمیؓ) نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، آپؐ نے تو ان کو بالکل تیار مال دے دیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر آپؐ نے وہ کان ان سے واپس لے لی۔ راوی کا بیان ہے کہ اس شخص (حضرت اقرعؓ) نے آپؐ سے دریافت کیا کہ پیلو کے درختوں کی کون سی زمین گھیری جائے۔ آپؐ نے فرمایا: ''وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں۔''

تشریح: اصل میں لفظ اَلْمَاءُ الْعِدُّ (تیار پانی) استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں نمک بالکل تیار حالت میں پایا جاتا ہے۔ نمک کی وہ کان ابتدائی حالت میں نہیں ہے جس سے جدوجہد کے بعد ہی نمک حاصل کیا جاتا ہے۔

جس کان کا ذکر اس روایت میں آیا ہے وہ مارب میں تھی۔ مارب یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ یہ شہر صنعا سے ۶۰ میل مشرق کی جانب چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پہلی صدی عیسوی تک یہاں قوم سبا کا اقتدار رہا ہے۔ یمن کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے یہ ایک تجارتی مرکز رہ چکا ہے۔ حضرت ابیضؓ اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اسی لیے انھیں ماربی کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے سمجھا تھا کہ وہ کان ابتدائی حالت میں ہے جس سے جدوجہد کے بعد ہی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن جب آپؐ کو معلوم ہوا کہ وہ کان ابتدائی حالت میں نہیں ہے بلکہ اس میں نمک بالکل تیار حالت میں موجود ہے تو آپؐ نے وہ کان حضرت ابیضؓ سے واپس لے لی۔ کیوں کہ اس صورت میں اس کان پر سب ہی لوگوں کا حق ہوتا تھا۔ اسے کسی فرد واحد کی ملکیت میں دے دینا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ چناں چہ آپؐ نے تمام لوگوں کے حقوق کے پیشِ نظر اس کان کو تنہا حضرت ابیض کی ملکیت میں رہنے نہیں دیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معدن (کان) کسی ایک شخص کی ملکیت میں نہیں ہوسکتا چاہے وہ معدن نمک کا ہو یا کوئلہ اور تیل، پٹرول وغیرہ کا۔ اس لیے کہ معدنیات سے سارے ہی لوگوں کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔

کسی افتادہ اور غیر آباد زمین کو آباد کر کے اپنے قبضے میں لیا جا سکتا ہے۔

”جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچیں“ یعنی ایسی زمین جو چراگاہ سے الگ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی افتادہ زمین کا احیاء (اسے آباد کرنا) جائز نہیں ہے جو جانوروں کے چرانے کے کام آتی ہو یا اس طرح کی دوسری ضروریات کے لیے اسے اہلِ بستی استعمال کرتے ہوں۔

خُمس

﴿۱﴾ عَمرِوبنِ عَبسَةَ قَالَ: صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلٰی بَعِیرٍ مِّنَ الْمَغْنَمِ فَلَمَّا سَلَّمَ اَخَذَ وَ بَرَةً مِنْ جَنْبِ الْبَعِیْرِ ثُمَّ قَالَ: وَلَا یَحِلُّ لِیْ مِنْ غَنَائِمِکُمْ مِثْلُ هٰذَا اِلَّا الْخُمُسَ وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِیْکُمْ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ کو سترہ قرار دے کر ہمیں نماز پڑھائی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا (نماز سے فارغ ہو گئے) تو اس اونٹ کے پہلو سے (چند) بال اکھاڑے اور ارشاد فرمایا: ”تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لیے خمس کے علاوہ اتنا بھی حصہ نہیں ہے۔ اور وہ (خمس) بھی تمہاری ضرورت پر خرچ کیا جاتا ہے۔“

تشریح: جہاد اور جنگ میں غنیم کے جس مال پر قبضہ ہوتا ہے اس مال کو غنیمت کہتے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ غنیمت کے صرف خمس یعنی پانچویں حصہ کا میں حق دار ہوں۔ اور اس خمس کے مال میں سے بھی تمہاری بھلائی اور فلاح کے کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خمس سے جہاں اپنے گھر کا خرچ نکالتے تھے وہیں اس سے جہاد کے لیے گھوڑے یا ہتھیار وغیرہ بھی خریدے جاتے تھے۔ آپ کو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی فکر نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات ہوئی تو آپ کی زرہ جو کے بدلے رہن میں رکھی ہوئی تھی۔ غنیمت میں خمس بیت المال کا ہوتا تھا باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والے فوجیوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔

فَے

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَیُّمَا قَرْیَةٍ اَتَیْتُمُوْهَا اَقَمْتُمْ فِیْهَا فَسَهْمُکُمْ فِیْهَا وَ اَیُّمَا قَرْیَةٍ عَصَتِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ خُمُسَهَا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم

ثُمَّ هِيَ لَكُمْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس بستی میں تم آئے اور وہاں ٹھہرے تو اس میں تمہارا حصہ ہے۔ اور جس بستی کے لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی یعنی جنگ کی تو اس کا خمس (پانچواں حصہ) اللہ اور اس کے رسول کا ہے اور باقی (چار حصے) تمہارے ہیں۔''

تشریح: اس حدیث میں فے اور غنیمت کے مال کے سلسلے میں ضابطہ بیان فرمایا گیا ہے۔ فے سے مراد وہ اموال ہیں جن پر لڑے بغیر قبضہ ہو جائے۔ یعنی جنگ ہونے سے پہلے ہی محاربین جن کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ فے میں اہلِ لشکر کا حصہ مقرر نہیں ہے۔ فے اصلاً بیت المال کے لیے ہے۔ اس کے مصارف کے سلسلہ میں قرآن میں یہ وضاحت موجود ہے: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ (الحشر: ۷) ''جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کی طرف بستی والوں کی طرف سے پلٹایا (یعنی بطور فے عطا کی) وہ اللہ، رسول، اور رشتہ دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، تاکہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔''

فے میں اہلِ لشکر کا حصہ مقرر نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ محاربین کے علاقہ میں جا کر ٹھہریں تو عطیہ کے طور پر فے سے انھیں بھی دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ فے اصلاً بیت المال ہی کا حصہ ہے۔ اس میں سبھی کا اتفاق ہے سوائے امام شافعیؒ کے۔ ان کے نزدیک فے میں بھی خمس یعنی پانچواں حصہ بیت المال کا ہے جس طرح غنیمت میں پانچواں حصہ بیت المال کا ہوتا ہے، جو علاقہ جنگ کے ذریعہ سے فتح ہو۔ اس طرح قبضے میں آنے والے اموال کو غنیمت کہتے ہیں۔ اس میں خمس یعنی پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول (بیت المال) کا ہوگا۔ باقی چار حصے اہلِ لشکر میں تقسیم ہوں گے۔

غصب

(۱) عَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ. فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَ اِنْ كَانَ

شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: وَاِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِنْ اَرَاکٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس کسی نے اپنی قسم (جھوٹی قسم) کے ذریعہ سے کسی مسلمان شخص کا حق غصب کرلیا اللہ نے اس کے لیے دوزخ کی آگ واجب کردی اور جنت اس پر حرام کردی۔‘‘ (یہ سن کر) ایک شخص نے عرض کیا کہ اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا! ’’اگر چہ وہ پیلو کے درخت کا ایک ٹکڑا (مسواک) ہی کیوں نہ ہو۔‘‘

تشریح: یعنی ایسا شخص جسے اپنے بھائی کے مال کے غصب کرنے میں قطعاً کوئی عار نہ ہو اور جب کہ اس کے لیے جھوٹی قسم بھی کھائے وہ خدا کی رحمت سے دور اور اس کے غضب ہی کا مستحق ہوتا ہے۔ وہ جس کردار کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں امانت و دیانت کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ پھر ایسے شخص کو تو اللہ کے عذاب ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔ قرآن میں صاف ہدایت ہے: وَلاَ تَاْکُلُوْآ اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ’’ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔‘‘

ایک دوسری حدیث ہے: مَنِ اقْتَطَعَ مِنَ الْاَرْضِ شِبْرًا ظُلْمًا طَوَّقَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ ’’جو شخص کسی کی ایک بالشت زمین ناجائز طور سے غصب کرتا ہے قیامت کے روز اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔‘‘

دارِقطنی کی ایک حدیث ہے: لاَیَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلاَّ عَنْ طِیْبِ نَفْسِہٖ ’’کسی مسلم شخص کا مال اس کی خوشی کے بغیر حلال نہیں۔‘‘ اسلام معاشی تگ و دو سے کسی کو روکتا نہیں لیکن حصولِ دولت کا ہر وہ طریقہ اس کی نگاہ میں حرام ہے جس سے کسی کی حق تلفی اور اس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ اسلام حلال اور پاک رزق پر زور دیتا ہے اور اس کے حصول کے ذرائع بھی پاک ہی ہو سکتے ہیں۔

سود

﴿۱﴾ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اٰکِلَ الرِّبٰو وَ مُؤْکِلَہٗ وَ کَاتِبَہٗ وَ شَاھِدَیْہِ وَقَالَ: ھُمْ سَوَاءٌ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے اور کھانے والے پر سود کھلانے والے اور دینے والے پر، سودی دستاویز لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر لعنت

فرمائی ہے اور فرمایا ہے: ”وہ سب (اصل گناہ کی شرکت میں) برابر ہیں۔

تشریح: اس حدیث سے سود کی قباحت اور حرمت میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ سودی کاروبار کرنے والا اور اس میں اس کے ساتھ تعاون کرنے والے سبھی لعنت کے مستحق اور خدا کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:۲۷۵) ”اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔“

اسلام کی اصل تعلیم یہ ہے کہ بنی نوع انسان ایک دوسرے کے ہمدرد اور بہی خواہ ہوں۔ ضرورت مندوں اور محتاجوں کے ساتھ ان کا رویہ دردمندی اور ترحم کا ہو۔ مساکین اور یتیموں اور مجبوروں کی خبر گیری کو اسلام نے لازم قرار دیا ہے۔ اسی لیے صدقہ، خیرات اور انفاق وغیرہ کی اہمیت و فضیلت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ سود خوری حقیقت میں اس قوم کا شعار ہرگز نہیں ہوسکتا جو صدقہ و انفاق کو خدا کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھتی ہو اور جو اپنی شخصیت کی تعمیر اور تزکیۂ نفس کے لیے انفاق یعنی نیک کاموں میں اپنا مال خرچ کرنے کو لازمی قرار دیتی ہو۔

سود کے لیے اصل لفظ رِبٰو استعمال ہوا ہے۔ رِبٰو میں سود سے زیادہ وسیع مفہوم پایا جاتا ہے۔ مروجہ سود رِبٰو کی ایک قسم ہے جس میں قرض دے کر آدمی مدت اور متعین شرح کے لحاظ سے قرض دار سے اصل رقم سے زیادہ وصول کرتا ہے۔ اس طرح قرض کے ادا کرنے کے موقع پر قرض دینے والا اپنی دی ہوئی اصل رقم کے علاوہ سود کے نام سے جو زائد رقم وصول کرتا ہے، وہ بغیر معاوضہ کے ہوتی ہے۔ ابن العربیؒ احکام القرآن میں لکھتے ہیں: اَلرِّبٰو فِی اللُّغَةِ الزِّیَادَةُ وَالْمُرَادُ فِی الْاٰیَةِ کُلُّ زِیَادَةٍ لَایُقَابِلُهَا عِوَضٌ ”ربا کے معنی باعتبار لغت زیادتی اور بڑھوتری کے ہیں۔ آیت قرآنی میں اس سے مراد ہر وہ زیادہ مال یا رقم ہے جو بغیر مالی معاوضے کے حاصل کی جائے۔“ مثلاً روپیہ قرض دے کر قرض دار سے واپسی کے وقت اصل دی ہوئی رقم۔ سے زیادہ سود کے نام سے جو رقم لی جاتی ہے وہ بے معاوضہ ہوتی ہے، اس لیے وہ ربا میں داخل ہے۔ جاہلیت میں اہلِ عرب اس ربا سے بہ خوبی واقف تھے۔ اور اس طرح کا سود ان کے یہاں مروج تھا۔ نبی ﷺ نے بیع و شرا کی ان صورتوں کو بھی ربا قرار دیا جن میں بلا معاوضہ کوئی زائد شے حاصل کی جاتی ہو۔ حدیث میں اسی لیے اس شخص کی سواری پر سوار ہونے یا اس کا ہدیہ قبول کرنے سے منع فرمایا گیا ہے جس کے ذمہ اپنا قرض ہو۔ البتہ اس طرح کے ہدیہ وغیرہ کے معاملات اگر اس

کے ساتھ پہلے سے چلے آ رہے ہوں تو بات دوسری ہے۔

سود کی حرمت کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ صدقہ اور زکوٰۃ (جس کی دینی اہمیت سے انکار ممکن نہیں) کی روح اور اسپرٹ کے خلاف ہے۔ آیت تحریم ربا کے سیاق وسباق اور نظم کلام سے یہ اظہر من الشّمس ہے۔ سورۃ البقرہ تحریم ربا (آیت: ۲۷۵-۲۷۸) سے پہلے بالتفصیل انفاق فی سبیل اللہ پر لوگوں کو ابھارا گیا ہے۔ مسکینوں اور غیر مستطیع اشخاص کی مدد کو مذہبی اور اخلاقی عظمت کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ اور اس طرح مال خرچ کرنے کو موجب رضائے خداوندی اور باعث خیر و برکت ٹھیرایا گیا ہے۔ اور اہل ایمان کو یقین دلایا گیا ہے کہ ان کی فیاضیوں کا اجر خدا کی طرف سے مل کر رہے گا۔ اور وہ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کر کے خسارے میں ہرگز نہیں رہیں گے۔ سورۃ الروم میں بھی سود یا ربا کی تذمیم سے پہلے ارشاد ہوا ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ’’پس رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور محتاج اور مسافر کو بھی، یہ بہتر ہے ان کے لیے جو اللہ کی خوش نودی چاہتے ہوں اور وہی کامیاب ہیں۔‘‘ (آیت: ۳۸)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ربا (سود) اور صدقہ دونوں کا موقع ومحل ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنی۔ مال تجارت کی خرید وفروخت میں جانبین کی پوزیشن یکساں ہوتی ہے۔ دونوں یکساں طور پر ضرورت مند ہوتے ہیں۔ فریقین معاملہ کرنے میں آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک محتاج شخص جو قرض طلب کرتا ہے اس میں اور اس صاحب ثروت شخص میں جس سے وہ قرض لینا چاہتا ہے زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایک طرف ضرورت مند جو اپنے کفاف کے لیے قرض لے رہا ہے۔ دوسری طرف مال دار شخص جسے محض اپنی دولت میں اضافہ کی فکر ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو (البقرہ: ۲۷۵) ’’اللہ نے بیع وشرا کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔‘‘

اہل حاجت کی حاجت روانی کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اولاً جو کچھ ان کو ان کی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے دیا جائے اُسے معاف کر دیا جائے۔ اور اس کے اجر وثواب کا طالب خدا سے ہوا جائے۔ یہ صدقہ یا زکوٰۃ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ضرورت مند کو جو کچھ دیا جائے وہ بہ طور قرض حسن دیا جائے۔ یعنی اگر وہ محتاج آئندہ ذی استطاعت ہوجاتا ہے تو وہ

قرض ادا کردے گا۔ اہل حاجت کی حاجت روائی کم از کم قرض حسن کے ذریعہ سے صاحب استطاعت پر واجب ہے۔ محتاج اور ضرورت مند کی حاجت روائی کی تیسری صورت یہ ہے کہ صاحب احتیاج کو اس شرط پر مجبور کیا جائے کہ وہ جتنا قرض لے رہا ہے اس اصل قرض سے زائد لوٹائے گا۔ یہی تیسری صورت ہے جسے ربا یا سود کہا جاتا ہے۔

شریعت کا منشا یہ ہے کہ مسکین اور محتاج کی ضرورت پوری کی جائے۔ کوئی بھوکا نہ مرنے پائے۔ جس طرح بھی ممکن ہو محتاج کی حاجت روائی کی جائے۔ اسے صدقہ دیا جائے یا قرض حسن کے طور پر اس کی مدد کی جائے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بعض غیور قسم کے لوگ صدقہ لینا گوارا نہیں کرتے یا صدقہ لینا ان کے لیے جائز نہیں ہوتا جیسے سادات۔ ایسے لوگوں کی ضرورت قرض حسن کے ذریعہ سے رفع کی جائے۔ لیکن اگر یہ شرط کی جائے کہ قرض کی ادائیگی زائد رقم کے ساتھ کرنی ہوگی تو یہ حرام ہے۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلرِّبٰو سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ. (ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”سود خوری کے ستر حصے ہیں، ان میں سب سے ادنیٰ اور معمولی ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں کے ساتھ مباشرت کرے۔“

تشریح: ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: دِرْھَمُ رِبًا یَاْکُلُہٗ الرَّجُلُ وَھُوَ یَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّۃٍ وَّ ثَلاَثِیْنَ زِیْنَۃً (احمد، دارقطنی عن عبداللہ ابن حنظلہ) ”سود کا ایک درہم بھی جس کو آدمی جان بوجھ کر کھائے چھتیس دفعہ زنا کرنے سے بڑھ کر سنگین جرم و گناہ ہے۔“

سود کھانے والوں کو قرآن میں یوں خبردار کیا گیا ہے: فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ”اعلانِ جنگ سن لو، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔“ اب جس کے خلاف خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہو اس کی ہلاکت اور بدبختی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سود خوری اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بھی بہ درجہا زیادہ سنگین اور قبیح گناہ ہے۔ سود خوری اصل میں اسلام کے مزاج اور اس کی اصل روح کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام یہ ہے کہ محتاجوں اور کمزوروں کو سہارا دیا جائے۔ ان کی حاجت روائی کے ذریعہ سے خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اب اگر کوئی

اسلام کی اسپرٹ اور اس کی روح کو نظر انداز کر کے اپنے مقروض سے سود لیتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس کی یہ مادّہ پرستانہ ذہنیت انتہائی مبغوض اور قابلِ نفریں ہے۔ جس طرح کوئی وحشی اگر جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ماں کے ساتھ مباشرت کرتا ہے تو اس کی کمینگی اور رذالت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی ماں کے ساتھ آدمی کا جو پاک اور نازک رشتہ ہوتا ہے اس کا خون کرنا ناقابلِ برداشت جرم ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کی مجبوری اور ان کی محتاجی کو اپنے لیے ذریعۂ منفعت سمجھنا۔ ان کو سہارا دینے کے بجائے سود لے کر ان کا خون چوسنا وحشت اور رذالت میں اس سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہے کہ کوئی شخص اپنی بڑھی ہوئی جنسی خواہش کو پوری کرنے کے لیے ماں کی عزت پر حملہ کر بیٹھے۔

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام کی اساس یہ ہے کہ انسانوں کو ہم اپنا حریف نہ سمجھیں۔ ان کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کی مدد اور اعانت کرنے سے ہم ہرگز گریز نہ کریں۔ دردمندی اور شفقت علی الخلق کا جذبہ بیش قیمت جذبہ ہے۔ اس سے اگر ہمارے قلوب خالی ہیں تو اس کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے قلوب میں زندگی کی رمق باقی نہیں ہے۔ اور یہ اتنی تشویشناک بات ہوگی کہ اس سے کسی حال میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

〈۳〉 وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِذَا اَقْرَضَ اَحَدُكُم قَرْضًا فَاَهْدٰى اِلَيْهِ اَوْ حَمَلَهٗ عَلَى الدَّابَّةِ فَلاَ يَرْكَبُهٗ وَلاَ يَقْبَلُهَا اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ جَرٰى بَيْنَهٗ وَ بَيْنَهٗ قَبْلَ ذٰلِكَ. (ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے تو اگر وہ مقروض شخص اسے کوئی ہدیہ دے یا اسے سواری کے لیے اپنا جانور پیش کرے تو نہ وہ اس پر سوار ہو اور نہ اس ہدیہ (تحفہ) کو قبول کرے الاّ یہ کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے اس طرح کا معاملہ ہوتا رہا ہو۔“

تشریح: ایک دوسری روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شِفَاعَةً فَاهْدٰى لَهٗ هَدِيَةً عَلَيْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰى بَاباً عَظِيْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبٰو (ابوداؤد، عن ابی امامہؓ) ”جس نے کسی کے لیے سفارش کی پھر (سفارش کرانے والے نے) اسے ہدیہ دیا اور اس نے اس کو قبول کرلیا تو

یقیناً وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔‘‘

ان روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے سود کو حرام ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کے کھلے چھپے دروازوں کو بھی بند کر دینا چاہا ہے۔ قرض دے کر اس سے نفع حاصل کرنا ربا (سود) ہے۔ اسی لیے اس شخص کی سواری استعمال کرنے اور اس کا ہدیہ لینے سے منع کیا گیا جس کے ذمے اپنا قرض ہو۔ کسی کی سفارش کر کے اس کے ہدیہ کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس نیکی کا بدلہ لے لیا جو بے معاوضہ ہونی چاہیے تھی۔ سود میں بھی یہی ہوتا ہے۔ قرض دینے والا اس نیکی (ضرورت مند کو قرض دینے کی نیکی) پر نفع حاصل کرتا ہے جو نیکی اسے بغیر کسی معاوضے کے کرنی چاہیے تھی۔ اپنے بھائی کی مدد کرنی اور اسے پریشانیوں سے بچا لینا یہ تو ہمارا فرض اور بھائی کا ہم پر حق ہوتا ہے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ الرِّبَا وَ اِنْ كَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِيْرُ اِلٰى قَلٍّ. (مسند احمد، ابن ماجہ، البیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’سود (سے حاصل شدہ مال) خواہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر اس کا انجام قلت اور کمی ہے۔‘‘

تشریح: سود سے بہ ظاہر کتنا ہی فائدہ سود خور حاصل کرتا ہو لیکن اس کا انجام کبھی خوشتر نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ (البقرۃ:۲۷۶) ’’اللہ سود کو گھٹاتا اور مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔‘‘ برکات اور خیر و فلاح کا تعلق صدقات ہی سے ہے سود سے نہیں۔ صدقہ کرنے والوں کے حصے میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کا ثواب آتا ہے۔ سود کھانے والوں کا مقدر اللہ کی ناراضی ہوتی ہے۔ سود کی نحوست بسا اوقات دنیا میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو دیوالیہ ہوتے دیکھا گیا ہے۔ سود خور حقیقی عزت سے محروم ہو کر رہتے ہیں۔ انسانی شرف و احترام سے محرومی ان کی قسمت ہوتی ہے۔ سماج میں ان کی حیثیت درندوں سے مختلف نہیں ہوتی۔

آج کا معاشی نظام جو سود پر قائم ہے اس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ یہ نظام کسی خاص ملک و قوم ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک عذاب ثابت ہو رہا ہے۔ کتنے ملک اور قومیں سود کی نحوست کے سبب سے اقتصادی تباہی کا شکار نظر آتی ہیں۔ کتنے ہی ممالک ہیں جن

کی سیاسی اور ملکی پالیسیوں تک پر سود خور ممالک یا طبقے بری طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ سودی نظام معیشت در حقیقت مادہ پرستی کی انتہا ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں برابر اضافہ ہوتا جاتا ہے اور عوام مفلس سے مفلس تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تجارت پر اصلاً سرمایہ دار ہی قابض ہوتے ہیں۔ اشیاء کا نرخ وہ متعین کرتے ہیں۔ چیزوں کی قیمتیں اتنی چڑھتی جاتی ہیں کہ حکومتیں بھی ان پر قابو پانے میں ناکام دکھائی دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ لوگوں میں بے اطمینانی عام ہو جائے، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے واقعات کی کثرت ہو۔ دنیا طلبی اور مادہ پرستی کے نتیجہ میں ہر جگہ اور ہر طبقہ میں بدعنوانی اور کرپشن کا دور دورہ ہو جائے۔ اس صورت حال کا خمیازہ خود سرمایہ دار طبقہ کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فریب دہی اور ظالمانہ روش اختیار کر کے خواہ کتنی ہی دولت جمع کر لی جائے وہ کبھی انسانوں کی فلاح و بہبود کا مظہر نہیں ہوئی۔

آج کی دنیا میں بینک ایک ضرورت بن چکا ہے۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ سود کے بغیر بینک کا نظام کیسے چلایا جاسکتا ہے؟ لیکن معاشیات کے ماہرین اگر چاہیں تو بینکنگ کا ایسا خاکہ پیش کر سکتے ہیں جس میں سود کے بجائے مضاربت یا مشارکت کے اسلامی اصولوں کو اختیار کیا گیا ہو۔ اسلامی اصولوں کو اپنا کر غیر سودی بینک بہ آسانی چلایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ مل کر ایک ادارہ قائم کریں۔ ادارہ شرکاء کی رقوم کی حفاظت کرے اور بہ وقت ضرورت ان کے لیے قرضہ جات کا اجراء بھی کرے۔ آمدنی کو بڑھانے کے لیے ادارہ مشارکت یعنی کاشت کاری، تجارت، تعمیر اور صنعت کے ایسے میدانوں میں سرمایہ لگائے جہاں سے ادارے کو منافع کی توقعات ہوں۔ سال کے خاتمہ پر حسابات کر لیے جائیں اور حصہ داروں میں منافع حصہ رسد تقسیم کر دیا جائے۔ مختلف شہروں میں اس ادارے یا بینک کی شاخیں قائم کی جائیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ رقوم کی منتقلی کے انتظامات بھی کیے جاسکیں۔

اسی طرح اسلامی اصولوں کے تحت قمار اور سود وغیرہ سے پاک بیمہ پالیسی کا نظم بھی ہوسکتا ہے۔ بیمہ پالیسی کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اتفاقیہ حادثے سے پیش آنے والے نقصانات کو پورا کیا جاسکے۔ اس کی ایک شکل یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ لوگ اپنے مشترکہ سرمایہ سے ایک فنڈ قائم کریں جس میں طے شدہ شرح سے لوگ اپنی رقمیں جمع کرتے رہیں۔ اب اگر آگ لگنے اور

گاڑیوں کے ٹکرانے وغیرہ کسی حادثے سے کسی کو نقصان پہنچ جاتا ہے تو وہ اتنی رقم لے لے جس سے نقصان کی تلافی ہوسکے۔ اور اگر اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زیادہ لینے کی ضرورت پڑتی ہے تو زائد رقم بہ طور قرض اسے دی جائے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہوگی۔

حصہ داری میں جمع شدہ سرمایہ کو بہ صورت مضاربت تعمیرات اور صنعتی اداروں میں منافع کی غرض سے لگایا جاسکتا ہے۔ پالیسی کے ضوابط واضح طور پر متعین ہوں۔ بلا کسی امتیاز کے تمام شرکاء ان ضوابط کے پابند ہوں گے۔ حصہ داری کے اس کام کی اصل غرض و غایت ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور خوش نودیِ رب کا حصول ہو۔ اخلاص و دیانت کے ساتھ اگر اس پالیسی کو چلایا جائے تو یقیناً اس میں ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

﴿۵﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: رَأَیْتُ اللَّیْلَةَ رَجُلَیْنِ اَتَیَانِیْ، فَاَخْرَجَانِیْ اِلٰی اَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ، فَانْطَلَقْنَا حَتّٰی اَتَیْنَا عَلٰی نَهْرٍ مِنْ دَمٍ فِیْهِ رَجُلٌ قَائِمٌ، وَعَلٰی شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ بَیْنَ یَدَیْهِ حِجَارَةٌ، فَاَقْبَلَ الرَّجُلُ الَّذِیْ فِی النَّهْرِ، فَاِذَا اَرَادَ اَنْ یَّخْرُجَ رَمَی الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فِیْ فِیْهِ. فَرَدَّهٗ حَیْثُ کَانَ فَجَعَلَ کُلَّمَا جَآءَ لِیَخْرُجَ رَمٰی فِیْ فِیْهِ بِحَجَرٍ فَیَرْجِعُ کَمَا کَانَ. فَقُلْتُ مَا هٰذَا الَّذِیْ رَأَیْتُهٗ فِی النَّهْرِ؟ قَالَ: اٰکِلُ الرِّبَا. (بخاری)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رات میں نے دیکھا کہ دو شخص میرے پاس آئے اور وہ مجھے ایک مقدس سرزمین کی طرف لے گئے۔ پھر وہاں سے ہم آگے کو چلے یہاں تک کہ خون کے ایک دریا پر پہنچے۔ اس میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا اور اس دریا کے کنارے ایک دوسرا شخص موجود تھا جس کے سامنے بہت سے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ دریا میں جو آدمی تھا وہ آگے آیا لیکن جب اس نے نکلنے کا ارادہ کیا تو کنارے پر کھڑے شخص نے اس کے منہ پر پتھر مار کر اسے وہیں لوٹا دیا جہاں سے وہ چلا تھا۔ ہر دفعہ جب وہ نکلنے کی کوشش کرتا یہ اس کے منہ پر پتھر مارتا اور وہ اپنی پہلی حالت پر لوٹنے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے جسے میں (خون کے) دریا میں دیکھ رہا ہوں؟ ان دونوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ (دنیا میں) سود کھاتا تھا۔“

تشریح: یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ نبی ﷺ کو خواب میں عالمِ برزخ کا مشاہدہ کرایا گیا۔

آپؐ کو دکھایا گیا کہ لوگوں کو اپنے نیک و بد اعمال کا صلہ مل کر رہے گا۔ آدمی کے اعمال کے اثرات یوں تو دنیا کی زندگی ہی میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ عالم برزخ اور آخرت میں تو آدمی اپنے اچھے برے اعمال کے نتائج بیّن طور پر دیکھے گا جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اس خواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری زندگی آخرت تک وسیع ہے۔ موت پر اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس لیے سخت نادانی ہوگی کہ ہم دنیوی زندگی کے محدود دائرے میں پہنچنے والے نفع و نقصان کو ہی نفع و نقصان تصور کریں۔

سود خور لوگوں کے حقوق کو پامال کر کے اور ان کا خون چوس کر ہی اپنی دولت کو بڑھاتا ہے۔ اسے خبر نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کا خون جمع کر رہا ہے جو دریا بن جانے والا ہے۔ اور وہی اس کی قسمت ثابت ہوگا۔ اس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ مادی خوراک اور غذا سے نہیں آدمی کی شخصیت کی تعمیر اس کے اعمال سے ہوتی ہے۔ شخصیت جیسی ہوگی اسے جھٹلایا نہیں جا سکے گا۔ آدمی کا انجام چیخ رہا ہوگا کہ وہ کون ہے۔

رشوت

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلرَّاشِيَّ وَالْمُرْتَشِيَ.

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

تشریح: البیہقی فی شعب الایمان میں وَرَائِش بھی آیا ہے یعنی اس شخص پر لعنت ہے جو رشوت لینے اور دینے والے کے درمیان واسطہ یا ذریعہ بنتا ہے۔ رشوت وہ مال ہے جو کسی حاکم وغیرہ کو اس غرض سے دیا جائے کہ وہ ناحق کو حق اور حق کو ناحق کر دے۔ یعنی اسے مال یا رقم دے کر اس سے اپنے حق میں غلط فیصلہ کرا لے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی حرکت دیانت اور حق پرستی کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام اسے کب پسند کر سکتا ہے کہ کوئی رشوت کے زور سے کسی کا حق ہڑپ کر لے۔ رشوت دینی اور رشوت لینی دونوں ہی نہایت گھناونی حرکت ہے۔ اس لیے اس کے مرتکب لازماً لعنت ہی کے مستحق ہوتے ہیں۔

البتہ بعض حالات میں آدمی کو اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لیے کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے یہ وہ رشوت نہیں ہے جس کے دینے والے پر آپ ؐ نے لعنت فرمائی ہے۔

قِمار (جوا)

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فِیْ حَلَفِهٖ بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی فَلْیَقُلْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَنْ قَالَ لِصَاحِبِهٖ تَعَالِ اُقَامِرُکَ فَلْیَتَصَدَّقْ.

(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص قسم کھائے اور اپنی قسم میں کہے کہ قسم ہے لات اور عزیٰ کی، تو اس کو چاہیے کہ کہے **لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ** (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) اور جو شخص اپنے ساتھی اور دوست سے یہ کہے کہ آؤ ہم دونوں جوا کھیلیں تو اُسے چاہیے کہ وہ صدقہ دے۔“

تشریح: قسم خدا کے اسم ذات اللہ یا اس کے دوسرے ناموں کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ اللہ کی ان صفات کے ساتھ بھی قسمیں کھاتے ہیں جن کے ساتھ قسمیں کھانے کا رواج ہے جیسے اللہ کی عزت وجلال کی قسم، اللہ کی عظمت اور اس کی بزرگی کی قسم۔

عربی زبان میں قسم کے لیے تین حروف واو، با، تا استعمال ہوتے ہیں جیسے واللہ، باللہ، تاللہ۔ عربی اسلوب کے تحت یہ حروف مقدر بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی ان لفظوں کا استعمال نہیں ہوتا مگر ان کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے الله افعله کا مفہوم ہے و الله افعله یعنی بہ خدا میں اسے کروں گا۔ اسلام میں اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ اپنے سر یا اولاد کی قسم کھاتے ہیں یہ جائز نہیں ہے۔

لات اور عزیٰ مشرکین عرب کے مشہور بت تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ قسم کھانے والا ان کی عظمت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ ارتداد اور کفر ہے۔ اس لیے ان کی قسم کھانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) پڑھ کر اپنے ایمان کی تجدید کرے اور اس طرح تائب ہو کر دوبارہ اسلام میں داخل ہو جائے اور کفر سے اپنے آپ کو نکال لے۔

لیکن لات یا عزیٰ کا نام اگر سہواً کسی نومسلم شخص کی زبان پر آ گیا ہو تو بھی یہ سہو اور غفلت معمولی نہیں ہے۔ اسے کفارہ کے طور پر کلمۂ طیبہ پڑھ لینا چاہیے۔ کلمۂ طیبہ کے پڑھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ غفلت اور سہو سے تائب ہوتا ہے۔ نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں۔ کلمۂ طیبہ سے گناہ اور اس کے اثرات زائل ہو جائیں گے۔ اور اسے اس کا پورا احساس ہو جائے گا کہ اس سے جو سہو ہوا ہے وہ توحید کے بالکل مخالف ہے۔ وہ کوئی معمولی سہو ہرگز نہیں ہے۔

اس حدیث میں ارتکابِ شرک کے بعد قمار یعنی جوا کا ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ’’جو شخص اپنے دوست یا ساتھی سے یہ کہے کہ آؤ ہم دونوں جوا کھیلیں تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ دے۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے گناہ کی طرف بلایا جو کوئی معمولی گناہ نہیں ہے اس لیے اسے فوراً اپنے گناہ سے توبہ کرنا چاہیے اور بہ طور کفارہ اپنے مال سے کچھ صدقہ بھی دینا چاہیے مال کی رغبت ہی دراصل اس شنیع فعل کا محرک ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل سے مال کی محبت کو نکالے اور صدقہ دے۔

قمار یا جوا کی دعوت دینے پر کفارہ ادا کرنا ضروری ہے تو جو شخص واقعتاً جوا کھیلتا اور کھلاتا ہے وہ کتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر شخص بہ خوبی کر سکتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ سارے ہی کاروبار حرام قرار پائیں گے جن میں قمار شامل ہوتا ہے۔ جیسے لاٹری، سٹہ بازی، ریس اور بازی بدنا وغیرہ۔ اسلام کسی ایسے کام کو جائز نہیں سمجھتا جس میں فریقین میں سے کسی نہ کسی فریق کے لیے خسارہ میں پڑنا لازمی ہوتا ہے۔ ان برائیوں کے ارتکاب سے کتنے ہی لوگ تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں، اس سے سبھی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے جوا وغیرہ کو ہمیشہ برا سمجھا گیا ہے۔

〈۲〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم نَهٰى عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَالْكُوْبَةِ وَالْغُبَيْرَاءِ وَقَالَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے اور جوا کھیلنے سے منع فرمایا ہے اور کوبہ اور غُبیر اسے بھی منع کیا ہے۔ نیز فرمایا کہ ’’ہر وہ چیز جو نشہ لائے حرام ہے۔‘‘

تشریح: کوبہ، نرد (ایک کھیل) اور شطرنج کو کہتے ہیں (قاموس)۔ غُبیرا ایک قسم کی شراب ہے، بالعموم اسے حبشی تیار کرتے تھے۔

شراب کی بیع

(۱) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ ؓ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ عَامَ الْفَتْحِ وَھُوَ بِمَکَّۃَ: اِنَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ وَالْمَیْتَۃِ وَالْخِنْزِیْرِ وَالْاَصْنَامِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے سال جب کہ آپؐ مکہ ہی میں تشریف رکھتے تھے یہ فرماتے ہوئے سنا: ’’اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور اور بتوں کی بیع کو حرام کر دیا ہے۔‘‘

تشریح: شراب، مردار اور سور انسان کے لیے حد درجہ مضر ہیں۔ شراب کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ شرابی کے لیے شراب نوشی ایک ضرورت بن جاتی ہے جس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ شراب پینے سے شرابی کو جو سرور و کیف حاصل ہوتا ہے وہ وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ شراب کی اس عارضی لذت کے لیے آدمی کو جو قیمت چکانی پڑتی ہے وہ کوئی معمولی قیمت نہیں ہوتی۔ روپے پیسے کی بربادی کے علاوہ صحت پر اس کے نہایت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شراب نوشی سے نظام ہاضمہ، دوران خون اور اعصابی نظام وغیرہ سبھی پر برے اثرات پڑتے ہیں۔ پھر زیادہ مقدار میں شراب پینے کے بعد آدمی ہوش میں بھی نہیں رہتا۔ بے ہوشی اور مخموری کی حالت میں لوگوں نے جو حیا سوز حرکتیں کی ہیں ان سے کون ناواقف ہو سکتا ہے۔ جو شخص نشہ میں دھت ہے اس میں اور ایک پاگل میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہتا۔ ہوش و شعور انسان کے لیے بڑی نعمت ہے۔ سرود و لذت وہی معتبر ہے جو ہوش کے گھٹنے سے نہیں بلکہ اس کے بڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انتہائی خوشی اور روحانی مسرت کی حالت میں بھی ایک محویت تو ہوتی ہے لیکن اس میں اور نشہ کی بے ہوشی میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

مردار جانور کا گوشت بھی صحت انسانی کے لیے نہایت مضر ہے بلکہ اس کا انسان کے مزاج و ذوق پر بھی نہایت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہی حال سور کے گوشت کا بھی ہے۔ سور ایک گندا جانور ہے۔ اس کی خصلت بھی نہایت گھناونی ہوتی ہے۔ اس کا گوشت بھی صحت کے لیے مضر ثابت ہوا ہے۔ پھر اسے اپنی غذا بنانے والا وہی حرکتیں کرتے نظر آتا ہے جو سور کی خصلت ہے۔ سور کھانے والی قومیں جس بے شرمی اور بے حیائی کی مرتکب نظر آتی ہیں وہ کوئی چھپی

ڈھکی چیز نہیں ہے۔ یورپین قوموں میں جو سور کے گوشت کی شائق ہیں، عریانیت، اباحیت پسندی اور حیاسوز حرکات ان کی تہذیب بن چکی ہے۔

جس طرح مردار گوشت اور سور کا گوشت ایک ناپاک غذا ہے جسم کے لیے ٹھیک اسی طرح شرک اور بت پرستی بھی ایک ایسی گندگی ہے جس سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے۔ وہ بلندی سے نہایت پستی میں گر جاتی ہے۔ پھر انسان اس قابل نہیں رہ جاتا کہ وہ خدا کی تجلیات کا حامل بن سکے۔ اور خدا کی عظمت کا احساس اور اس کی محبت اس کے دل میں جگہ پا سکے۔ وہ خدا سے دور، بہت دور ہو جاتا ہے۔ خدا کے غضب کے سوا وہ کسی اور چیز کا مستحق نہیں رہ جاتا۔

جو چیزیں حرام اور انسان کے لیے مضرت رساں ہیں ان کی تجارت کی اجازت اسلام کیسے دے سکتا ہے۔ شراب اور جوا وغیرہ کی خرابی سے یوں تو کسی کو بھی انکار نہیں ہے لیکن سیکولر حکومتوں میں ان کی تجارت وغیرہ پر کوئی پابندی نہیں۔ خدا کا خوف اور فکر آخرت اگر نہ ہو تو کسی کے لیے گناہوں سے باز رہنا آسان نہیں ہوتا۔

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’جس کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔‘‘

تشریح: شراب پینے والا یہ عذر نہیں کر سکتا کہ وہ تو مقدار میں بس اتنی ہی شراب پیتا ہے جس سے نشہ نہ ہو۔ ہمیشہ اپنے آپ پر اسے قابو حاصل رہے گا اس کی کوئی گارنٹی نہیں لے سکتا۔ ایسی بری چیز سے دور رہنے ہی میں عافیت ہے۔ جو چیز بری ہو آدمی کو اس کے قریب بھی نہیں جانا چاہیے۔ بری چیز سے جب تک نفرت نہ ہو جائے اس سے بچنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّهٗ لَيْسَ بِدَوَاءٍ وَلٰكِنَّهٗ دَاءٌ (يَعْنِى الْخَمْرَ) (مسلم)

ترجمہ: حضرت وائل بن حجرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’شراب دوا نہیں ہے بلکہ وہ تو خود روگ ہے۔‘‘

تشریح: یعنی روگ سے روگ کو دور کرنے کی کوشش فضول ہے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہو گی کہ کسی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے آدمی ایک دوسری مصیبت میں اپنے آپ کو مبتلا

کرلے۔ بعض لوگ کسی غم کو دور کرنے کے لیے شراب پیتے یا کوئی دوسری نشیلی چیز استعمال کرتے ہیں۔ اس سے غم تو دور ہوتا نہیں کچھ دیر کے لیے ہم اسے بھول ضرور جاتے ہیں۔ لیکن نشہ اُترتے ہی غم اور زیادہ قوت کے ساتھ ہمارے دل و دماغ کو جکڑ لیتا ہے۔ ہم شراب کی مقدار کو بڑھا سکتے ہیں، نشہ کی گولیاں زیادہ سے زیادہ استعمال کرسکتے ہیں اس سے غم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن وہ ختم نہیں ہوتا۔ کسی چیز پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سمجھ پیدا کریں۔ اور اپنے ہوش کو بڑھائیں۔ کسی چیز کی اصل حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہم اس سے پار ہوجاتے ہیں۔ اسے دبانے یا اس کو فراموش کرنے کی کوشش سے وہ چیز مٹتی نہیں۔ اسے جان لینے کی ضرورت ہے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ دَيْلَمِ الْحِمْيَرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا بِاَرْضٍ بَارِدَةٍ نُعَالِجُ فِيْهَا عَمَلاً شَدِيْدًا وَ اِنَّا نَتَّخِذُ شَرَاباً مِّنْ هٰذَا الْقَمْحِ نَتَقَوّٰى بِهٖ عَلٰى اَعْمَالِنَا وَ عَلٰى بَرْدِ بِلاَدِنَا. قَالَ: هَلْ يُسْكِرُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: فَاجْتَنِبُوْهُ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت دیلم حمیریؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم سرد سرزمین میں رہتے ہیں اور اس میں نہایت محنت مشقت کے کام کرتے ہیں اور ہم اپنے حصول طاقت اور سردی کو دور کرنے کی غرض سے جو ہمارے شہروں میں پڑتی ہے۔ اس قسم کی گیہوں کی شراب بنالیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا وہ نشہ لاتی ہے؟'' میں نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس سے بچو۔''

تشریح: شراب سے کچھ فائدے بھی ہوسکتے ہیں مگر ضرر اس کے فائدے کے مقابلے میں کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ (البقرہ:۲۱۹)۔ نشہ کی اجازت اسلام نہیں دے سکتا۔ نشہ خدا کی بخشی ہوئی ایک بڑی نعمت کی ناقدری ہے۔ ہوش اور ذہن و فکر میں اعتدال سے بڑھ کر دوسری کیا نعمت ہوگی۔ اس کا نقصان کبھی بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۵﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ. (احمد)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہر ایک نشہ آور شراب ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔''

﴿۲﴾ وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ لَمْ يَتُبْ مِنْهَا حُرِمَهَا فِى الْاٰخِرَةِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں شراب پی پھر اس سے تائب نہ ہوا وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔''

تشریح: دنیوی شراب سے ایک طرح کا سرور حاصل ہوتا ہے مگر اس کے نقصانات بے انتہا ہیں۔ آخرت کی شراب میں لذت ہی لذت ہوگی۔ نہ اس سے دماغ مختل ہوگا اور نہ کوئی دوسری خرابی پیدا ہوگی۔ آخرت کی اس نعمت کے مستحق اصلاً وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے آخرت کو زندگی کو اصل مقصد قرار دے کر زندگی بسر کی ہوگی۔ زندگی کی صحیح پالیسی یہ ہے کہ آدمی برتر و بہتر کو کمتر پر ترجیح دے۔ اب اگر کوئی یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ابھی اس کی زندگی بننے میں ناکام ہے اور یہ انسان کے لیے نہایت سنگین بات ہوگی۔

حرام کی کمائی

﴿۱﴾ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَايَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا وَاَنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا وَقَالَ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ. ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ يَارَبِّ يَارَبِّ! وَ مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَ غُذِىَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذَالِكَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ پاک ہے اور وہ پاک ہی چیزوں کو قبول کرتا ہے اور اللہ نے مومنین کو اسی چیز کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے رسولوں کو دیا ہے۔ چناں چہ اس کا ارشاد ہے: ''اے رسولو، عمدہ پاک چیزیں کھاؤ اور صالح عمل

کرو[1]"، اور فرمایا ہے: "اے ایمان لانے والو، کھاؤ پاک عمدہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں[2]"۔ پھر آپؐ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو "طول طویل سفر اختیار کرتا ہے پراگندہ بال اور غبار آلود، وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور یارب! یارب! کہتا ہے، جب کہ کھانا اس کا حرام اور پینا اس کا حرام اور لباس اس کا حرام اور اس کی پرورش بھی حرام غذا سے ہوئی ہے۔ پھر کیوں کر اس کی دعائیں قبول کی جائیں۔"

تشریح: حضور ﷺ مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ ایک شخص محنت و مشقت برداشت کر کے مقامات مقدسہ کا سفر اختیار کرتا ہے۔ سفر کی حالت میں اس کے بال پراگندہ ہو گئے ہیں اور اس کا جسم غبار آلود ہو گیا ہے۔ وہ نہایت تضرع والحاح کے ساتھ یارب! یارب! کر کے دعائیں مانگتا ہے۔ لیکن اس کی دعائیں رد کر دی جائیں گی وہ ہرگز قبول نہ ہو سکیں گی۔ کیوں کہ وہ شخص حرام مال سے پرہیز نہیں کرتا۔ کھاتا ہے تو حرام، پہنتا ہے تو حرام اور اس کا جسم پلا بڑھا ہے تو حرام کمائی سے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کو راضی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اکلِ حلال کی فکر ہو۔ محض اپنی دعاؤں کے سہارے کوئی شخص خدا کی رحمتوں کا حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ جو شخص کسبِ معاش میں حلال و حرام کا خیال نہ رکھتا ہو وہ خدا کی جناب میں نافرمان اور مادیت کا پرستار قرار پائے گا۔ اللہ ہم سبھی کو اس برے انجام سے اپنی امان میں رکھے۔

〈۲〉 وَعَنْ اَبِیْ بَکْرٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: لاَ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ. (بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس جسم کی پرورش حرام مال سے ہوئی وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔"

تشریح: اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ حرام کمائی اور اکلِ حرام کی وجہ سے آدمی کی دعائیں رد ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی تضرع والحاح کی کیفیت کے ساتھ دعائیں کرے۔ اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کر کے خدا کو پکارتا رہے۔ اس حدیث سے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے معلوم ہوا کہ ایسا شخص جنت سے بھی دور رکھا جائے گا وہ اس میں ہرگز داخل نہ ہو سکے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ سزا بھگتنے کے بعد اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے۔

---

(۱) سورۃ المومنون:۵۱ (۲) سورۃ البقرہ:۱۷۲

مشتبہ چیزوں سے پرہیز

〈۱〉 عَنْ نعمانؓ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَ بَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُھَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ کَالرَّاعِیْ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ اَنْ یَّرْتَعَ فِیْہِ اَلَا وَ اِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی اَلَا وَ اِنَّ حِمَی اللّٰہِ مَحَارِمُہٗ اَلَا وَ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت نعمانؓ ابن بشیر سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”حلال عیاں ہے اور حرام بھی عیاں ہے۔ ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں۔ پس جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کرلیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو وہ حرام میں پڑ کے رہے گا۔ جیسے وہ چرواہا جو ممنوعہ چراگاہ کے کنارے چراتا ہے ہر وقت اس کا خطرہ رہتا ہے کہ اس کا جانور چراگاہ میں گھس کر چرنے لگ جائے۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے۔ خبردار! اللہ کی ممنوعہ چراگاہ اس کے محارم (حرام ٹھہرائی چیزیں) ہیں۔ یہ بھی سن لو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور جب اس میں بگاڑ آجاتا ہے تو سارے جسم میں بگاڑ آجاتا ہے۔ یادرکھو! وہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے۔“

تشریح: کیا چیزیں حلال ہیں اور کون سی چیزیں حرام ہیں؟ شریعت نے بہت واضح طور پر سب بیان کردیا ہے۔ مثلاً یہ سبھی جانتے ہیں کہ صدقہ خیرات کرنا شادی بیاہ کرنا وغیرہ جائز اور حلال ہے۔ اسی طرح سب جانتے ہیں کہ شراب پینی، چوری اور زنا کرنا اور جھوٹ بولنا وغیرہ حرام اور ناجائز ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی سامنے آسکتی ہیں کہ جن کا کوئی واضح حکم معلوم نہ ہو۔ جس کی وجہ سے یہ اشتباہ ہو کہ ان کو حلال سمجھیں یا ان کو حرام قرار دیں۔ ان کے بارے میں واضح فیصلہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ بلکہ بعض چیزیں تو علماء کے لیے بھی مشتبہ ہی رہتی ہیں۔ ایسی چیزوں کے بارے میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہونے کو

ممنوعہ چراگاہ کی بالکل مینڈ پر جانور کے چرانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہوشیار چرواہا وہی ہے جو اپنے جانور کو ممنوعہ علاقہ سے بہت دور رکھ کر چراتا ہے تاکہ جانور کے اچانک چراگاہ میں گھس جانے کا امکان باقی نہ رہے۔ مشتبہ چیز کی مثال مشتبہ آمدنی کی ہے جس کو معذوروں اور مجبوروں میں تقسیم کر دینا ہی اولیٰ ہے۔ خود اس مشتبہ آمدنی سے اجتناب و پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

حدیث کے آخری حصے میں دل کی صحت پر زور دیا گیا ہے۔ دل میں اگر کوئی خرابی ہے۔ وہ اگر کفر، تشکیک یا حرص و ہوس وغیرہ بیماریوں میں مبتلا ہے تو اس سے جسم ہی نہیں انسان کا پورا وجود اور اس کی پوری زندگی متاثر ہوگی۔ بگاڑ اور فساد صرف دل تک محدود نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے دل کی پاکیزگی اور اس کی صحت کا پورا خیال رکھے۔ وہ اسے خواہشات نفسانی میں مبتلا ہونے سے بچائے، مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے۔ انسان کے ایک ایک عضو سے اچھے اعمال کا صدور اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کا دل جملہ خرابیوں سے پاک ہو۔

علماء نے اس حدیث یعنی اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ الخ کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس طرح کی دو حدیثیں اور بھی ہیں جنھیں دین و شریعت میں بنیادی اہمیت حاصل ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (بخاری) ''اعمال کا سارا دارومدار (انسان کی) نیتوں پر ہے۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَا لَایَعْنِیْهِ (مالک، احمد، ابن ماجہ، ترمذی، البیہقی فی شعب الایمان) ''اور انسان کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جو بے فائدہ ہو۔''

قحبہ گری

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: نَهَی النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ کَسْبِ الْاِمَآءِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے لونڈیوں کی کمائی سے منع فرمایا ہے۔

تشریح: یعنی آمدنی کے لیے ان کو بدکاری پر مجبور نہ کیا جائے۔ جیسا کہ جاہلیت میں بعض لوگ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتے تھے اور یہ ان کی آمدنی کا ایک خاص ذریعہ تھا۔ اسلام نے اسے مطلق حرام قرار دے دیا۔ بخاری میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے مهر البغی یعنی زنا کی اجرت سے منع فرمایا ہے۔ حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے زنا کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کو ناپاک اور شر المکاسب یعنی بدترین آمدنی قرار دیا۔

لونڈی کا مالک اس پر ایسی رقم عائد نہیں کرسکتا اور نہ ایسی رقم وہ اس سے وصول کرسکتا ہے جس کے متعلق وہ یہ نہ جانتا ہو کہ یہ رقم وہ کہاں سے اور کیا کر کے لے آئی ہے۔ (ابو داؤد عن رافع بن خدیجؓ)۔ رافع بن رُفاعہؓ انصاری کی روایت میں واضح حکم موجود ہے کہ آپؐ نے لونڈی کی کمائی سے منع فرمایا۔ بہ جز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے۔ آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں جیسے روٹی پکانا، سوت کا تنایا اون اور روئی دھنکنا۔ (مسند احمد، ابوداؤد)

〈۲〉 وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّهٗ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَامُسَاعَاةَ فِی الْاِسْلَامِ.

(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام میں قحبہ گری کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

تشریح: یہ حدیث تو اس کا صاف اعلان ہے کہ اسلام میں فحش کاری کی گنجائش تلاش کرنی فضول ہے۔ اسلام انسانی معاشرہ کو ہر قسم کی بے حیائی اور فحش کاری سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اس لیے کہ وہ کسی ایسے کلچر اور ثقافت کو انسانیت کے لیے باعثِ ننگ تصور کرتا ہے جس میں بدکاری اور زنا روا ہو اور اس کی طرف راغب کرنے کے سارے ذرائع فراہم کیے جاتے ہوں۔ بدکاری اور قحبہ گری کے ذریعہ سے حاصل کی جانے والی آمدنی اسلام کے نزدیک بدترین آمدنی ہے۔

شُفْعَہ

〈۱〉 عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِیْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَّمْ تُقْسَمْ رَبْعَةٍ اَوْ حَائِطٍ لَا یَحِلُّ لَهٗ اَنْ یَّبِیْعَ حَتّٰی یُؤْذِنَ شَرِیْكَهٗ فَاِنْ شَآءَ اَخَذَ وَ اِنْ شَآءَ تَرَكَ فَاِذَا بَاعَ وَلَمْ یُؤْذِنْهُ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر مشترک زمین میں شفعہ ثابت ہے جو تقسیم نہ کی گئی ہو خواہ وہ گھر ہو یا باغ ہو۔ نیز ایسی زمین کے کسی شریک کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنا حصہ فروخت کرے جب تک کہ وہ اپنے شریک کو اس کی اطلاع نہ دیدے۔ اب وہ دوسرا شریک چاہے تو وہ حصہ خود خرید لے اور چاہے چھوڑ دے (کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت دیدے)۔ اگر کسی نے اپنے دوسرے شریک کو مطلع کیے بغیر اپنا حصہ فروخت

کر دیا تو وہ دوسرا شریک اس کا زیادہ حق دار ہے (کہ اس فروخت شدہ حصہ کو خرید لے)۔

تشریح: شفعہ مشتق ہے شفع سے جس کے معنی ہوتے ہیں ملانا، جفت کرنا۔ فقہ کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ ہم سایگی یا شرکت ہے جس کی وجہ سے فروخت ہونے والی زمین کو خریدنے کا حق لوگوں میں سب سے پہلے شریک کو جس کا اس زمین میں حصہ ہے یا پھر ہم سایہ کو پہنچتا ہے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک حق شفعہ صرف شریک جائداد کو حاصل ہوتا ہے۔ ہم سایہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حق شفعہ ہم سایہ کے لیے بھی اسی طرح ثابت ہے جس طرح یہ شریک جائداد کے لیے ثابت ہے۔ صحیح احادیث کی رو سے ہم سایہ کو حق شفعہ حاصل ہے اس لیے ہمسایہ کے حق شفعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حق شفعہ سب سے پہلے اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اس فروخت ہونے والی زمین یا مکان کی ملکیت میں شریک ہے یعنی اس کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا آدمی اسے نہیں خرید سکتا۔ یہی حق شفعہ ہے۔ البتہ اگر وہ اپنے اس حق سے دست کش ہو جاتا ہے تو اس کا حق دار وہ شخص ہے جو اس زمین یا جائداد کی ملکیت میں تو شریک نہیں ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کے حق میں اشتراک رکھتا ہے (مثلاً آمد و رفت کا حق، پانی کے نکاس کا حق، پانی لے جانے کی نالی کا حق)۔ اگر یہ بھی حق شفعہ سے دست کش ہو جاتا ہے تو اس صورت میں حق شفعہ ہم سایہ کو حاصل ہوگا۔ اگر ہم سایہ بھی اپنے حق کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کے بعد حق شفعہ کسی کو بھی نہیں پہنچے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق شفعہ غیر منقولہ جائداد جیسے زمین، مکان، باغ وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ منقولہ چیزوں میں حق شفعہ نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بات اور جان لینے کی ہے کہ حق شفعہ صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مسلمان اور ذمی کے درمیان بھی حق شفعہ جاری ہوتا ہے۔

کسی مشترک زمین یا مکان کا کوئی حصہ دار اگر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اس ارادے کی اطلاع اپنے دوسرے حصہ دار کو دیدے تا کہ اگر وہ خریدنے کی خواہش رکھتا ہو تو اس حصے کو خرید لے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَبِی رَافِعٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِهٖ (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو رافعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''پڑوسی قریب

ہونے کی وجہ سے (شفعہ کا) زیادہ حق رکھتا ہے۔''

تشریح: یعنی ہم سایہ جو نزدیک اور متصل ہوتا ہے شفعہ کا زیادہ حق دار ہے۔ یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حق شفعہ صرف شریک جائداد ہی کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ حق ہم سایہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری حقوق کا حد درجہ لحاظ رکھا ہے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ معاشرہ میں بگاڑ اور کسی قسم کی بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو۔

﴿۳﴾ وَ سَعِیدِ بْنِ حُرَیْثٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ مَنْ بَاعَ مِنْکُمْ دَاراً اَوْ عَقَاراً قَمِنٌ اَنْ لَّا یُبَارَکَ لَہٗ اِلَّا اَنْ یَّجْعَلَہٗ فِیْ مِثْلِہٖ. (ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت سعید بن حریثؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''تم میں سے جو کوئی مکان یا زمین بیچے تو یہی ہونا چاہیے کہ اس (کی قیمت) میں برکت نہ ہو۔ اِلاّ یہ کہ وہ اس (قیمت) کو اسی جیسی جائداد خریدنے میں صرف کرے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد، زمین اور باغ وغیرہ بلا ضرورت فروخت کرنا اور اس سے منقولہ اشیاء کی خریداری کرنی کوئی سمجھ داری کی بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد میں اتلاف اور نقصان کے اندیشے کم ہوتے ہیں۔ منقولہ اشیاء کے سلسلے میں تو ہر وقت خوف رہتا ہے کہ کہیں وہ چوری نہ ہو جائیں یا انھیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس لیے عقل مندی کی بات یہی ہے کہ بلا اشد ضرورت زمین اور مکان وغیرہ غیر منقولہ جائداد کو فروخت نہ کیا جائے۔ البتہ اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کسی دوسرے مناسب مکان یا زمین کی خریداری میں صرف کر دیا جائے تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ حُبَیْشٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ قَطَعَ سِدْرَۃً صَوَّبَ اللّٰہُ رَاسَہٗ فِی النَّارِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن حُبیشؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی بیری کا درخت کاٹے گا خدا اسے سر کے بل دوزخ میں ڈال دے گا۔''

تشریح: امام ابوداؤدؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ھٰذَا الْحَدِیْثُ مُخْتَصَرٌ یَعْنِیْ مَنْ قَطَعَ سِدْرَۃً فِیْ فُلَاۃٍ یَسْتَظِلُّ بِھَا ابْنُ السَّبِیْلِ وَالْبَھَائِمُ غَشْمًا وَ ظُلْمًا بِغَیْرِ

حَقٍّ يَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا صَوَّبَ اللّٰهُ رَاسَهٗ فِي النَّارِ'' یہ حدیث مختصر ہے۔ پورا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جو شخص جنگل میں بیری کے کسی ایسے درخت کو جس کے سایہ میں مسافر اور جانور پناہ حاصل کرتے ہیں بے سوچے سمجھے (Unjustly, thoughtlessly) ظلماً بغیر حق کے کاٹے گا اللہ اسے سر کے بل دوزخ میں ڈال دے گا۔'' بعض شارحین نے لکھا ہے کہ ظلم تو غشم (Treat unjustly, thoughtless manner) کی تاکید کے طور پر اور بغیر حق سے مراد شفعہ ہے۔

آدمی کو رہنے کے لیے صرف جگہ ہی نہیں چاہیے بلکہ اس کے لیے ماحول اور فضا کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ انسانی معاشرہ پاک اور صاف اور ستھرا ہو۔ کسی قسم کی اخلاقی اور فکر ونظر کی برائی اس میں نہ پائی جائے۔ ہر طرف امن وامان ہو۔ یہ اسلام میں مطلوب ہے۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ زمین میں رہنے والے انسانوں اور جانوروں کے آرام اور ان کی سہولت کا بھی حتی الامکان لحاظ رکھا جائے۔ انسانی بھلائی اور عافیت کو نظر انداز کر کے کوئی کام نہ کیا جائے۔ آج کے ترقی یافتہ دور کا انسان کس درجہ خود غرض اور انجام کی طرف سے بے اعتنائی برتنے والا ہے۔ وہ اس بات کو بھول گیا کہ بقا کے لیے فضا کی آلودگی ایک خطرہ ہے۔ آج شہروں میں لوگ تازی اور صاف ہواؤں سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ سڑکوں اور بازار کے ہنگامے کانوں کو بہرا کیے دیتے ہیں۔ دریاؤں اور سمندر تک کا پانی زہریلا ہوتا جارہا ہے۔ بازار کے پھل تک صحت بخش نہ رہے۔ پھلوں کو جلد سے جلد بازار میں لاکر روپیہ سمیٹنے کی حرص میں پاؤڈر وغیرہ چھڑک کر مصنوعی طور پر انھیں پکا لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک تو پھلوں میں وہ لذت اور شیرینی باقی نہیں رہتی جو اپنے وقت پر فطری طور پر ان کے پکنے سے حاصل ہوسکتی تھی۔ دوسرے پاؤڈر کے چھڑکاؤ سے پھلوں میں ایک طرح کی سمّیت آجاتی ہے جو صحت کے لیے مضر ہے۔

خدا کی ہدایت کو جس کی روح خدا ترسی اور انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ نظر انداز کرنے کا انجام یہ ہوا ہے کہ فضا کی آلودگی ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ ہماری حرکتوں سے اوزون میں شگاف پڑ گیا ہے جو بڑھتا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے خطرناک شعاعیں سیدھے زمین کو اپنا نشانہ بنارہی ہیں۔

عام انسانوں اور جانوروں کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بیری کے درخت کو کاٹ ڈالنا اتنا برا اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے کہ ایسی حرکت کا مرتکب سر کے بل دوزخ میں پھینک دیا

جائے گا۔ پورے کرۂ ارض کو تباہی کا سامان کرنے والے اور انسانوں کی صحت و عافیت کی پروا کیے بغیر فضا کو مختلف آلودگیوں اور زہر سے بھر دینے والے کتنے بڑے مجرم ہیں۔ یہ آپ خود سوچ سکتے ہیں۔

تسعیر (نرخ مقرر کرنا)

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ اَنَّ رَجُلاً جَآءَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعِّرْ فَقَالَ: بَلْ اَدْعُوْ ثُمَّ جَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعِّرْ فَقَالَ: بَلِ اللّٰهُ یَخْفِضُ وَ یَرْفَعُ وَ اِنِّیْ لَاَرْجُوْا اَنْ اَلْقَی اللّٰهَ وَلَیْسَ لِاَحَدٍ عِنْدِیْ مَظْلِمَةٌ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، آپ نرخ مقرر فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”نہیں بلکہ میں دعا کروں گا۔“ پھر ایک شخص آیا اور اس نے بھی گزارش کی کہ اے اللہ کے رسول، نرخ مقرر فرما دیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی نرخ گھٹاتا اور بڑھاتا ہے۔ اور میں اس کی اُمید رکھتا ہوں کہ میں اللہ سے اس حال میں ملوں کہ کسی کے سلسلہ میں کوئی مظلمہ میری گردن پر نہ ہو۔“

تشریح: نبی ﷺ نے اس پہلے شخص سے جس نے کہا تھا کہ نرخ مقرر کر دیں تاکہ غلہ وغیرہ ارزاں رہے، اور لوگ پریشانیوں سے دوچار نہ ہوں فرمایا کہ میں صرف دعا کروں گا۔

اصل چیزوں اور غلہ وغیرہ کے نرخ یا بھاؤ کے گرنے اور بڑھنے کا انحصار بالعموم حالات پر ہوتا ہے۔ صورتِ حال کب کیا پیش آتی ہے یہ اللہ ہی کے علم میں ہوتا ہے۔ حالات کو بدلنا بھی حقیقت میں اسی کے اختیار میں ہے۔ جبراً غیر فطری طریقے سے اشیاء کا نرخ مقرر کر دینا یہ اصولِ معیشت کے خلاف ہوگا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ دنیا سے اس حال میں رخصت ہوں کہ میں نے کسی کے بھی حق میں ظلم کی پالیسی اختیار کی ہو۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ غلہ وغیرہ کی گرانی کبھی پیداوار کی کمی وغیرہ قدرتی اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی کاروباری لوگ زیادہ نفع حاصل کرنے کی غرض سے مصنوعی قحط کی صورت پیدا کر کے قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ حاکمِ وقت کو اگر معلوم ہو کہ تاجروں کی طرف سے عوام پر زیادتی ہو رہی ہے اور وہ کہنے سننے کے باوجود اپنے رویہ کو نہیں بدلتے تو وہ قیمتیں مقرر کر سکتا ہے تاکہ عوام کو تاجروں کے استحصال سے بچایا جا سکے۔ حضرت عمرؓ نے ایک بار دیکھا کہ ایک صاحب خشک انگور (منقیٰ) ایسے نرخ پر فروخت کر رہے ہیں جو نامناسب حد تک گراں ہے

تو آپ نے فرمایا کہ یا تو قیمت مناسب حد پر لاؤ یا پھر اپنا مال ہمارے بازار سے اُٹھالو۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ النَّاسُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ غَلاَ السِّعْرُ فَسَعِّرْ لَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَ اِنِّىْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقَى اللّٰهَ وَلَيْسَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ يُطَالِبُنِىْ بِمَظْلِمَةٍ فِىْ دَمٍ وَّلاَ مَالٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، نرخ تیز ہوگیا ہے۔ آپؐ ہمارے لیے نرخ مقرر فرمادیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اللہ ہی ہے جو نرخ مقرر کرتا ہے، تنگی پیدا کرتا ہے، فراخ کرتا ہے، رزق عطا فرماتا ہے۔ میں اللہ سے اس حال میں ملنے کی امید رکھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی کسی مظلمہ کے سلسلہ میں میرے خلاف دعوے دار نہ ہو۔ نہ خون کے سلسلہ میں اور نہ مال کے سلسلہ میں۔“

تشریح: یعنی میں جان یا مال کسی سلسلے میں بھی ظلم کا روادار نہیں ہوسکتا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ خدائے بزرگ و برتر سے اس حالت میں ملوں کہ میری گردن پر کوئی مظلمہ ہو اور کوئی میرے خلاف خدا کی عدالت میں مدعی بن کر کھڑا ہو۔

چراگاہ

﴿۱﴾ عَنِ الصَّعْبِ بْنِ جَثَّامَةَؓ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَاحِمَى اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت صعب بن جثامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”چراگاہ صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہوسکتا ہے۔“

تشریح: حمی یا چراگاہ سے مراد وہ قطعۂ ارض ہے جس کو مخصوص جانوروں کے چرنے کے لیے متعین کردیا جائے۔ اور عام لوگوں کو اس میں اپنے جانوروں کو چرانے سے روکا جائے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں پیش نظر رہیں۔ اللہ، رسول اور خلیفہ ہی کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی جگہ کو چراگاہ کے لیے مخصوص کردے۔ اس سلسلہ میں مصلحت عامہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ جسے اللہ اور رسول کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہو وہ مصالح عامہ میں صرف ہوتا ہے۔ جیسے غنائم کا پانچواں حصہ، فے اور رکاز (خزانہ) کا پانچواں حصہ وغیرہ۔ امام یا خلیفہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے حمی نہیں بنا سکتا۔

حضور ﷺ نے نقیع کا علاقہ اونٹوں اور جہاد کے گھوڑوں کے لیے مخصوص فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ایک قطعہ ارض کو جب اس مقصد کے لیے مخصوص کیا تو فرمایا تھا: وَاللّٰهِ وَاللّٰهِ لَوْلاَ مَا اَحْمِلُ عَلَيْهِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا حَمَيْتُ مِنَ الْاَرْضِ شِبْرًا فِيْ شِبْرٍ (بخاری) ''خدا کی قسم، اگر میرے پاس ایسے جانور نہ ہوں جن پر میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو سوار کرتا ہوں تو میں زمین کا ایک بالشت قطعہ بھی حمی (چراگاہ) نہ بناتا۔''

ضمان

(۱) عَنْ سَلَمَةَؓ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اُتِيَ بِجَنَازَةٍ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَقَالَ: هَلْ عَلَيْهِ مِنْ دَيْنٍ؟ قَالُوْا لاَ فَصَلّٰى عَلَيْهِ ثُمَّ اُتِيَ بِجَنَازَةٍ اُخْرٰى فَقَالَ: هَلْ عَلَيْهِ مِنْ دَيْنٍ؟ قَالُوْا نَعَمْ. قَالُوْا: صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ. قَالَ اَبُوْ قَتَادَةَ عَلَيَّ دَيْنُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، فَصَلّٰى عَلَيْهِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک جنازہ لایا گیا تا کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا اس کے ذمہ کوئی قرض ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں۔ تو آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ایک دوسرا جنازہ لایا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا'' کیا اس کے ذمہ کوئی قرض ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا: تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ حضرت ابو قتادہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، اس کا قرض میں اپنے ذمے لیتا ہوں تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔

تشریح: صحیح بخاری ہی میں ہے کہ ایک مقروض شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ترکہ میں بھی ایسا کچھ نہ تھا کہ اس سے اس کا قرض ادا کیا جا سکتا۔ نبی ﷺ اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے رک گئے۔ اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ضامن ہو جائے اسی صورت میں میں اس کی نماز جنازہ پڑھوں گا (اِلاَّ اِنْ قَامَ اَحَدُكُمْ فَضَمِنَهٗ)۔

ضمان یہ ہے کہ کسی شخص پر ثابت شدہ حق کے ادا کرنے کی ذمہ داری کوئی دوسرا شخص لے لے۔ ضمان کا معاملہ ثابت شدہ حق کے سلسلہ میں ہی نہیں بلکہ آئندہ ثابت ہونے والے حق (جیسے انعام دینے کی ذمہ داری) کے سلسلے میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

صلح

〈۱〉 عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ اَلْمُزَنِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا. (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ مزنی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے۔ سوائے اس صلح کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دینے کی موجب ہو۔ اور مسلمانوں کے لیے اپنی شرطوں کی پابندی کرنی لازم ہے سوائے اس شرط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دے۔''

تشریح: صلح کی کئی صورتیں ممکن ہیں۔ کسی شخص نے کسی پر اپنے کسی حق کا دعویٰ کیا۔ اور اس نے اس کا اقرار کر لیا۔ اب مدعی اگر اپنے دعویٰ میں سے کچھ وضع کر دے یا ہبہ کر دے یا اس کے علاوہ کوئی اور مناسب انداز اختیار تو جائز ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی کسی پر اپنے حق کا دعویٰ کرے لیکن مدعیٰ علیہ اسے تسلیم نہ کرے پھر بھی خصومت اور حلف سے بچنے کے لیے وہ مدعی کو کچھ دیدے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس پر دعویٰ کیا گیا ہو وہ نہ تو اقرار کرے اور نہ انکار کرے مگر مدعی کو کچھ دے کر دعویٰ ساقط کرا کر خصومت کو ختم کر دے۔ صلح کی یہ سبھی صورتیں درست ہیں۔

صلح میں جو چیز دی جاتی ہے اس کے احکام بیع کی طرح ہیں۔ اس میں اگر عیب ہے تو اسے رد کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر غیر منقسم حصہ ہے تو اس کے دوسرے شرکاء شفعہ کر سکیں گے۔

یہاں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ ایک فریق اگر جھوٹا ہے تو صلح کے طور پر وہ جو کچھ لے گا وہ اس کے لیے حلال نہیں ہو جائے گا۔ وہ اس کے لیے حرام ہی رہے گا۔

حوالہ

〈۱〉 عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَاِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مال دار شخص کا قرض

ادا کرنے میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔ اور جب تم میں سے کسی (کے قرض) کو مال دار کے حوالہ کیا جائے تو قبول کر لینا چاہیے۔''

تشریح: ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ وَ اِذَا اُحِلَّتَ عَلٰی مَلِیْئٍ فَاتَّبِعْهُ ''مال دار کا قرض کے ادا کرنے میں تاخیر کرنا ظلم ہے۔ اور جب تم مال دار کے حوالہ کیے جاؤ تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تحویل قرض جائز ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ذمہ کسی کا قرض ہے اور اس قرض دار کا ایک اور شخص مقروض ہے۔ اب اگر وہ اپنے قرض خواہ سے کہتا ہے کہ یہ قرض تم میرے قرض دار سے وصول کر لو۔ اور وہ اسے قبول کر لے تو مقروض بری الذمہ ہو جائے گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ قرض جس کے حوالہ کیا جا رہا ہے وہ مال دار ہو یعنی قرض کے ادا کرنے کی قدرت اسے حاصل ہو۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا: اِذَا اُتْبِعَ اَحَدُکُمْ عَلٰی مَلِیْئٍ فَلْیَتْبَعْ (اصحاب السنن) ''جب تم میں سے کسی (کے قرض) کو مالدار (غنی) کے حوالے کیا جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔'' عقد حوالہ درحقیقت لوگوں میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے روا رکھا گیا ہے۔

جھاڑ پھونک پر اُجرت

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ نَفَرًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ مَرُّوْا بِمَاءٍ فِیْهِمْ لَدِیْغٌ اَوْ سَلِیْمٌ فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِ الْمَاءِ فَقَالَ هَلْ فِیْکُمْ مِنْ رَاقٍ اِنَّ فِی الْمَاءِ رَجُلاً لَدِیْغًا اَوْ سَلِیْمًا فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ فَقَرَاَ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ عَلٰی شَاءٍ فَبَرَءَ فَجَاءَ بِالشَّاءِ اِلٰی اَصْحَابِهٖ فَکَرِهُوْا ذٰلِکَ وَ قَالُوْا اَخَذْتَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا کِتَابُ اللّٰهِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت کا ایک بستی پر گزر ہوا جس میں کسی کو سانپ نے کاٹ لیا تھا یا بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ اس بستی کا ایک شخص ملا اور اس نے کہا کہ کیا تم میں کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ ہماری بستی میں ایک آدمی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے یا کہا کہ بچھو نے ڈنک مارا ہے۔ صحابہ کی جماعت میں سے ایک صاحب گئے اور بستی میں پہنچ کر کچھ بکریاں بہ طور معاوضہ مقرر کر کے اس کاٹے ہوئے آدمی پر سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کیا۔ وہ

بالکل اچھا ہوگیا۔ یہ صاحب مقررہ بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آگئے تو انھوں نے اسے برا سمجھا اور کہا کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھنے کا معاوضہ لے لیا۔ رسول اللہ ﷺ (کو جب اطلاع ہوئی تو آپؐ) نے فرمایا: ''کتاب اللہ اس کی زیادہ مستحق ہے کہ اس پر معاوضہ لو۔''

تشریح: اصل میں لفظ لدیغ او سلیم استعمال ہوا ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی سانپ کا ڈسا ہوا۔ لیکن اکثر و بیشتر لفظ لدیغ اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کو بچھو نے ڈنک مارا ہو اور سلیم کا اطلاق اس کے لیے ہوتا ہے جسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی میں یہ تاثیر بھی پائی جاتی ہے کہ اس سے بیمار کو شفاء حاصل ہو اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جھاڑ پھونک پر اُجرت لے سکتے ہیں۔ مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک سفر میں ایک پاگل شخص پر دم کرایا گیا۔ ایک صحابی نے سورۃ الفاتحہ پڑھ کر صبح و شام تین روز دم کیا اور وہ پاگل اچھا ہوگیا۔ انھوں نے اس کا معاوضہ لیا اور حضور ﷺ نے اسے جائز قرار دیا۔ لیکن بغیر معاوضہ بندگانِ خدا کی خدمت کی جائے تو یہ افضل ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ الشِّفَاءِ بِنْتِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَتْ: دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَ اَنَا عِنْدَ حَفْصَةَ فَقَالَ: اَلَا تَعَلِّمِیْنَ هٰذِهٖ رُقْيَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِهَا الْكِتَابَةَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت شفا بنت عبداللہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں حضرت حفصہؓ کے پاس تھی کہ رسول اللہؐ اندر تشریف لائے اور (مجھ سے) فرمایا: ''تم انھیں (حفصہؓ کو) نملہ کا منتر نہیں سکھا دیتیں جس طرح تم نے انھیں لکھنا سکھایا ہے؟''

تشریح: اصل نام لیلیٰ تھا۔ لقب شفا تھا۔ اپنے اسی لقب سے مشہور ہوئیں۔

نملہ ان پھنسیوں کو کہتے ہیں جو پسلیوں پر نکل آتی ہیں اور بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ حضرت شفاء مکہ میں اس مرض کو دفع کرنے کی غرض سے کچھ پڑھ کر جھاڑ پھونک کرتی تھیں۔ انھوں نے ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کو وہ منتر جسے پڑھ کر وہ پھونکتی تھیں سنایا تھا۔ حضورؐ نے اسے سن کر اس کے ذریعے سے جھاڑ پھونک کی اجازت انھیں دیدی تھی۔ اس لیے کہ اس میں کوئی مشرکانہ بات نہ تھی۔

حقوقِ ملکیت کا احترام

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔“

تشریح: یعنی جو اپنے مال و اسباب کی حفاظت میں مارا گیا تو اسے شہید کا درجہ حاصل ہوگا۔ یہی حکم اس شخص کے لیے بھی ہے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ وَجَدَ عَیْنَ مَالِہٖ عِنْدَ رَجُلٍ فَھُوَ اَحَقُّ بِہٖ وَ یَتْبَعُ الْبَیِّعُ مَنْ بَاعَہٗ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اپنا مال بجنسہٖ کسی کے پاس پایا تو اس مال کا وہی زیادہ حق دار ہے۔ اور جس نے اس مال کو خریدا ہے وہ بائع کو پکڑے اور اس پر اپنے مطالبہ کا دعویٰ کرے۔“

تشریح: یعنی جس شخص سے اس نے مال خریدا ہو اس کے خلاف دعویٰ کرے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَأَیْتَ اِنْ جَآءَ رَجُلٌ یُرِیْدُ اَخْذَ مَالِیْ قَالَ: فَلَا تُعْطِہٖ مَالَکَ قَالَ اَرَأَیْتَ اِنْ قَاتَلَنِیْ قَالَ قَاتِلْہُ قَالَ اَرَأَیْتَ اِنْ قَتَلَنِیْ قَالَ: فَاَنْتَ شَھِیْدٌ. قَالَ اَرَأَیْتَ اِنْ قَتَلْتُہٗ. قَالَ: ھُوَ فِی النَّارِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ، مجھے بتائیں کہ اگر کوئی میرا مال چھیننا چاہے (تو کیا میں اُسے اپنا مال دے دوں) فرمایا: ”نہیں، تم اسے اپنا مال نہ دو۔“ اس نے عرض کیا کہ یہ بتایئے کہ اگر وہ مجھ سے لڑے؟ آپؐ نے فرمایا: ”تم بھی اس سے لڑو۔“ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل کردے؟ فرمایا: ”تم شہادت کا درجہ پاؤ گے۔“ اس نے کہا کہ اچھا یہ بتایئے کہ اگر میں نے اسے قتل کردیا؟ فرمایا: وہ دوزخ میں جائے گا۔“

تشریح: اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اپنے مال اور اپنی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت

کرنی چاہیے اور جو شخص اس کے مال کو لوٹنا چاہتا ہے اس کا پوری مردانگی کے ساتھ مقابلہ کرے۔ اگر وہ اس مقابلہ میں مارا جاتا ہے تو درجۂ شہادت حاصل کرے گا۔ اور اگر وہ مفسد مارا جاتا ہے جو اسے تباہ کرنے پر آمادہ ہے تو وہ واصل بہ جہنم ہوگا۔

لقطہ

﴿۱﴾ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اٰوىٰ ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَالَمْ يَعْرِفْهَا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص (کسی کی) گم شدہ چیز کو اٹھا کر گھر میں رکھ لے تو وہ خود بھٹک گیا جب تک کہ وہ اس کی تشہیر نہ کرے۔''

تشریح: یہ ایک اہم حدیث ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دنیا میں انسان کی پوزیشن حد درجہ نازک ہے۔ انسان جب بھی کوئی عمل کرتا یا کسی معاملہ میں کوئی رویہ اختیار کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنی ذات اور اپنی شخصیت کو داؤں پر لگا رہا ہوتا ہے۔ اب اگر اس کا معاملہ اور اس کا رویہ مبنی بر عدل ہوگا تو وہ اپنے آپ کو تباہی سے بچالے گا۔ بہ صورت دیگر وہ اپنے آپ کو گنوا بیٹھے گا۔ اور اس سے بڑھ کر کسی نقصان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مثلاً کسی کی گم شدہ چیز یا کسی کے بھٹکے ہوئے جانور کو وہ اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اور اسے اس کے اصل مالک تک پہچانے کی اسے کوئی فکر نہیں ہوتی تو کسی کی تو ایک چیز یا جانور ہی گم ہوا تھا یہاں یہ خود اپنے آپ کو ضائع کر بیٹھا۔ ابوداؤد میں حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ: لَا يَاوِي الضَّالَّةَ اِلاَّ ضَالٌّ ''بھٹکے ہوئے جانور وغیرہ کو وہی اپنے گھر میں رکھ لیتا ہے جو خود بھٹکا ہوا ہو۔''

> What shall it profit a man if he shall gain the whole world and lose his soul.
>
> ''اس سے کسی شخص کو کیا نفع پہنچ سکتا ہے، اگر اس نے ساری دنیا حاصل کر لی مگر اپنی روح کو گنوا بیٹھا۔''

﴿۲﴾ وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ وَجَدَ لُقْطَةً فَلْيُشْهِدْ ذَا عَدْلٍ اَوْ ذَوَىْ عَدْلٍ وَلاَ يَكْتُمْ وَلاَ يُغَيِّبْ فَاِنْ وَجَدَ صَاحِبَهَا فَلْيَرُدَّهَا عَلَيْهِ وَ اِلاَّ فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ. (احمد، ابوداؤد، دارمی)

ترجمہ: حضرت عیاض بن حمارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کوئی گری ہوئی چیز پائے تو چاہیے کہ وہ کسی عادل شخص کو یا (فرمایا کہ) دو عادل شخصوں کو اس پر گواہ بنالے۔ نہ تو اس (لقطہ) کو چھپائے اور نہ اسے (کسی دوسری جگہ بھیج کر) غائب کرے۔ پھر اس کا مالک آجائے تو اس کے حوالے کردے اور اگر اس کا مالک نہ آئے تو پھر وہ اللہ کا مال ہے، جس کو چاہے اسے دلائے۔''(۱)

تشریح: وہ گواہ بنالے کہ میں یہ چیز حفاظت کی غرض سے یا اس کے مالک تک پہنچانے کی غرض سے اٹھا رہا ہوں۔ اب یہ لقطہ اس کے پاس بہ طور امانت رہے گا۔

اس چیز پر قبضہ کرنے کی غرض سے نہ تو اس کو چھپائے اور نہ دوسری جگہ کہیں دور بھیج کر غائب کرے۔ وہ اس کی تشہیر اور اعلان اتنے عرصے تک کرتا رہے جب تک کہ یہ یقین نہ ہوجائے کہ اب اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں آئے گا۔ اگر مدتِ تشہیر کے دوران اس کا مالک آجاتا ہے تو اس کو اس کی چیز دے دی جائے گی، اور اگر وہ نہیں آتا تو بہتر ہے کہ اس چیز کو خیرات کردیں۔ اس کے بعد اگر مالک آجاتا ہے تو وہ تاوان لے سکتا ہے یا اس شخص سے اپنی چیز واپس لے سکتا ہے جس کو وہ خیرات کے طور پر دی گئی ہو۔ اس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

---

(۱) وہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔

مصارف یا تقسیمِ دولت

اِنفاق کی اہمیت

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ اللّٰهُ اَنْفِقْ اُنْفِقْ عَلَیْکَ.
(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ فرماتا ہے کہ تم خرچ کرو، میں تم پر خرچ کروں گا۔''

تشریح: مال اس لیے ہوتا ہے کہ استعمال میں آئے۔ دولت بہ ذاتِ خود مقصود نہیں ہوتی۔ اس حدیث میں لوگوں کو انفاق کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ مال خرچ کرنے میں اس کا خوف نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نادار ہو جائیں گے۔ مال خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے اور اس کی عطا کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ ہم اگر فیاضی سے کام لیں گے تو خدا اپنے جود و کرم سے ہمیں پھر نوازے گا۔

〈۲〉 وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ مَا تَرَکَ غِنًی وَالْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر صدقہ وہ ہے کہ صدقہ دینے والے کی مال داری قائم رہے اور اوپر والا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اور ابتدا اپنے اہل و عیال سے کرو۔''

تشریح: اوپر والے ہاتھ سے مراد خرچ کرنے والا اور دینے والا ہاتھ ہے۔

اس حدیث میں بھی انفاق کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا نے اس کا

موقع دیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے لوگوں پر خرچ کر سکے تو یہ اس کے لیے شرف اور فضیلت کی بات ہے۔ البتہ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ خرچ کی ابتدا ان لوگوں سے کرنی چاہیے جن کی کفالت کی ذمے داری اس پر آتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں پر تو اپنا مال خرچ کرے لیکن اہل وعیال کو نظر انداز کر دے۔ اہل وعیال کا حق بہ ہر حال مقدم ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اَلسَّاعِيْ عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ الْقَائِمِ اللَّيْلِ الصَّائِمِ النَّهَارِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”بیواؤں اور مسکین کے لیے محنت مزدوری کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا رات میں عبادت کرنے والے، دن میں روزہ رکھنے والے کی طرح ہے۔“

تشریح: نادار اور محتاج لوگوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لیے اگر کوئی کوشاں ہوتا ہے اور اس کے لیے محنت ومشقت برداشت کرتا ہے تو اسلام کی نگاہ میں یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ، اور روزے اور قیام لیل (تہجد) کی طرح بڑی نیکی اور بڑی عبادت جیسا عمل ہے۔ اسے کسی نیکی سے کم تر درجے کی نیکی نہیں سمجھنا چاہیے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اِيَّاكُمْ وَالشُّحَّ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالشُّحِّ اَمَرَهُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا وَ اَمَرَهُمْ بِالْقَطِيْعَةِ فَقَطَعُوْا وَ اَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطاب فرمایا اور ارشاد فرمایا: ”حرص وبخل سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ اس حرص وبخل کی وجہ سے تباہ ہوئے۔ حرص نے انھیں بخل پر آمادہ کیا اور وہ بخیل ہو گئے۔ اس نے انھیں ناتہ رشتہ توڑنے پر آمادہ کیا اور انھوں نے ناتے رشتے کو منقطع کیا، اس نے انھیں فسق وفجور پر اُبھارا اور وہ فسق وفجور میں مبتلا ہو گئے۔“

تشریح: تنگ دلی اور حرص وہوس کے مرض میں مبتلا شخص کبھی بھی ان ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں۔ اسلام کے طریق حیات پر چلنا اسی صورت میں ممکن

ہوتا ہے جب کہ آدمی کو حرص اور بخل جیسا اخلاقی مرض لاحق نہ ہو۔ اسلام کا شعار فیاضی، ایثار اور سخاوت ہے۔ اگر آدمی کے اندر تنگ دلی آئی تو وہ بخیل ہو کر رہے گا۔ پھر اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایسا شخص ناتے رشتے کے حقوق کی طرف سے بے پروا ہو گیا۔ اسے کبھی بھی ناتے داروں کے حقوق یاد نہیں آ سکتے۔ بس اسے فکر ہو گی تو صرف اس کی کہ اس کی دولت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ خواہ اس کے لیے حدودِ الٰہی سے تجاوز ہی کیوں کرنا پڑے۔ دولت ہی اس کے لیے سب کچھ ہو گی۔ اسے زندگی کی اعلیٰ قدروں سے کوئی دلچسپی نہ ہو گا۔ اسے نہ اپنے فرائض منصبی یاد رہ سکتے ہیں اور نہ عام انسانوں کی رہ نمائی اور ان کی بھلائی کے کاموں کے لیے اس کے پاس کوئی وقت ہو گا۔ پھر ایسے شخص کے تباہ و برباد ہونے میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔ افراد سے بڑھ کر اگر کوئی قوم اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو اسے بھی تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ناجائز اخراجات

(۱) عَنْ اُمِّ سَلَمَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ شَرِبَ فِیْ اِنَآءٍ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ فَاِنَّمَا یُجَرْجِرُ فِیْ بَطْنِهٖ نَارًا مِّنْ جَهَنَّمَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جس نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا اُس نے اپنے پیٹ میں غٹ غٹ کر کے جہنم کی آگ بھری۔“

تشریح: سونے یا چاندی کا زیور عورت استعمال کر سکتی ہے۔ لیکن سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا پینا عورت ہو یا مرد دونوں کے لیے حرام ہے۔ اسلام اسے پسند نہیں کرتا کہ خدا نے اگر کسی کو دولت دی ہے تو وہ اسے تعیّشات میں خرچ کرنے لگ جائے۔ آدمی کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کی دولت کا زیادہ سے زیادہ حصہ رفاہِ عام اور بھلائی کے کاموں میں صرف ہو۔ اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے معاشیات کا رشتہ دین و اخلاق سے قائم کیا ہے۔ اس نے معیشت کو اخلاقی اور دینی تقاضوں سے آزاد نہیں رکھا ہے۔ دولت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دین اور انسانی اخلاق کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ وہ دولت مند کتنا خوش قسمت ہے کہ جس کی دولت کا بڑا حصہ بندگانِ خدا کی خدمت اور دینِ حق کی سربلندی کے کاموں میں صرف ہو رہا ہو۔

﴿۲﴾ وَعَنْ حُذَیْفَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ: لَا تَلْبَسُوا الْحَرِیْرَ وَلَا الدِّیْبَاجَ وَلَا تَشْرَبُوْا فِیْ اٰنِیَةِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَا تَاْکُلُوْا فِیْ صِحَافِھَا فَاِنَّھَا لَھُمْ فِی الدُّنْیَا وَلَنَا فِی الْاٰخِرَةِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”ریشم اور دیباج نہ پہنو اور نہ سونا چاندی کے برتن میں پانی پیو اور نہ ان کے پلیٹوں میں کھانا کھاؤ۔ اس لیے کہ یہ دنیا میں اہل کفر کے لیے ہے اور ہمارے لیے آخرت میں ہے۔“

تشریح: اہل کفر کے لیے صرف دنیا ہے۔ ان کے پیش نظر عام طور پر دنیا ہی ہوتی ہے۔ آخرت کی دائمی حیات کا وہ خواب بھی نہیں دیکھتے۔ مومنین کا حال ان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مومنین کے پیش نظر اصلاً دنیا نہیں آخرت کی زندگی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اسی کے لیے فکر مند ہوتے ہیں کہ انھیں آخرت میں سرخ روئی اور کامیابی حاصل ہو، وہ اپنی بہت ساری آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آخرت کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ چیز ان کو کتنی ہی چیزوں سے مستغنی کر دیتی ہے۔ ان کی قوت اور توانائی ان چیزوں میں صرف ہو کر نہیں رہ جاتی جسے دنیا کہتے ہیں۔ دنیا کتنی ہی حسین اور دلکش ہو لیکن ہے وہ عارضی اور ختم ہونے والی۔ یہ ایک ایسا نقص اس کے ساتھ لگا ہوا ہے جس کی تلافی کسی چیز سے ممکن نہیں ہے۔ نہ ریشمی ملبوسات اور سونے چاندی کے ظروف سے اس نقص کی تلافی ہو سکتی ہے اور نہ دیگر ساز و سامان اس نقص کو دور کر سکتے ہیں۔

﴿۳﴾ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ لَہٗ فِرَاشٌ لِلرَّجُلِ وَفِرَاشٌ لِاِمْرَأَتِہٖ وَالثَّالِثُ لِلضَّیْفِ وَالرَّابِعُ لِلشَّیْطَانِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ”ایک بستر آدمی کے لیے چاہیے اور ایک بستر اس کی بیوی کے لیے اور ایک بستر مہمان کے لیے چاہیے اور چوتھا شیطان کا ہوگا۔“

تشریح: اگر کسی کے یہاں ایک سے زیادہ مہمان کی آمد رہتی ہو تو وہ اس کا لحاظ کرتے ہوئے ایک سے زیادہ بستر مہمانوں کے لیے رکھ سکتا ہے۔ حدیث کا اصل مقصد یہ ہے کہ بے ضرورت ساز و سامان جمع کرنا اور ان پر روپے خرچ کرنا اسلام کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس سے شیطان کے

مقاصد ہی پورے ہوتے ہیں۔ شیطان انسان کو فضول خرچی میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اسے زندگی کے اصل مقصد سے غافل کر سکے اور اسے دنیا ہی کی اُدھیڑ بن میں مصروف رکھے۔ بے ضرورت ساز و سامان اگر کوئی محض نمائش کے لیے جمع کرتا ہے تاکہ وہ اس طرح لوگوں پر اپنی فوقیت اور برتری کا اظہار کرے تو اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

مال ضائع کرنا

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰهَ یَرْضٰی لَکُمْ ثَلاَثًا وَ یَکْرَهُ لَکُمْ ثَلاَثًا، فَیَرْضٰی لَکُمْ اَنْ تَعْبُدُوْهُ وَلاَ تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّ اَنْ تَعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلاَ تَفَرَّقُوْا وَیَکْرَهُ لَکُمْ: قِیْلَ وَ قَالَ، وَ کَثْرَةَ السُّوَالِ وَ اِضَاعَةَ الْمَالِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند فرماتا اور تین چیزوں کو تمہارے لیے ناپسند کرتا ہے۔ وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے کہ تم اس کی بندگی اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور تم سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور تفرقے میں نہ پڑو اور وہ تمہارے لیے جن چیزوں کو ناپسند کرتا ہے وہ ہیں: قیل وقال، سوال کی کثرت اور مال کا ضائع کرنا۔“

تشریح: یہ ایک نہایت جامع حدیث ہے۔ اس میں ہر قسم کے فتنوں سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ خواہ ان کا تعلق افکار و نظریات اور ایمانیات سے ہو یا ان کا تعلق آدمی کے طرزِ عمل سے ہو۔

تحزب اور تفرقہ اسلام میں سنگین ترین جرم ہے۔ قرآن میں اس سے روکا گیا ہے کہ مسلمان گروہ گروہ ہو کر رہ جائیں اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جائے۔ چناں چہ ارشاد ہوا ہے: اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلاَ تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (الشوریٰ:۱۳) ”دین کو قائم رکھو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔“ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلاَ تَفَرَّقُوْا (آل عمران:۱۰۳) ”اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔“ وَلاَ تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْبَیِّنٰتُ ط وَ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (آل عمران:۱۰۵) ”ان لوگوں کی طرح

نہ ہوجانا جوتفرقہ میں پڑ گئے اور اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں وہ اختلاف میں پڑ گئے، یہ وہی ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔'' اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَھُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡھُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ (الانعام:۱۵۹) ''جن لوگوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود گروہوں میں بٹ گئے، تمہارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔''

یہاں ایک بات ملحوظ رہے کہ اختلاف کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کا اختلاف تو یہ ہے کہ بنیادی اور اصلی امور میں سب متفق ہوں مگر کچھ جزوی امور میں ان کے درمیان اختلاف پایا جائے۔ اس قسم کا اختلاف فطری اور زندگی کی علامت ہے۔ اس کی وجہ سے امت کے اندر تفرقہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کے اختلاف کے باوجود لوگ متحد رہ سکتے ہیں۔ کوئی کسی کو خارج از دین نہیں سمجھ سکتا۔ دوسری قسم کا اختلاف یہ ہے کہ دین کے جزوی اور فروعی اختلاف کو لوگ دین کا بنیادی مسئلہ قرار دے لیں اور اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو بے دین اور گمراہ سمجھنے لگ جائیں۔ اگر جزوی امور میں پائے جانے والے اختلاف کو دین کا اختلاف قرار دے لیا جائے تو اسے ایک المناک حادثہ ہی کہا جائے گا۔ اس کو دین کے مزاج اور اس کی اصل فطرت سے بے خبری کا افسوسناک انجام ہی کہا جاسکتا ہے۔ جزئیات اور فروع میں اختلاف کی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔ اور یہ دین کے حق اور فطری دین ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو ختم کر دینے کے بعد علم وفکر کے ارتقا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور یہ ملت کے لیے نہایت خسارہ کی بات ہے۔

قرآن اور سنت نے اصل اور بنیادی امور میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے۔ اور یہ اسلام کے دینِ حق ہونے کا بین ثبوت ہے۔ فروعی مسائل میں پایا جانے والا اختلاف گمراہی اور ضلالت ہرگز نہیں ہے۔ ضلالت اور سنگین جرم درحقیقت تفرق فی الدین ہے۔ دین کے اصل اور بنیادی امور میں اختلاف پیدا کرنا اور ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا سنگین جرم ہے۔ اسی قسم کے جرم کی طرف اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَھُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡھُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ (الانعام:۱۵۹) ''جن لوگوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور (اس کے نتیجے میں) خود گروہوں میں بٹ گئے، تمہارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔''

کسی مسئلہ میں بے ضرورت حجت بازی اور کسی چیز میں خواہ مخواہ کے لیے معائب تلاش کرنے کی خو اسلام کو پسند نہیں ہے۔ یہ درحقیقت ایک ذہنی بیماری اور نفسیاتی مرض ہے۔ جتنی جلد

ممکن ہو آدمی کو اس سے نجات حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ کثرتِ سوال سے بھی انسان کی اپنی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو خود پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ سوال کی کثرت چاہے دینی مسائل کے سلسلہ میں ہو یا مالی تعاون کے حصول کے لیے ہو دونوں ہی صورتوں میں یہ ناپسندیدہ ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی حوصلہ افزائی سے معاشرہ میں ایسے افراد کی تعداد بڑھے گی جو کسی بھی معاشرہ کے لیے ہمیشہ دردِ سر بنتے رہے ہیں۔

مال ضائع کرنا مال کی ناقدری ہی نہیں ہے بلکہ یہ جذبۂ شکرگزاری کے بھی خلاف ہے۔ خدا کے دیے ہوئے مال کو ضائع کرنا بے پروائی اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اگر کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہے تو وہ مال کو ضائع کرنے کے بجائے اس سے ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرسکتا ہے۔ یہ مال کا بہترین استعمال ہے۔ کاش لوگوں کو اس کا احساس ہو سکے۔

مال کی طرح وقت بھی ایک بہت قیمتی سرمایہ ہے جس کی عام طور پر ناقدری کی جاتی ہے۔ آدمی کے لیے تضیع اوقات کو بھی کسی جرم سے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَفٰى بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ يُّضَيِّعَ مَنْ يَّقُوْتُ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جن کی روزی اس کے ذمہ ہے وہ ان کی روزی کو ضائع کرے۔''

تشریح: یعنی کسی شخص کا شمار گنہگاروں میں ہو اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قتل اور ڈاکہ زنی اور فساد فی الارض جیسے جرائم ہی کا مرتکب ہو۔ آدمی کے لیے یہ گناہ بھی کوئی ہلکا اور معمولی گناہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کی کفالت اس کے ذمہ ہو وہ ان کی فکر سے آزاد ہو کر مال کہیں اور خرچ کرنے لگے اور لوگوں کو ان کے اپنے حق سے محروم رکھے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ اَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهٖ حَتّٰى يَحْضُرُهٗ عِنْدَ طَعَامِهٖ فَاِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَاكَانَ بِهَا مِنْ اَذًى ثُمَّ لِيَاكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَاِذَا فَرَغَ

فَلْيَلْعَقْ اَصَابِعَهٗ فَاِنَّهٗ لَايَدْرِیْ فِیْ اَیِّ طَعَامِهٖ تَكُوْنُ الْبَرَكَةُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''شیطان تم میں سے ہر شخص کے پاس اس کے ہر ایک کام کے وقت موجود ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے کھانے کے وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ جب تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو چاہیے کہ (اُسے اٹھالے اور گرد وغیرہ) جو چیز اسے لگ گئی ہو اس کو صاف کر کے کھالے، اُسے شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ اور جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو چاہیے کہ اپنی انگلیاں چاٹ لے، کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔''

تشریح: کھانے کا ایک لقمہ ضائع ہونے دینا بہ ظاہر نہایت معمولی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے مال کے ضائع ہونے کی برائی کا احساس کمزور ہونے لگتا ہے اور پھر اس سے انسان مال ضائع کرنے کا خوگر ہو سکتا ہے۔ اس لیے پہلے ہی قدم پر جہاں سے برائی کا آغاز ہو سکتا ہے متنبہ فرمایا گیا اور ارشاد ہوا کہ تمہاری کوشش یہ ہو کہ تمہارا کھانے کا ایک لقمہ تک ضائع نہ ہونے پائے۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ مال ضائع کرنے سے شیطان کے مقصد (Cause) ہی کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

پھر گرے ہوئے لقمہ کو کمتر سمجھ کر نہ اٹھانا متکبر لوگوں کا شعار ہے۔ کیوں کہ وہ اس کو اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے ہیں کہ دستر خوان یا ہاتھ سے گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ متکبرانہ افعال شیطان ہی کے افعال ہو سکتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس امت کے پیغمبرؑ کی یہ تعلیم ہو اس کے لوگ کس طرح نہایت بے دردی کے ساتھ غیر اسلامی رسوم اور لایعنی کاموں میں اپنا مال ضائع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پاکیزہ تعلیم کا خون کر رہے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے اپنی انگلیوں (اور برتن کو بھی) چاٹ لینا چاہیے تاکہ خدا کے دیے ہوئے رزق کی قدر شناسی اور تواضع اور انکسار کا اظہار ہو۔ اور کبر و نخوت کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ پھر کسی کو کیا معلوم کہ خدا کے عطا کیے ہوئے رزق میں سے اس کا کون سا حصہ اس کے لیے زیادہ باعثِ برکت ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے رزق کا کوئی حصہ بھی خواہ وہ انگلیوں سے لگا ہوا معمولی رزق ہی کیوں نہ ہو اسے بھی نظر انداز نہ ہونے دیں۔

اقتصاد و توسط

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ وَالتَّوَدُّدُ اِلَی النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ، وَ حُسْنُ السَّوَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ.

(البیھقی فی شعب الایمان)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”مصارف میں میانہ روی (توسط) نصف معیشت ہے، اور انسانوں سے دوستی نصف عقل ہے اور حسن وخوبی کے ساتھ سوال کرنا آدھا علم ہے۔“

تشریح: ایک اور حدیث میں ہے: مِنْ فِقْهِ الرَّجُلِ قَصْدُهٗ فِیْ مَعِيْشَتِهٖ (احمد، طبرانی بروایت ابی الدرداءؓ) ”اپنی معیشت میں توسط اور میانہ روی اختیار کرنا آدمی کے فقیہ (دانا) ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔“ آمدنی اور خرچ میں توازن ہو تو یہ معیشت کے استحکام کا ذریعہ ہے۔ اس کے برخلاف اگر آمدنی اور اخراجات کے درمیان توازن باقی نہ رہے تو آدمی کی معیشت ہرگز درست نہیں رہ سکتی۔ وہ لازماً گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا رہے گا اور اس کی معیشت کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ مصارف میں اگر اعتدال اور توسط کو ملحوظ رکھا جائے تو سمجھیے کہ نظام معیشت کا نصف حصہ درست ہو گیا۔ باقی نصف کا تعلق فکرِ معاش سے ہے۔ یعنی آدمی رِزق اور خدا کے فضل کی تلاش میں سرگرم رہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہے۔ یہ اسباب کی دنیا ہے۔ حصولِ رزق کے لیے جائز طریقے اور وسائل اختیار کرنا آدمی کا فرض ہے۔

لوگوں سے ہمارا تعلق محض ضابطہ کا خشک قسم کا نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح چمن کے پھولوں کی خوش رنگی اور ان کی خوبصورتی کی وجہ سے ان میں ایک خاص قسم کی دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے وجود کو جو چیز دل آویزی بخشتی ہے اور جس کی وجہ سے اس کی زندگی اور اس کے معاشرہ میں رونق اور دل آویزی پیدا ہوتی ہے وہ جذبۂ محبت ہے۔ محبت کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو عظمتوں سے آشنا کرتا ہے اور عام مخلوقات کے مقابلے میں اسے ایک امتیازی شان عطا کرتا ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانش مندی اور عقل مندی کے نصف حصے کا تعلق اسی سے ہے کہ انسان لوگوں سے انس و محبت رکھے۔ بغض و عداوت اور نفرت ہی کے

جذبات اگر اس کے فہم کا حاصل ہیں اور ان ہی جذبات کے ساتھ وہ اپنی زندگی گزارتا ہے تو وہ عقل سے بے بہرہ ہے۔

عقل کے نصف تقاضے تو محبت ہی کے ذریعہ سے پورے ہو جاتے ہیں لیکن عقل کے تقاضے کچھ اور بھی ہوتے ہیں مثلاً زندگی میں سرگرم عمل رہنا اور دنیا میں عدل وقسط کے قیام کے لیے کوشاں رہنا وغیرہ۔ اگر انسان ان سب ہی تقاضوں کو سمجھتا اور ان کے پورا کرنے کی فکر کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی عقل کامل ہے۔ وہ بے عقلی اور کسی قسم کی بے بصیرتی میں مبتلا نہیں ہے۔

یہ بڑی ہی گہری بات ہے کہ حسن وخوبی کے ساتھ سوال کرنا آدھا علم ہے۔ جو شخص علمی ذوق سے آشنا ہوگا۔ اس کے افکار ونظریات منظّم اور مربوط ہوں گے۔ اس کے تصورات میں گہرائی اور گیرائی پائی جائے گی۔ ایسے شخص کا کوئی سوال بھی غیر اہم نہیں ہوسکتا اور اس کا سوال سطحی قسم کا نہیں ہوسکتا۔ وہ اہل علم کے سامنے جو سوال بھی رکھے گا وہ لازماً فہم وبصیرت پر مبنی ہوگا۔ اس پر غور وفکر کرنے سے دینی احکام کے بہت سے ایسے پہلوؤں کے سامنے آنے کے امکانات پیدا ہوں گے جو بالعموم نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات سے اجتہادی صلاحیتوں کو جلا حاصل ہوتی ہے۔ لیکن بیش قیمت سوالات اس شخص کے ہوسکتے ہیں جو خود علمی ذوق کا حامل ہو۔ اور اس کے سوچنے کا انداز سائنٹفک ہو۔ ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ علم کی آدھی دولت تو اُسے پہلے سے حاصل ہے۔ اب مطالعہ اور اہل علم کی صحبت وغیرہ کے ذریعہ سے وہ اپنے علم کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

اِحتکار یا ذخیرہ اندوزی

(۱) عَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لاَ یَحْتَکِرُ اِلاَّ خَاطِیءٌ.

(مسلم)

ترجمہ: حضرت معمر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''احتکار تو بس خطا کار ہی کرتا ہے۔''

تشریح: گراں فروشی کے ارادے سے غلہ کی ذخیرہ اندوزی کرنے کو احتکار کہتے ہیں۔ اگر مخلوقِ خدا پریشان ہے اس کو کھانے کے لیے غلہ کی ضرورت ہے اور کوئی تاجر محض اس لیے غلہ

لوگوں کی پریشانیوں کا کچھ بھی خیال نہ کیا۔ اسے فکر تھی تو اس کی کہ وہ لوگوں کی مجبوریوں سے کتنا زیادہ فائدہ اُٹھالے۔ اس کے مجرمانہ رویہ کی سنگینی کا احساس دلانے کے لیے فرمایا کہ وہ اگر اس غلہ کو خیرات بھی کردے تب بھی یہ جرم ایسا نہیں ہے کہ معاف کردیا جائے۔

زکوٰۃ

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَ صَوْمِ رَمَضَانَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔“

تشریح: یعنی اسلام کی یہ پانچ بنیادی تعلیمات ہیں۔ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کو اپنا الٰہ اور معبود تسلیم نہ کرے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائے کہ آپؐ ہی ہمارے اصل رہنما اور ہادی ہیں۔ نماز کا اہتمام کرے کہ دنیا میں یہی اظہار بندگی اور مضطرب دل کے لیے سکون وقرار کا سامان ہے۔ استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔ آدمی اگر مال دار ہے تو اسلام نے اس پر یہ بھی لازم کیا ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ بھی دے۔ اس کا مال صرف اسی کے لیے ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ ضرورت مندوں اور مسکینوں کے بھی کام آئے اور وہ دین کی خدمت میں بھی صرف ہو۔

حقیقت میں لطافتِ احساس ہی دین کی روح بلکہ اصل دین ہے۔ یہی احساس کی لطافت جو رکوع وسجود کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی لطافتِ احساس بندے کو حج بیت اللہ پر آمادہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وہ روحِ دین ہے جو رمضان کے مبارک مہینے میں دن میں مومن کو کھانے پینے، جنسی تسکین اور جسمانی عیش اور آرام سے بے نیاز رکھتی ہے۔ اور اس کے دل میں یہ احساس جگاتی ہے کہ زندگی خورد ونوش اور ظاہری عیش وآرام کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ اسے

ان چیزوں سے ہٹ کر کسی اور چیز کا بھی آرزومند ہونا چاہیے۔ پھر یہی لطافتِ شعور واحساس ہے جو اسے بندگانِ خدا کی حاجت روائی پر آمادہ کرتی ہے۔ پھر وہ اپنے مال سے ان کی خدمت کو اپنے لیے ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ یہ جذبہ نہ ہو تو آدمی کا دین ناقص ہی رہتا ہے بلکہ حقیقت کی نگاہ میں سرے سے دین کے اصل مفہوم ومعنی سے وہ بے خبر قرار پاتا ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْيَمَنِ فَقَالَ: اِنَّکَ تَاْتِیْ قَوْمًا اَهْلَ كِتَابٍ فَادْعُهُمْ اِلٰی شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِی الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ. فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ فَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَآئِهِمْ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاِيَّاکَ وَكَرَآئِمَ اَمْوَالِهِمْ. وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: ”تم اہلِ کتاب میں ایک قوم کی طرف جا رہے ہو۔ لہٰذا انھیں اس بات کی شہادت دینے کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اب اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو پھر انھیں بتانا کہ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ نماز فرض کی ہے۔ اگر وہ اس کو مان لیں تو پھر ان کو بتانا کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کی طرف لوٹا دی جائے گی۔ اگر وہ اسے مان لیں تو ان کے اچھے اور قیمتی مال سے بچنا اور مظلوم کی بددعا سے ڈرنا کیوں کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔“

تشریح: یعنی اس کا خیال رہے کہ وہاں تمھیں اہلِ کتاب سے سابقہ پیش آئے گا۔ انھیں دینِ حق کی دعوت دینا بھی تمہارا فرض ہے۔ انھیں نہایت حکمت کے ساتھ دین کی طرف بلانا۔ خدا کا پیغام پہنچانے میں حکمت کے ساتھ ساتھ تدریج کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلے انھیں خدا کی توحید اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دینا۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیتے

ہیں تو پھر ایمان لانے کا اولین تقاضا کیا ہوتا ہے وہ ان کے سامنے رکھنا یعنی یہ کہ مومنین کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ خدا سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار اپنی نمازوں کے ذریعہ سے کریں اور برابر کرتے رہیں۔ جب وہ اسے اپنا شعار بنالیں تو پھر ان کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ اپنے جسم اور جان کے ذریعے سے ہی نہیں بلکہ اپنے مال میں بھی وہ خدا کے اطاعت گزار ہوں۔ ان کے مال دار اپنے مال کی زکوٰۃ دیں۔ انھیں بتائیں کہ زکوٰۃ کا حکم نہایت حکیمانہ ہے۔ تمھاری زکوٰۃ سے خدا اپنے خزانے کو بھرنا نہیں چاہتا۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہوسکتی ہے۔ یہ زکوٰۃ اگر تمھارے مال داروں سے لی جائے گی تو یہ تمھارے فقراء ومساکین پر خرچ کی جائے گی تاکہ انھیں ان کی پریشان حالی سے نجات دلائی جاسکے۔ اگر معاشرہ کے مساکین پریشان حال ہی رہ گئے تو مال داروں اور اہلِ ثروت کی خوش حالی کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے۔ یہ تو ان کے لیے ایک بدنما داغ ہوگا اور ان کی بے حسی اور سخت دلی کا بین ثبوت ہوگا اور وہ مقام شرافت سے گرجائیں گے۔

اس حدیث میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی زکوٰۃ وصول کرنے میں ان کے اچھے اور قیمتی مال ہی کو سمیٹنے لگ جاؤ۔ ان پر ظلم ہرگز نہ ہونے پائے۔ مظلوم کی خدا فوراً سنتا ہے۔ ان کی بددعا سے ڈرتے رہنا۔

(۳) وَعَنْ زَیْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَتْ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: یَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقْنَ وَلَوْ مِنْ حُلِیِّکُنَّ فَاِنَّکُنَّ اَکْثَرُ اَهْلِ جَهَنَّمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی زوجہ محترمہ حضرت زینبؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم (عورتوں) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ’’اے عورتوں کی جماعت، تم اپنے مال کی زکوٰۃ دو اگرچہ وہ تمھارے زیور ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ قیامت کے روز تم میں اکثریت دوزخیوں کی ہوگی۔‘‘

تشریح: بالعموم عورتوں کی اکثریت حرص وہوس اور دنیا کی محبت میں گرفتار رہتی ہے۔ اس لیے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی توفیق بھی انھیں کم ہی ملتی ہے۔ اس لیے اے عورتو اگر دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہنا چاہتی ہو تو دنیا کی محبت اور عیش وعشرت کی طمع اپنے دلوں سے نکال دو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ دیتی رہو۔ زیور اگر حد نصاب کو پہنچتا ہو تو اس کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ان زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی جن کا استعمال مباح ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مطلقاً زیور پر زکوٰۃ واجب ہے اگر وہ نصاب کی حد کو پہنچتا ہو۔

﴿۴﴾ وَعَنْ مُوْسَی بْنِ طَلْحَۃَ قَالَ عِنْدَنَا کِتَابُ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَالَ اِنَّمَا اَمَرَہٗ اَنْ یَّاْخُذَ الصَّدَقَۃَ مِنَ الْحِنْطَۃِ وَالشَّعِیْرِ وَالزَّبِیْبِ وَالتَّمْرِ.

(مرسل رواہ فی شرح السنۃ)

ترجمہ: حضرت موسیٰ ابن طلحہ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت معاذ بن جبلؓ کا وہ مکتوب موجود ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس بھیجا تھا۔ چناں چہ حضرت معاذؓ نے بیان کیا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں گیہوں، جو، انگور اور کھجوروں کی زکوٰۃ وصول کروں۔“

تشریح: زمین کی ہر پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہے صرف چار کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہی چار چیزیں اس علاقہ میں پیدا ہوتی تھیں۔

﴿۵﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: فِیْمَا سَقَتِ السَّمَآءُ وَالْعُیُوْنُ اَوْ کَانَ عُثْرِیاً الْعُشْرُ وَمَا سُقِیَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو آسمان اور چشموں سے سیراب ہوتا ہو یا خود زمین سرسبز و شاداب ہو اس میں دسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور جس کی سینچائی کنویں سے ہوتی ہو اس میں پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جس زمین کی سینچائی کنویں سے پانی کھینچ کر کی جاتی ہو اور آب پاشی پر اچھا خاصا خرچ آتا ہو اس کی پیداوار میں بیسواں حصہ بہ طور زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جس زمین کی سینچائی میں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا جو بارش ہی سے سیراب ہو جاتی ہو یا چشموں سے بہ آسانی جس کی آب پاشی ہو جاتی ہو اس کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا ہوگا۔

﴿۶﴾ وَعَنْ رَبِیْعَۃَ بْنِ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ غَیْرِ وَاحِدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَقْطَعَ لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِیِّ مَعَادِنَ الْقَبَلِیَّۃِ وَھِیَ مِنْ نَّاحِیَۃِ الْفُرُعِ فَتِلْکَ الْمَعَادِنُ لَا تُؤْخَذُ مِنْھَا اِلَّا الزَّکٰوۃَ اِلَی الْیَوْمِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ربیعہ ابن ابوعبدالرحمٰن (تابعی) بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال ابن حارث مزنیؓ کو نواح فرع میں قبل کی کانیں بہ طور جاگیر عطا

کی تھیں۔ چناں چہ ان کانوں سے اب تک زکوٰۃ لی جاتی ہے۔

تشریح: معلوم ہوا کہ معدنیات کی آمدنی میں سے بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک معدنیات میں خمس (پانچواں حصہ) واجب ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک معدنیات میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ معدنیات کے برآمد کرنے میں اگر کافی محنت ومشقت سے کام لینا پڑتا ہو تو چالیسواں حصہ واجب ہوگا، بہ صورتِ دیگر خمس واجب ہوگا۔

جانوروں مثلاً گائے، بکری اور اونٹ وغیرہ پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس کا نصاب کتب فقہ سے معلوم کرسکتے ہیں۔ سونا، چاندی اور سامانِ تجارت پر بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

‹۷› وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً فَلاَ زَكٰوةَ فِيْهِ حَتّٰى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی کو مال حاصل ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔''

تشریح: امام ترمذیؒ کا بیان ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک یہ روایت حضرت ابن عمرؓ پر موقوف ہے۔ یعنی اس کے نزدیک یہ آں حضرت ﷺ کا ارشاد نہیں بلکہ خود حضرت ابن عمرؓ کا اپنا قول ہے۔

‹۸› وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لاَ تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ اِلاَّ لِخَمْسَةٍ: لِغَازٍ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ لِعَامِلٍ اَوْ لِغَارِمٍ اَوْ لِرَجُلٍ اِشْتَرَاهَا بِمَالِهِ اَوْ لِرَجُلٍ كَانَ لَهُ جَارٌ مِسْكِيْنٌ فَتَصَدَّقَ عَلَى الْمِسْكِيْنِ فَاهْدَى الْمِسْكِيْنُ لِلْغَنِيِّ. (مالک، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عطا ابن یسار بہ طریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غنی (مال دار) کے لیے صدقہ وزکوٰۃ کا مال جائز نہیں سوائے پانچ صورتوں کے۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے۔ زکوٰۃ وصول کرنے پر جو مقرر ہو اس کے لیے، تاوان بھرنے والے کے لیے، اس شخص کے لیے جو مفلس سے اس کا مال اپنے مال کے بدلے میں خرید لے، اس شخص کے لیے جس کے پڑوس میں کوئی مسکین رہتا ہو اور کسی نے اسے زکوٰۃ کا مال دیا اور وہ

اسے ہدیہ کے طور پر اپنے مال دار پڑوسی کو دے دے۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غازی یعنی جہاد میں شریک شخص کو زکوٰۃ میں سے رقم دی جاسکتی ہے خواہ وہ مال دار اور غنی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح زکوٰۃ وصول کرنے والے کو زکوٰۃ میں سے اس کی محنت کی اجرت دی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے جائز ہے وہ اس اجرت کو قبول کرلے۔ تاوان بھرنے والا اگرچہ غنی ہو لیکن تاوان کی رقم معمولی نہیں تو وہ زکوٰۃ لے کر تاوان کا مطالبہ پورا کرسکتا ہے۔ یہ تاوان دیت کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے یا کسی اور شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی کا قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا لیکن اس کا ادا کرنا اس کے لیے آسان نہ ہو۔

غنی اگر کسی مفلس سے زکوٰۃ کا مال خرید لے تو یہ مالِ زکوٰۃ اس کے لیے جائز ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی مفلس شخص جسے زکوٰۃ یا صدقہ کا مال ملا تھا، اس مال میں کچھ بہ طور ہدیہ یا تحفہ اپنے مال دار پڑوسی کو بھیجتا ہے تو وہ اس غنی کے لیے جائز ہوگا۔ کیوں کہ وہ مال اس مفلس کے لیے تو صدقہ تھا لیکن غنی کے پاس وہ تحفہ کی شکل میں پہنچ رہا ہے۔

﴿۹﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: لَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسَۃِ اَوْسُقٍ مِنَ التَّمْرِ صَدَقَۃٌ وَلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ اَوَاقٍ مِّنَ الْوَرَقِ صَدَقَۃٌ وَلَیْسَ فِیْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ مِّنَ الْاِبِلِ صَدَقَۃٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پانچ وسق سے کم کھجور ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، پانچ اوقیہ سے کم چاندی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور پانچ راس سے کم اونٹوں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔“

تشریح: پانچ وسق نو کوئنٹل کے برابر ہوتے ہیں۔ اگر اس مقدار سے کھجوریں کم ہوں تو اس حدیث کے بہ موجب اس میں دسواں حصہ بہ طور زکوٰۃ واجب نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا یہی مسلک ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زمین کی پیداوار میں کوئی نصاب مقرر نہیں ہے۔ جس قدر بھی پیداوار ہو اس کا دسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالنا واجب ہے۔ زمین کی پیداوار گیہوں اور چنا وغیرہ کا یہی حکم ہے۔ زمین کی پیداوار کے عشر کے متعلق احناف کے یہاں فتویٰ امام اعظمؒ ہی کے قول پر ہے۔ اس حدیث کی توجیہ ان کی جانب سے یہ کی جاتی ہے کہ اس حدیث میں کھجور سے وہ کھجوریں مراد ہیں جو تجارت کے لیے ہوں۔ مال تجارت میں زکوٰۃ کے

لیے نصاب متعین ہے۔

اواق اوقیہ کی جمع ہے۔ پانچ اواق ساڑھے باون تولے (تقریباً چھ سو ساڑھے بارہ گرام) کے برابر ہوتے ہیں۔ جو چاندی کا نصابِ زکوٰۃ ہے۔ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے (تقریباً ساڑھے ستاسی گرام) ہے۔ سونے اور چاندی دونوں مل کر اگر بہ قدر نصاب ہو جاتے ہوں تو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اس کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ یہ مالک کی ملکیت میں سال بھر رہ چکے ہوں۔ یہ شرط سونے چاندی، نقدی، مویشی اور سامانِ تجارت کے لیے ہے۔ زرعی پیداوار، پھل، شہد، معدنیات اور دفینے کے لیے سال پورا ہونے کی قید نہیں ہے۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: فِيْمَا سَقَتِ السَّمَآءُ وَالْعُيُوْنُ اَوْ كَانَ عَثَرِيًّا الْعُشْرُ وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ’’جس (زمین) کو آسمان نے سیراب کیا ہو یا چشموں نے یا خود زمین سرسبز و شاداب ہو تو اس میں دسواں حصہ (عشر) واجب ہوتا ہے اور جو زمین اونٹوں (یا بیلوں) کے ذریعہ سے کنویں سے پانی کھینچ کر سیراب کی گئی ہو اس کی پیداوار میں بیسواں حصہ بہ طور زکوٰۃ دینا واجب ہے۔‘‘

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جو زمین بارش سے یا قدرتی طور پر سیراب ہوتی ہو یا پانی کے قریب ہونے سے خود بہ خود تر و تازہ اور سرسبز و شاداب رہتی ہو۔ اوپر سے اسے پانی دینے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو تو ایسی زمین سے جو غلہ وغیرہ پیدا ہوگا اس میں دسواں حصہ بہ طور زکوٰۃ دینا واجب ہوگا۔ اور جس زمین کی سینچائی میں مشقت برداشت کرنی پڑتی ہو اس کی پیداوار میں بیسواں حصہ بہ طور زکوٰۃ دینا واجب ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زمین سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں غلہ اور پھول پھل وغیرہ سب میں زکوٰۃ دینی ہوگی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ سبزترکاریوں میں زکوٰۃ نہیں۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَاْمُرُنَا اَنْ نُّخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِيْ نُعِدُّ لِلْبَيْعِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیا کرتے تھے کہ ہم

جو مال تجارت کے لیے تیار کریں اس کی زکوٰۃ نکالا کریں۔

تشریح: بعض نے اس حدیث کی اسناد کو ضعیف قرار دیا ہے۔ بعض اموال تجارت میں زکوٰۃ کے وجوب کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جمہور کے نزدیک اموالِ تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے۔ رہی سمرہ بن جندبؓ کی یہ حدیث تو ابن عبداللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے اور احمد شاکر کے نزدیک اس کے راوی معروف ہیں اور ان کا ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔

〈۱۲〉 **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْعُجْمَآءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ وَالْبِئْرُ جُبَارٌ وَالْمَعْدِنُ جُبَارٌ وَ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسُ.** (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”اگر جانور کسی کو زخمی کر دیتا ہے تو معاف ہے۔ اگر کنویں میں گر کر کوئی مر جاتا ہے یا کنواں کھودنے میں کوئی مر جائے تو معاف ہے۔ کان کھودنے میں کوئی مر جائے تو معاف ہے اور کان اور دفینہ میں پانچواں حصہ واجب ہے۔“

تشریح: یعنی موت میں اگر کسی کی کوتاہی اور لاپروائی کا دخل نہیں ہے تو تاوان، اور خوں بہا وغیرہ نہیں لیا جائے گا۔

اس بات پر سبھی فقہا کا اتفاق ہے کہ معدنیات میں حق واجب ہے۔ قرآن میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (البقرہ:۲۶۷)

”اے ایمان لانے والو، اپنی کمائی کی پاک عمدہ چیزوں میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے بھی جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالی ہیں۔“ ظاہر ہے معدنیات کو بھی زمین سے نکالا ہے۔ حنابلہ کے نزدیک ہر قسم کی معدنیات میں جو زمین سے نکلیں اور جن کی کوئی قیمت ہو زکوٰۃ واجب ہے۔ معدنیات کا شمار مال ہی میں ہوتا ہے۔ قرآن میں مال غنیمت میں خمس کو لازم ٹھہرایا ہے۔ (الانفال:۴۱)

بعض فقہاء کے نزدیک معدنیات کے نکالنے میں جو محنت صرف ہوتی ہو اور اس سلسلہ میں جو اخراجات برداشت کرنے پڑیں اس کے لحاظ سے معدنیات کم مقدار میں نہیں بلکہ وافر مقدار میں حاصل ہوں تو ان میں خمس واجب ہوگا۔ اور اگر نکالی گئی معدنیات کی مقدار محنت اور اخراجات کے لحاظ سے کم ہے تو چالیسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول یہی ہے۔ زرعی پیداوار میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ محنت

کی مناسبت سے واجب مقدار میں فرق کیا گیا ہے۔

〈۱۳〉 وَعَنْ زِيَادِ بْنِ الْحَارِثِ الصُّدَائِيِّ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَبَايَعْتُهُ فَذَكَرَ حَدِيْثًا طَوِيْلاً فَاَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ اَعْطِنِيْ مِنَ الصَّدَقَةِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ بِحُكْمِ نَبِيٍّ وَلاَ غَيْرِهٖ فِي الصَّدَقَاتِ حَتّٰى حَكَمَ فِيْهَا هُوَ فَجَزَّاهَا ثَمَانِيَةَ اَجْزَآءٍ فَاِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَجْزَآءِ اَعْطَيْتُكَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت زیادؓ ابن حارث صدائی بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر وہ ایک طویل حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپؐ مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے عطا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ”زکوٰۃ کے سلسلے میں (کہ وہ کسے دی جائے) اللہ نہ تو کسی نبی کے حکم پر راضی ہوا اور نہ کسی غیر نبی کے حکم پر بلکہ اللہ نے خود اس کے بارے میں حکم ارشاد فرمایا۔ چناں چہ اللہ نے زکوٰۃ کو آٹھ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ اگر تم ان آٹھ میں سے ہو گے تو میں زکوٰۃ کا مال دے دوں گا۔“

تشریح: یہ اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (التوبہ:۶۰) **”صدقات تو بس غریبوں، محتاجوں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جن کے دلوں کا مائل و مانوس کرنا مطلوب ہو اور گردنوں کو چھڑانے اور قرض داروں اور تاوان زدہ لوگوں کو سنبھالنے میں، اللہ کے راستے میں اور مسافروں کی مدد کرنے میں صرف کرنے کے لیے ہیں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے، اللہ سب کچھ جاننے والا، نہایت حکمت والا ہے۔“**

اس آیت میں زکوٰۃ کے خرچ کرنے کی آٹھ مدات کا ذکر واضح طور پر فرمایا گیا ہے:
۱-فقیر، ۲-مسکین، ۳-عاملین زکوٰۃ (جو زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہوں)، ۴-مولفۃ القلوب، ۵-جن کی گردنیں پھنسی ہوئی ہوں یعنی غلام اور قیدی وغیرہ، ۶-تاوان زدہ یا مقروض لوگ، ۷-فی سبیل اللہ (یعنی وہ کام جو خدا کے دین کے لیے ہو رہا ہو۔ مثلاً جہاد، دعوتِ دین کی سرگرمیاں، اشاعت علم دین وغیرہ کے کام۔ ۸-مسافر جو اپنے وطن سے دور ہونے کی وجہ سے مدد کے محتاج ہو گئے ہوں۔

فقراء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا مال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اہل وعیال کی بنیادی ضرورتیں پوری کر سکیں، مسکین احتیاج میں فقیر سے کم تر بھی ہوسکتا ہے اور کبھی زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔ مسکین کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰكِنِ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ لاَيَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلاَ يُفْطَنُ لَهٗ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلاَ يَقُوْمُ فَيَسْأَلَ النَّاسَ. (بخاری) ''مسکین وہ نہیں ہے جو ایک یا دو لقموں کے لیے یا ایک کھجور کی خاطر لوگوں کے پاس چکر لگاتا رہے بلکہ مسکین وہ ہے جس کی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں، گم نامی میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے اسے خیرات نہیں دی جاتی اور نہ ہی وہ کھڑا ہو کر لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے۔''

مؤلفۃ القلوب یعنی جن کے دلوں کی تالیف مطلوب ہو۔ اس سے مراد وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جس کی اسلامی حالت کمزور ہے گرچہ وہ معاشرہ میں اثر ورسوخ رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی دل جوئی کے لیے زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے تاکہ وہ اسلام میں پختہ ہوسکے اور لوگ اس کے شر سے بچ سکیں۔ سماج کے لیے وہ مفید ثابت ہوسکے۔

وہ کفار بھی اس سے مراد ہوسکتے ہیں جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا مطلوب ہو یا جن کے دلوں میں اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنا مقصود ہو۔ چناں چہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: اِنِّيْ اُعْطِيْ قُرَيْشًا اَتَأَلَّفُهُمْ لِاَنَّهُمْ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ ''میں قریش کو ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہونے کے لیے دیتا ہوں کیوں کہ یہ زمانۂ جاہلیت سے زیادہ قریب ہیں۔'' اس طرح یہ حصہ مصلحت کے تحت ہر اس شخص کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جو کسی حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہوسکتا ہو۔ صحافت سے تعلق رکھنے والے اصحابِ قلم وغیرہ کو بھی اس سلسلہ میں پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں۔

صدقۂ فطر

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَكٰوةَ الْفِطْرِ طُهْرَ الصِّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِيْنِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے روزوں کو بیہودہ باتوں او

فحش ولغو کلام سے پاک کرنے کے لیے مساکین کو کھلانے کی غرض سے صدقہ فطر لازم قرار دیا ہے۔

تشریح: رمضان المبارک کے روزے پورے کرنے کے بعد عید الفطر کے موقع پر جس صدقہ کے دینے کا حکم ہے اسے صدقۂ فطر کہتے ہیں۔ صدقۂ فطر گھر کے سبھی افراد کی طرف سے دینا ہوتا ہے یہاں تک کہ جو بچہ طلوع فجر کے بعد پیدا ہو اس کی طرف سے بھی صدقۂ فطر دینا واجب ہے۔ اس حدیث میں اس صدقہ کی حکمت یہ بیان ہوئی ہے کہ رمضان میں روزے دار سے جو کوتاہی اور تقصیر ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے اس کے روزوں میں جو کمی رہ گئی ہوگی وہ دور ہو جائے گی۔ لغو اور رفث کے اثرات سے روزے دار بھی پاک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک بڑی حکمت صدقۂ فطر کی یہ ہے کہ عید کی مسرتوں اور خوشیوں میں مساکین اور فقراء کو بھی عام مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کا موقع مل سکے گا۔

﴿۲﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ زَکٰوۃَ الْفِطْرِ صَاعًا مِّنْ تَمرٍ اَوْ صَاعًا مِّنْ شَعِیْرٍ عَلَی الْعَبْدِ وَالْحُرِّ وَالذَّکَرِ وَالْاُنْثٰی وَالصَّغِیْرِ وَالْکَبِیْرِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ اَمَرَ بِھَا اَنْ تُؤَدّٰی قَبْلَ خُرُوْجِ النَّاسِ اِلَی الصَّلٰوۃِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر ایک غلام، آزاد، مرد، عورت اور چھوٹے بڑے پر زکوٰۃ فطر (صدقۂ فطر) کے طور پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو فرض کیا ہے۔ اور صدقۂ فطر کے سلسلہ میں یہ بھی حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے نماز کے لیے نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔

تشریح: جو غلام خدمت کے لیے ہو اس کی طرف سے بھی صدقۂ فطر دینا واجب ہے۔ اولاد جو باپ کی کفالت میں ہے۔ اس کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا لازم ہے۔

صاع تین کلو ۲۶۶ گرام کے وزن کو کہتے ہیں۔

بہتر اور پسندیدہ بات یہی ہے کہ صدقۂ فطر نماز عید کے لیے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی ادا کر دیا جائے۔ صدقۂ فطر رمضان المبارک میں بھی دے سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ عید آنے سے کچھ روز پہلے ہی مساکین وفقراء کو صدقۂ فطر دے دیا جائے تا کہ انھیں اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع مل سکے۔

عام صدقات

﴿۱﴾ عَنْ اَسْمَاءَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَنْفِقِیْ وَلَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰہُ عَلَیْکَ وَلَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰہُ عَلَیْکَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خرچ کرو، گن گن کر نہ رکھو، ورنہ اللہ بھی گن گن کر دے گا اور بند کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ بھی تم سے روک لے گا۔''

تشریح: یعنی نیک کام اور بھلائی کے کاموں میں کشادہ دلی کے ساتھ اپنے مال خرچ کرو۔ مال اسی لیے ہے کہ وہ اچھے کاموں میں صرف ہو۔ مال کو جمع کرنے کی فکر میں نہ پڑو۔ اگر تم مال خرچ کرنے میں پس وپیش سے کام لوگے اور بہت سنبھال سنبھال کر اور گن گن کر خرچ کرو گے اور اپنے مال کو روکے رکھنے کی تمھیں زیادہ فکر ہوگی تو سن لو، خدا بھی تمہارے ساتھ یہی رویہ اختیار کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ تم سے اپنا رزق روک سکتا ہے یا عطا بھی کرے تو بہت ناپ تول کر عطا کرے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا حَسَدَ اِلَّا عَلٰی اِثْنَیْنِ: رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْقُرْاٰنَ فَھُوَ یَقُوْمُ بِہٖ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَ اٰنَاءَ النَّھَارِ، وَ رَجُلٌ اٰتَاہُ اللّٰہُ مَالاً فَھُوَ یُنْفِقُ مِنْہُ آنَاءَ اللَّیْلِ وَ آنَاءَ النَّھَارِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جن سے حسد کیا جائے صرف دو شخص ہیں۔ ایک تو وہ شخص جسے خدا نے قرآن عطا فرمایا اور وہ رات کی گھڑیوں میں اور دن کے اوقات میں اس میں مشغول رہتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جسے خدا نے مال عطا فرمایا اور وہ اس میں سے رات کے اوقات میں اور دن کے اوقات میں خرچ کرتا رہتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث میں حسد کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ مراد اس سے غبطہ ہے جس کو رشک کہتے ہیں۔ کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ ہمیں بھی وہ نعمت حاصل ہو جائے بغیر اس کے کہ وہ نعمت اس دوسرے شخص سے زائل ہو، جائز ہے۔ اسے مجازاً حسد کہا جائے گا۔ اصلاً یہ رشک ہے جس کے جائز ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے برخلاف کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کرنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے اور وہ نعمت ہمیں میسر آئے، یہ حسد حرام ہے۔

اس حدیث میں دو خاص نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کا شوق دلایا گیا ہے کہ دونوں ہی نعمتیں حاصل کرنے کی ہیں۔ ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کی نعمت حاصل ہو اور وہ راتوں میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی قرآن کی تلاوت کرتا اور اس کے علوم واحکام میں غور وفکر کرنے میں بھی اپنے وقت کا بڑا حصہ صرف کرتا ہو۔ اور نماز میں قیام کی حالت میں زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھنے کی کوشش کرتا ہو۔

دوسری بڑی نعمت جو قابلِ رشک ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو خدا نے دولت و ثروت سے نوازا ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ مال نیک کاموں میں اور دین کے فروغ کے لیے خرچ کرتا رہتا ہو۔ اس کے انفاق کا یہ جذبہ نہ دن میں سرد پڑتا ہو اور نہ وہ رات میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہو۔

〈۳〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَوْکَانَ عِنْدِیْ اُحُدٌ ذَهَبًا لَّاَحْبَبْتُ اَنْ لَّایَاْتِیَ ثَلَاثٌ وَعِنْدِیْ مِنْهُ دِیْنَارٌ لَّیْسَ شَیْءٌ اَرْصُدُهٗ فِیْ دَیْنٍ عَلَیَّ اَجِدُ مَنْ یَقْبَلُهٗ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا ہوتا تو لازماً مجھے یہی پسند ہوتا کہ تین راتیں بھی اس حال میں نہ گزریں کہ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس موجود رہے جسے میں نے قرض کی ادائیگی کے لیے نہ رکھا ہو، اس حال میں کہ میں ایسے شخص کو پاؤں جو اس کو قبول کرے۔''

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے دل میں جذبۂ انفاق کس قدر پایا جاتا تھا۔ آپؐ کو مال جمع کرنے کے بجائے اصل دلچسپی اور شوق مال خرچ کرنے کا تھا۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوہِ احد کے برابر بھی مجھے سونا میسر ہو تو میں یہی پسند کروں گا کہ تین راتیں بھی اس حال میں نہ گزرنے پائیں کہ ایک دینار کے بقدر بھی سونا میرے پاس باقی رہ جائے۔ میں اسے جلد سے جلد خدا کی راہ میں اور لوگوں کی حاجت روائی میں خرچ کر ڈالوں گا۔ ایک دینار بھی بچا کر اپنے لیے رکھنا مجھے پسند نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ دین (قرض) کے ادا کرنے کی غرض سے قرض خواہ کے انتظار میں مجھے اسے اپنے پاس رکھنا پڑے گا۔ مجھے فکر ہوگی تو یہ کہ طالب یا حاجت مند ملے اور اس کا مطالبہ پورا کرنے اور حاجت مند کی حاجت روائی میں میری طرف سے کوئی تاخیر نہ ہو۔

تعاون و ہمدردی

﴿۱﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّؓ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذْ جَاءَہٗ رَجُلٌ عَلٰی رَاحِلَۃٍ فَجَعَلَ یَضْرِبُ یَمِیْنًا وَ شِمَالاً. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ کَانَ مَعَہٗ فَضْلُ ظَھْرٍ فَلْیَعُدْ بِہٖ عَلٰی مَنْ لَّا ظَھْرَ لَہٗ وَمَنْ کَانَ فَضْلُ زَادٍ فَلْیَعُدْ بِہٖ عَلٰی مَنْ لَّا زَادَ لَہٗ. قَالَ فَذَکَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ حَتّٰی رَأَیْنَا اَنَّہٗ لَا حَقَّ لِاَحَدٍ مِنَّا فِیْ فَضْلٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ اچانک ایک شخص اونٹ پر آپؐ کی خدمت میں آیا۔ وہ کبھی دائیں طرف جاتا، کبھی بائیں طرف مڑتا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: ”جس کے پاس زائد سواری ہو اسے چاہیے کہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو، اور جس کے پاس زائد زادِ راہ (کھانے پینے کا سامان) ہو اسے چاہیے کہ اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔“ اس طرح آپؐ نے مال کی کئی قسموں کا ذکر کیا یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ ضرورت سے زائد چیزوں میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

تشریح: ایسا لگتا ہے کہ اس کی سواری بھی تھک ہار کر ناکارہ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی بھوک سے بدحال ہو چکا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا کہ کہیں سے اس کی ضروریات کے پورا ہونے کا سامان ہو جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی پریشانی اور بے سروسامانی پر ترس آیا اور آپؐ نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد سامان ہو اس سے وہ اپنے ضرورت مند بھائی کی مدد کرے۔ زائد از ضرورت چیزوں کا بہترین استعمال یہ ہے کہ وہ ضرورت مندوں کے کام آئے۔ جنگ کے موقع پر یا ہنگامی حالات میں اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ آدمی کسی چیز کو بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز نہ کرے جو وہ خرچ کر سکتا ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَسْمَاءَؓ قَالَتْ: قَالَ لِیَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: لَاتُوْکِیْ فَیُوْکٰی عَلَیْکِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (صدقہ اور خیرات کو) روکو مت ورنہ تم سے بھی روک لیا جائے گا۔“

تشریح: حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ سے بخاری میں یہ روایت بھی منقول ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس آئیں تو آپؐ نے فرمایا: لَا تُوعِیْ فَیُوعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ اِرْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتَ ”(روپے پیسے) تھیلی میں بند کر کے مت رکھو ورنہ اللہ بھی بند رکھے گا تمہیں دے گا نہیں اور جہاں تک تم سے ہو سکے خیرات کرتی رہو۔“

ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مال اور دولت اسی لیے ہے کہ وہ اچھے سے اچھے کاموں میں صرف ہو۔ اس سلسلے میں بخیل بن کر رہنا خدا کو ہرگز پسند نہیں ہے۔

سائل کا حق

(۱) عَنِ الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَ اِنْ جَآءَ عَلٰی فَرَسٍ. (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت حسین بن علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”سائل کا حق ہے (کہ اسے دیا جائے) اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔“

تشریح: یعنی جہاں تک ممکن ہو سائل کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہیے۔ سائل اگرچہ گھوڑے اور قیمتی سواری پر سوار ہو کر آیا ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ ایک باحیثیت شخص ہے کوئی محتاج اور مسکین نہیں ہے۔ پھر بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے تو کیا عجب کہ وہ واقعی ضرورت مند ہو۔ اور ضرورت نے اسے مانگنے اور سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ مانگنے والے کا بہ ہر حال یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ لازماً دیا جائے۔ البتہ اگر یہ ثابت ہو کہ مانگنے والا کوئی فریب کار ہے اور وہ لوگوں کو دھوکا دے کر ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس نے اسی کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے تو پھر ایسے فریب کار کی حوصلہ افزائی سے اجتناب کرنا ہی بہتر ہوگا۔

اجارہ

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِؓ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ: زَعَمَ ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاکِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنِ الْمُزَارِعَةِ وَ اَمَرَ بِالْمُوَاجِرَةِ وَقَالَ: لَابَأْسَ بِهَا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہؓ بن مغفل کہتے ہیں کہ ثابت بن ضحّاک نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا اور اجارہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ”اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔“

تشریح: اجارہ کے نام سے تین قسم کی اجرتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ۱: وہ اجرت جو کرایہ کی شکل میں دی جاتی یا لی جاتی ہے۔ ۲: وہ اجرت جو پیشہ وروں کو مثلاً لوہار اور بڑھئی یا درزی وغیرہ کو دی جاتی ہے۔ ۳: وہ اُجرت جو مزدور یا ملازم کی حیثیت سے کسی کو دی جاتی ہے یا کسی سے حاصل کی جاتی ہے۔

اجارہ ایک طرح کے معاہدہ کا نام ہے۔ مثلاً متعین مدت کے لیے کام پر کسی کو لگایا اور اس کی مقررہ اجرت ادا کرنے کا معاہدہ کرلیا ہے۔ شریعت میں عقد اجارہ جائز ہے۔ قرآن میں ہے: لَوْشِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا (کہف:۷۷) اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت ٹھہرا لیتے۔“

اجارہ کے سلسلے میں ضروری ہے کہ منفعت متعین ہو مثلاً مکان کرایہ پر دیا جا رہا ہے تو رہائش کے لیے دیا جا رہا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس کام کے لیے معاہدہ ہو وہ کام جائز اور مباح ہو، حرام نہ ہو۔ کسی کو زمین کرایہ پر اس غرض سے دینا جائز نہیں ہے کہ وہ وہاں شراب خانہ یا قمار خانہ قائم کرے۔ اجرت یا کرایہ متعین ہونا چاہیے۔ حدیث ہے: نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ اسْتِئْجَارِ الْاَجِيْرِ حَتّٰى يُبَيَّنَ لَهٗ اَجْرُهٗ (احمد) ”رسولِ خدا ﷺ نے مزدور کی اُجرت متعین کیے بغیر مزدور رکھنے سے منع فرمایا ہے۔“

حدیث میں یہ جو ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا تو اس سے مزارعت کی وہ صورتیں ہیں جن کا عدم جواز واضح اور یقینی ہے۔ (مثلاً دیکھیں زراعت کے تحت حدیث نمبر ۳) اکثر علما مزارعت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ اور امام احمدؒ بھی جواز کے قائل ہیں۔ رفع ضرورت کی مصلحت بھی علما کے پیش نظر ہے۔

〈۲〉 وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اِحْتَجَمَ فَاَعْطَى الْحَجَّامَ اَجْرَهٗ وَاسْتَعَطَ.
(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے سینگی لگوائی اور سینگی لگانے والے کو اجرت دی اور آپؐ نے ناک میں دوا ڈالی۔

تشریح: یعنی علاجاً آپؐ نے سینگی سے خون نکلوایا اور سینگی لگانے والے کو اس کی اجرت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ علاج میں دوا وغیرہ کا استعمال روا ہے۔ اللہ نے اگر امراض پیدا کیے ہیں تو ان کی دوائیں بھی پیدا کی ہیں۔ ان دواؤں سے فائدہ اُٹھانا توکل کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔

ہدیہ

〈۱〉 عَنْ اَبِی ہُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ عُرِضَ عَلَیْہِ رَیْحَانٌ فَلاَ یَرُدُّہٗ فَاِنَّہٗ خَفِیْفُ الْمَحْمِلِ طَیِّبُ الرِّیْحِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی کو خوشبودار پھول (بہ طور ہدیہ) دیا جائے تو وہ اسے واپس نہ کرے (بلکہ قبول کرلے) کیوں کہ وہ بہت ہلکا اور خوشبو اچھی ہے۔''

تشریح: اپنے بھائیوں اور رفقاء کو ہدیہ اور تحفہ دینے کو اسلام پسند کرتا ہے۔ یہ آپس کے تعلقات کے خوش گوار ہونے کی علامت ہے۔ اور اس سے تعلقات اور میل اور محبت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اگر ہدیہ خلوص و محبت کے ساتھ پیش کیا جائے تو اس کے قبول کرنے پر کوئی قباحت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اگر محسوس ہو کہ اس کے پیچھے جذبات مخلصانہ نہیں ہیں تو اس کے قبول کرنے سے معذرت کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہدیہ اتنا قیمتی ہے کہ محسوس ہو کہ اس سے ہدیہ پیش کرنے والا زیر بار ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے اس کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں بھی ہدیہ قبول کرنے سے معذرت کی جاسکتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ہدیہ میں کوئی شخص پھول پیش کرتا ہے تو اسے واپس نہیں کرنا چاہیے بلکہ بہ طیبِ خاطر اسے قبول کرلینا چاہیے۔ اس سے ہدیہ دینے والے کو خوشی ہوگی اور یہ ہدیہ ایسا نہیں ہے جس کی وجہ سے ہدیہ دینے والے کے زیر بار ہونے کا اندیشہ کیا جاسکے۔ یہ ایک ہلکا پھلکا ہدیہ ہے اور ہلکا ہونے کے باوجود بہترین تحفہ ہے کیوں کہ خوشبو سے دلوں کو ایک خاص فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

〈۲〉 وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَنْ اُعْطِیَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْیَجْزِ بِہٖ وَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَلْیُثْنِ فَاِنَّ مَنْ اَثْنٰی فَقَدْ شَکَرَ وَ مَنْ کَتَمَ فَقَدْ کَفَرَ. (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کسی شخص کو کوئی چیز (بہ طورِ ہدیہ) دی جائے اور وہ اس کا بدلہ دینے کی قدرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کو اس کا بدلہ دے۔ رہا وہ شخص جو بدلہ دینے پر قادر نہ ہو تو وہ ہدیہ دینے والے کی تعریف کرے کیوں کہ جس

نے تعریف کی اس نے شکر ادا کیا اور جس کسی نے چھپایا (محسن کے احسان کو ظاہر نہیں ہونے دیا) اس نے کفرانِ نعمت کیا۔''

تشریح: ہدیہ دینے والے کا یہ حق ہے کہ ہم ہدیہ قبول کر کے خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ ہم بھی اس کے جواب میں اپنی طرف سے اسے کوئی نہ کوئی ہدیہ لازماً پیش کریں۔ اور اس طرح ہم اس کے شکرگزار رہوں۔ لیکن اگر ہم اس پوزیشن میں اپنے کو نہیں پاتے کہ ہدیہ دینے والے کو بدلہ میں کچھ دے سکیں تو کم از کم ہدیہ پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں اور ہدیہ دینے والے شخص کے لیے اپنی زبان سے کچھ تعریف کے کلمات ہی ادا کر دیں۔ اگر ہم یہ بھی نہیں کرتے اور تعریف و تحسین کے ذریعہ سے اس کا شکر ادا نہیں کرتے تو اسے احسان ناشناسی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صُنِعَ اِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ جَزَاکَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت اسامہ ابن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کے ساتھ کوئی احسان کیا جائے اور وہ احسان کرنے والے کے حق میں یہ الفاظ کہے: جَزَاکَ اللّٰهُ خَيْرًا (خدا تجھے اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے) تو اس نے (اپنے محسن کی) کامل تعریف کی۔''

تشریح: جَزَاکَ اللّٰهُ خَيْرًا (خدا تجھے اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے) بہ ظاہر ایک دعائیہ کلمہ ہے۔ لیکن حدیث میں اسے بلیغ ثنا یعنی کامل تعریف اور تحسین سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ دراصل احسان کرنے والے کے حق میں دعا کرنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس احسان کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ کسی کے احسان کی قدر شناسی خواہ وہ احسان کسی بھی شکل میں کیا گیا ہو محسن کی تعریف و توصیف ہی قرار پائے گی۔

نبی ﷺ خود ہدیہ قبول کرتے تھے اور اس کا بدلہ بھی عطا فرماتے تھے۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقْبَلُ الْهَدِيَّةَ وَ يُثِيْبُ عَلَيْهَا. (بخاری)

﴿۴﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُتِيَ بِبَاکُوْرَةِ الْفَاکِهَةِ وَضَعَهَا عَلٰى عَيْنَيْهِ وَ عَلٰى شَفَتَيْهِ وَ قَالَ اَللّٰهُمَّ كَمَا اَرَأَيْتَنَا اَوَّلَهٗ فَاَرِنَا اٰخِرَهٗ ثُمَّ يُعْطِيْهَا مَنْ يَّكُوْنُ عِنْدَهٗ مِنَ الصِّبْيَانِ. (البیہقی فی الدعوات الکبیر)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی نیا پھل پیش کیا جاتا تو اس کو اپنی آنکھوں اور ہونٹوں پر رکھتے اور فرماتے: ''اے اللہ جس طرح تو نے ہمیں اس پھل کا آغاز دکھایا اسی طرح اس کا انجام بھی دکھا۔'' اس کے بعد وہ پھل ان بچوں کو دے دیتے جو اس وقت آپؐ کے پاس ہوتے۔

تشریح: تازہ پھل کو آنکھوں پر رکھنے اور ہونٹوں سے اسے مس کرنے کا اصل مقصد خدا کی تازہ نعمت کی تعظیم وتکریم ہے۔ اس موقع پر آپ جو یہ دعا کرتے کہ اے اللہ جس طرح تو نے ہمیں اس پھل کا آغاز دکھایا اسی طرح اس کا انجام بھی دکھا۔ یعنی ہمیں اس کا موقع عنایت فرما کہ آغاز سے ہی بہرہ مند نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ تیری نعمتوں سے فیض یاب ہوسکیں۔ بلکہ یہ دنیا تو در حقیقت تیری عنایت کی ابتدا ہے جس کا انجام عالمِ آخرت ہے۔ دنیا میں جو تیری نوازشیں ہوسکتی ہیں ہم ان ہی کے نہیں بلکہ آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی نعمتوں کے بھی ہم تجھ سے خواست گار ہیں۔ خدایا! جس طرح دنیا میں تو نے ہمیں یہ نعمت دی ہے، آخرت میں بھی یہ نعمت ہم دیکھ سکیں۔ یہ بہتر ابتدا کسی خوشتر انجام کی اطلاع ہے۔ ہم نیک انجام اور تیری نوازش ہائے بے پایاں سے کیوں کر بے نیاز ہوسکتے ہیں۔

بچے بھی نئے اور تازہ ثمر کے مانند ہوتے ہیں۔ تازگی تازگی کو زیادہ زیب دیتی ہے۔ نیا پھل بچے کو دینے میں بہترین ذوق وبصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

〈۵〉 وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاهْدٰی لَهٗ هَدِیَّةً عَلَیْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَاباً عَظِیْمًا مِّنْ اَبْوَابِ الرِّبَا. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی شخص کے لیے سفارش کی تو اگر اس نے اس سفارش کرنے والے کو کوئی ہدیہ پیش کیا اور اس نے اس کو قبول کرلیا تو وہ سود کے بہت بڑے دروازے تک جا پہنچا۔''

تشریح: یعنی بدترین قسم کی سودخوری کی طرف اس کے قدم بڑھے ہیں۔ اس سے ناجائز انتفاع کی راہ کھلتی ہے۔ ناجائز انتفاع کے لیے ناروا سفارشیں بھی کی جانے لگتی ہیں۔ سودخوری کی ذہنیت بھی یہی ہوتی ہے کہ آدمی بالکل خود غرض ہوکر رہ جاتا ہے۔ اور اپنی خود غرضی کے آگے اسے روا اور ناروا کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کا دل جذبۂ ترحم سے بالکل خالی ہوجاتا ہے۔ اور ہم

جانتے ہیں کہ جذبۂ ترحم اور محبت اسلامی معاشرے کی اصل روح ہے، جس کی حفاظت کرنی ہر مومن شخص کا اولین فریضہ ہے۔

عاریت (مستعار)

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ کَانَہٗ فَزَعٌ بِالْمَدِیْنَۃِ فَاسْتَعَارَ النَّبِیُّ ﷺ فَرَسًا مِنْ اَبِیْ طَلْحَۃَ یُقَالُ لَہُ الْمَنْدُوْبُ، فَرَکِبَ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ مَا رَأَیْنَا مِنْ شَیْءٍ وَ اِنْ وَجَدْنَاہُ لَبَحْرًا. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار مدینہ میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی تو نبی ﷺ نے ابوطلحہ انصاریؓ سے ان کے گھوڑے جسے مندوب کہتے تھے عاریتاً مانگا اور آپؐ اس پر سوار ہوکر چلے گئے (اس طرف تشریف لے گئے جدھر سے خطرے کا اندیشہ تھا)۔ پھر جب آپؐ واپس آئے تو فرمایا: ''ہم نے کچھ نہیں دیکھا (یعنی اندیشہ کی کوئی بات نہیں ہے، لوگ مطمئن رہیں) اور ہم نے اس (گھوڑے) کو بحر رواں پایا۔''

تشریح: لوگوں کو کسی وجہ سے شبہ ہوا کہ دشمن لشکر آ گیا ہے۔ اس کی وجہ سے مدینہ میں اضطراب پیدا ہوگیا۔

مندوب کے معنی ہوتے ہیں سست رفتار۔ یعنی اس گھوڑے کی رفتار کوئی تیز نہ تھی۔

اس حدیث سے حضور ﷺ کی شجاعت کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خطرے کے باوجود صورت حال کی تحقیق کے لیے اکیلے باہر نکل گئے۔ اور واپس آ کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے باہر نکل کر دیکھ لیا ہے۔ خبر غلط تھی کوئی دشمن ہم پر حملہ آور نہیں ہوا ہے۔

اس حدیث سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کو اپنی ذمہ داری کا کس قدر احساس تھا۔ سست گھوڑا نہایت تیز رفتار ہوگیا یہ آپؐ کی برکت ہے۔

اس حدیث سے عاریتاً کسی سے کچھ لینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی چیز عاریتاً دینا ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ اس کی طرف سے غفلت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ معاشرہ نہایت ہی خودغرض ہوگا جہاں کوئی کسی کے کام نہ آتا ہو جہاں لوگوں کو صرف اپنا ہی مفاد عزیز ہو۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ الْعَارِیَۃُ مُؤَدَّۃٌ وَالْمِنْحَۃُ مَرْدُوْدَۃٌ وَالدَّیْنُ مَقْضِیٌّ وَالزَّعِیْمُ غَارِمٌ (ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ’’مستعار چیز واپس کی جائے، منحہ کا واپس کرنا بھی ضروری ہے۔ قرض ادا کیا جائے اور ضامن کے لیے ضمانت کی ادائیگی لازمی ہے۔‘‘

تشریح: یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لی تو کسی سے کوئی چیز مستعار لیکن اس پر قبضہ کرکے بیٹھ رہے اور اسے واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

منحہ اس جانور، زمین اور درخت وغیرہ کو کہتے ہیں جو کسی کو عاریتاً دی جائے تاکہ ان سے دودھ، پھل وغیرہ سے فائدہ حاصل کرلے۔ منحہ میں صرف منفعت کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس لیے فائدہ اٹھانے کے بعد اسے اس کے اصل مالک کے حوالہ کردینا چاہیے۔ یہ فیاضی اور حوصلہ مندی کی بات ہے کہ آدمی کسی کو اپنی کوئی چیز فائدہ اٹھانے یا اسے استعمال کرنے کے لیے بلامعاوضہ دیدے مثلاً گائے یا بکری دودھ پینے کے لیے، باغ پھلوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔ منحہ کے طور پر جو چیز ملی ہو اسے اپنی ملک نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ دستور کے مطابق فائدہ اٹھا کر چیز اصل مالک کو واپس کردینا چاہیے۔

ہبہ

﴿۱﴾ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّہٗ کَانَ مَعَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ سَفَرٍ فَکَانَ عَلٰی بَکْرٍ لِّعُمَرَ صَعْبٍ فَکَانَ یَتَقَدَّمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَیَقُوْلُ اَبُوْہُ یَا عَبْدَ اللّٰہِ لَا یَتَقَدَّمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم اَحَدٌ فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِعْنِیْہِ فَقَالَ عُمَرُ ھُوَ لَکَ فَاشْتَرَاہُ ثُمَّ قَالَ: ھُوَ لَکَ یَا عَبْدَ اللّٰہِ فَاصْنَعْ بِہٖ مَا شِئْتَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور وہ حضرت عمرؓ کے ایک سرکش اونٹ پر سوار تھے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سے آگے بڑھ جاتا تو ان کے والد (حضرت عمرؓ) فرماتے کہ اے عبداللہ کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے نہ بڑھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمرؓ سے) فرمایا: ’’اسے میرے ہاتھ فروخت کردو۔‘‘ حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ تو آپؐ ہی کا

ہے۔ آپؐ نے اسے خرید لیا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”اے عبداللہ! یہ تمہارا ہے جو چاہو کرو۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم و توقیر ہر موقع اور ہر حالت میں ضروری ہے۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے اسے پسند نہیں کیا کہ کسی کی سواری آپؐ کی سواری سے آگے نکل جائے۔

آپؐ نے خریدے ہوئے اونٹ کو حضرت عبداللہؓ کو دے دیا۔ اور واضح فرمایا کہ یہ اونٹ تمہارا ہے۔ تم جو چاہو کرو۔ اسے سواری کے لیے اپنے پاس رکھ سکتے ہو اور جیسا چاہو اسے کسی کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتے ہو۔ کیوں کہ اب یہ تمہاری ملک ہے۔

ہبہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی خوشی سے اپنی کوئی چیز کسی شخص کو تبرعاً دے دے۔ مکان، لباس، درہم و دینار کوئی بھی چیز ہبہ کر سکتے ہیں۔ ہبہ اور ہدیہ شرعاً مستحب ہے۔ یہ ایسی نیکی ہے جس کی خدا نے ترغیب دلائی ہے۔ حضور ﷺ نے بھی فرمایا ہے: مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَ اَنْ يُّنْسأَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ (بخاری) ”جو اپنے رزق میں فراخی اور کشادگی کی مسرت سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہے اور یہ کہ دیر تک اس کا تذکرہ رہے اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔“

ہبہ کی شرائط میں سے ہے کہ موہوب لہ یعنی جسے کوئی چیز ہبہ کی گئی ہو وہ اسے قبول کرے۔ اور اسے اپنے قبضہ میں لے لے۔ اگر قبضہ میں لینے سے پہلے واہب فوت ہو گیا تو موہوب لہ کا اس میں کوئی حق نہیں رہے گا۔ ورثاء اس کے حق دار ہوں گے۔

〈۲〉 وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اَلْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَقِيْءُ ثُمَّ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهٖ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”ہبہ کر کے اسے واپس لینے والا اس کُتّے کی طرح ہے جو قے کرے پھر اسے کھائے۔“

تشریح: یعنی ہبہ کر کے واپس لینا نہایت ہی گری ہوئی اور گھناونی حرکت ہے۔ اس کے قبح کو آپؐ نے ایک مثال سے واضح فرمائی۔

〈۳〉 عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْعُمْرٰى جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا وَالرُّقْبٰى جَائِزٌ لِاَهْلِهَا. (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”عمریٰ، عمریٰ والوں کے لیے جائز ہے۔ اور رقبیٰ، رقبیٰ والوں کے لیے جائز ہے۔“

تشریح: اگر کوئی شخص کسی کو اپنا مکان یہ کہہ کر دیتا ہے کہ جب تک تم زندہ ہو اس سے فائدہ اٹھاؤ مثلاً مکان میں رہائش اختیار کرو۔ باغ کی آمدنی سے فائدہ اٹھاؤ۔ یہ ہبہ عمریٰ ہے۔ شریعت نے اسے جائز ٹھہرایا ہے۔ اگر کوئی علی الاطلاق ہبہ کرتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ یہ مکان تمھیں عمریٰ کے طور پر دے رہا ہوں تو یہ مکان موہوب لہ کا ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کے وارثوں کو ملے گا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: اَلْعُمْرٰی لِمَنْ وُھِبَتْ لَہٗ (بخاری) ''عمریٰ اس کے لیے ہے جسے ہبہ کیا گیا۔'' اگر ہبہ کرنے والا یوں کہتا ہے کہ یہ چیز تمھیں دے رہا ہوں تمھاری زندگی تک کے لیے تو یہ مالک کو واپس ہو جائے گا۔ چناں چہ صحیح مسلم میں ہے: فَاَمَّا اِذَا قَالَ ھِیَ لَکَ مَا عِشْتَ فَاِنَّھَا تَرْجِعُ اِلٰی صَاحِبِھَا.

رقبیٰ کی مثال یہ ہے جیسے کوئی کہے کہ تمہاری زندگی تک میرا یہ مکان تمہارا ہے، اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو میرا مکان مجھے واپس ہو جائے گا اور اگر میں پہلے دنیا سے چلا گیا تو یہ مکان تمہارے ہی پاس رہے گا۔ رقبیٰ کو حضور ﷺ نے پسند نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے کہ دونوں فریق کو ایک دوسرے کی موت کا انتظار رہے گا۔ شیطان ان میں سے کسی کو کسی غلط اقدام پر بھی آمادہ کر سکتا ہے۔ جمہور علماء اسی لیے رقبیٰ سے منع کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ہبہ رقبیٰ کرتا ہے تو اس پر عمریٰ کے احکام نافذ ہوں گے۔ اگر واہب نے علی الاطلاق رقبیٰ کیا ہے تو موہوب لہ اور اس کے ورثاء اس کے مالک ہوں گے۔ اور اگر واہب نے واپسی کی شرط عائد کر دی ہے تو یہ ہبہ واپس ہو سکتا ہے بہ صورتِ دیگر واپس نہیں ہوگا۔

نبی ﷺ نے عمریٰ اور رقبیٰ سے روکا بھی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے اپنی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثا اس کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ اس لیے بغیر کسی ناگزیر تقاضے کے خواہ مخواہ اپنے آپ کو مالی نقصان میں مبتلا کرنا دین میں مطلوب نہیں ہے۔ کبھی کبھی جذبات کی رو میں ایک کام کر جاتا ہے لیکن آگے چل کر وہ سخت پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے کاموں میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے جن میں کسی سخت آزمائش اور فتنہ کا اندیشہ ہو۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَایَرْجِعُ اَحَدٌ فِیْ ھِبَتِہٖ اِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَلَدِہٖ. (نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص اپنے ہبہ کو

واپس نہ لے صرف باپ کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے اپنے کئے ہوئے ہبہ کو لے لے۔"

تشریح: باپ بیٹے کے باہمی تعلق کی نوعیت عام تعلقات کی نوعیت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے جس طرح باپ بہ وقت ضرورت اولاد کے مال سے اپنے اوپر خرچ کرسکتا ہے اسی طرح جو چیز اس نے اپنے بیٹے کو بطور ہبہ دی ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

﴿۵﴾ عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍؓ قَالَ انْطَلَقَ بِیْ اَبِیْ یَحْمِلُنِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِشْهَدْ اَنِّیْ قَدْ نَحَلْتُ النُّعْمَانَ کَذَا وَ کَذَا مِنْ مَّالِیْ فَقَالَ اَکُلَّ بَنِیْکَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ قَالَ لَا. قَالَ فَاشْهِدْ عَلٰی هٰذَا غَیْرِیْ ثُمَّ قَالَ: اَیَسُرُّکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا لَکَ فِی الْبِرِّ سَوَاءً؟ قَالَ بَلٰی قَالَ: فَلَا اِذًا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ میرے باپ مجھے اُٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول، آپؐ گواہ رہیں کہ میں نے نعمان کو فلاں فلاں چیز اپنے مال میں سے ہبہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا اپنے ہر ایک بیٹے کو ایسے ہی دیا ہے جیسے نعمان کو دیا ہے؟" میرے باپ نے کہا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "پھر میرے سوا کسی دوسرے کو اس پر گواہ کرلو۔ پھر فرمایا: "کیا تم کو اس سے خوشی ہوگی کہ تمہارے ساتھ نیکی کرنے میں سب برابر ہوں؟" کہا کہ ہاں، کیوں نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر ایسا نہ کرو (کہ ایک کو دو اور ایک نہ دو)۔"

تشریح: "پھر میرے سوا کسی دوسرے کو اس پر گواہ کرلو۔" یعنی میں اس جور و ظلم پر گواہ کیسے بن سکتا ہوں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اپنی اولاد کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز کرنا بہت ہی نامناسب بات ہے۔ جس طرح باپ اپنی اولاد سے اچھے سلوک کی امید اور آرزو رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسے بھی چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ اگر کوئی چیز دے تو اپنی سب اولاد کو دے۔ ایک کو دینا اور دوسرے کو محروم رکھنا اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

وقف

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ اَنَّ عُمَرَ اَصَابَ اَرْضًا بِخَیْبَرَ فَاَتَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ

يَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَصَبْتُ اَرْضًا بِخَيْبَرَ لَمْ اَصُبْ مَالًا قَطُّ اَنْفَسَ عِنْدِیْ مِنْهُ فَمَا تَاْمُرُنِیْ بِهٖ؟ فَقَالَ: اِنْ شِئْتَ حَبَّسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ اَنَّـهٗ لَايُبَاعُ اَصْلُهَا وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ وَ تَصَدَّقَ بِهَا فِی الْفُقَرَآءِ وَفِی الْقُرْبٰی وَفِی الرِّقَابِ وَفِیْ سَبِيْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَالضَّيْفِ، لَاجُنَاحَ عَلٰی مَنْ وَلِيَهَا اَنْ يَّاْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اَوْ يُطْعِمَ غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ (ان کے والد) حضرت عمرؓ کو خیبر کی کچھ زمین (مالِ غنیمت کے تقسیم کے موقع پر) ملی تو وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ، مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے کہ اس سے بہتر اور عمدہ مال مجھے کبھی نہیں ملا ہے۔ آپؐ اس کے بارے میں مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اگر چاہو تو ایسا کرو کہ اصل زمین کو وقف کردو۔ اور اس کی پیداوار صدقہ قرار دے دو۔'' چناں چہ حضرت عمرؓ نے اس کو (اسی طرح وقف کرکے) صدقہ قرار دے دیا کہ اصل زمین نہ تو فروخت کی جائے، نہ ہبہ کی جائے، نہ اس میں وراثت جاری ہو اس کی آمدنی خرچ ہو فقیروں اور اہلِ قرابت پر اور غلاموں کو آزاد کرانے کی مد میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں اور مہمانوں کی خدمت میں ـــــ اور اس کا متولی (منتظم) اس میں سے دستور کے مطابق کھائے۔ اور (اپنے عیال کو) کھلائے۔ بہ شرطے کہ وہ اس کے ذریعے سے مال اکٹھا کرنے اور مال دار بننے والا نہ ہو۔

تشریح: خیبر کی فتح کے موقع پر وہاں کی زمین کا تقریباً نصف حصہ نبی ﷺ نے مجاہدین میں تقسیم فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے حصہ میں زمین کا جو قطعہ آیا۔ وہ انھیں بہت قیمتی محسوس ہوا۔ خیبر کی زمین عام طور پر زرخیز تھی۔ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ خیبر کی اس زمین کو جو ان کے حصے میں آئی تھی خدا کی راہ میں دے دیں۔ اور خدا کی خوشنودی حاصل کریں۔ اس کے لیے بہتر صورت کیا ہوسکتی ہے، اس کے لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے رہ نمائی کے طالب ہوئے۔ آپؐ نے مشورہ دیا کہ وہ اس زمین کو وقف کردیں تاکہ وہ صدقہ جاریہ ہوجائے۔ اس مشورہ کے بعد حضرت عمرؓ اسے وقف کردیتے ہیں۔ اور اس کی آمدنی کے مصارف بھی انھوں نے متعین کردیے۔ یہ مصارف تقریباً وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہوتے ہیں (دیکھیں سورۃ التوبہ: ۶۰) جائداد کے

متولی کے بارے میں فرمایا کہ وہ کھانے پینے اور اپنے اہل وعیال یا مہمانوں کو کھلانے کے لیے دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔ اس کی غرض دولت مند بننے کی نہیں ہونی چاہیے۔

وقف سے وقف شدہ چیز محفوظ ہو جاتی ہے۔ اسے نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں وراثت قائم ہو سکتی ہے۔ اس کی آمدنی فی سبیل اللہ متعین مد میں ہی صرف ہو گی۔ اعلان وقف یا شے موقوف کو موقوف علیہ کے سپرد کرنے سے وقف لازم ہو جاتا ہے۔ اب نہ اسے فسخ کر سکتے ہیں اور نہ اسے فروخت یا ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ وقف کرنے کے بعد شے موقوف واقف (وقف کرنے والے) کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور ہمیشہ کے لیے صدقۂ جاریہ قرار پاتی ہے۔ اگر وقف شدہ زمین وغیرہ سے کسی وجہ سے فائدہ حاصل کرنا ممکن نہ رہے تو بعض علماء کے نزدیک اسے فروخت کر کے اس کی قیمت اسی طرح کے کاموں میں صرف کرنی چاہیے جس طرح کے کاموں کے لیے واقف نے اسے وقف کیا تھا۔ وقف کے سلسلے میں تفصیلی مسائل فقہ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اسلام سے پہلے اہل عرب وقف کے تصور سے واقف نہ تھے جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

〈۲〉 وَعَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ رضی اللہ عنہ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّیْ مَاتَتْ فَاَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اَلْمَآءُ فَحَفَرَ بِئْرًا وَقَالَ هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ. (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت سعد بن عبادہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول، میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ تو (ان کے حق میں) کون سا صدقہ زیادہ بہتر ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''پانی'' چناں چہ انھوں نے ایک کنواں کھدوایا اور کہا کہ یہ ام سعد (سعد کی ماں) کے لیے ہے۔

تشریح: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا جس وقت انتقال ہوا ہے اس وقت وہ والدہ کے پاس موجود نہیں تھے بلکہ وہ کسی سفر میں تھے۔ سفر سے واپسی پر وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ اگر میں والدہ کے پاس ہوتا تو وہ آخرت کے لیے صدقہ وغیرہ کی وصیت ضرور کرتیں۔ میں ایصالِ ثواب کی غرض سے صدقہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کس طرح کا صدقہ ان کے لیے زیادہ ثواب کا باعث ہو سکتا ہے؟ نبی ﷺ نے انھیں کنواں کھودوانے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ انھوں نے ایسی جگہ جہاں کنویں کی

ضرورت تھی کنواں کھدوا دیا۔ اور اسے اس غرض سے وقف کر دیا کہ اس کا ثواب ان کی والدہ کو پہنچتا رہے۔ بعض روایات میں باغ وقف کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ کنواں اسی باغ میں کھدوایا ہو اور دونوں کو ایصالِ ثواب کے مقصد سے وقف کیا ہو۔

معلوم ہوا کہ ایصالِ ثواب کا تصور غیر اسلامی ہرگز نہیں ہے۔ کسی مرنے والے شخص کو ثواب پہنچانے کی غرض سے نیک کام کیا جا سکتا ہے۔

قرض

﴿۱﴾ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ. (احمد)

ترجمہ: حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس کسی کا کسی شخص پر کوئی حق (قرض وغیرہ) ہو اور وہ اس (کے وصول کرنے) میں تاخیر سے کام لے تو اسے (دی ہوئی مہلت کے) ہر روز کے بدلہ میں صدقہ کا ثواب ملے گا۔‘‘

تشریح: دولت کا یہ ایک اہم استعمال ہے کہ ضرورت مندوں کو قرض دے کر ان کی مدد کی جائے۔ قرض دینے کا اجر و ثواب صدقہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ قرض دینے میں یہ اندیشہ بہ ہر حال رہتا ہے کہ ممکن ہے قرض کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے۔ اور اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ کوئی ایسی افتاد آ پڑے کہ قرض میں دی ہوئی رقم خطرے میں پڑ جائے۔ اس کے برعکس صدقہ کر کے آدمی یکسو اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ سے اجر و ثواب کا امیدوار ہوتا ہے۔ اسے کسی قسم کا خوف یا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔

اس حدیث میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ قرض دار کے ساتھ انتہائی شریفانہ اور نرمی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اگر وہ مقروض کو زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے تاکہ قرض کے ادا کرنے میں اسے سہولت ہو تو یہ بھی ایک نیک عمل ہے اور اس کی دی ہوئی مہلت کا ہر روز اس کے لیے صدقہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں خود غرضی، سخت دلی اور بے رحمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام اور مادہ پرستانہ نظریہ میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ مادّہ پرستانہ ذہن کو کسی ایسے عمل

سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جس میں اس کا کوئی محسوس مادی فائدہ نہ ہو۔ اس کے برخلاف اسلام زندگی میں جس چیز کو اہمیت دیتا ہے وہ انسان کا اخلاق و کردار ہے۔ اعلیٰ اخلاق و کردار کی توقع مادہ پرستانہ فکر و نظر سے نہیں کی جاسکتی۔ انسان کے لیے دنیا میں اللہ کو جو اعمال پسند ہیں وہ وہی ہیں جو اگر کسی شخص میں پائے جائیں تو اس کے کردار کی بلندی اور اس کی شخصیت کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

〈۲〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''شہید کا ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے مگر قرض معاف نہیں ہوگا۔''

تشریح: ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ رَجُلاً قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ وَ عَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يُقْضٰى دَيْنُهٗ (احمد، شرح السنۃ) ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو۔ پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو۔ اور اس کے ذمہ قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کردیا جائے۔'' یعنی بار بار کی شہادت کی موت بھی اس کے قرض کا کفارہ نہیں ہوسکتی۔

نبی ﷺ نے جہاں ایک طرف قرض دار شخص کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے وہیں دوسری طرف آپؐ نے یہ بھی ظاہر فرما دیا ہے کہ مقروض قرض کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھے۔ اسے قرض کے ادا کرنے کی طرف سے تساہل اور غفلت سے ہرگز کام نہ لینا چاہیے۔ اسے پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قرض سے جلد سے جلد سبکدوش ہوجائے۔ وہ جان لے کہ قرض کی وجہ سے وہ جنت میں داخل نہ ہوسکے گا۔ قرض لے کر اس کے ادا کرنے کی طرف سے بےفکر رہنا نہایت غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ جنت کی پاکیزہ فضا وہ کیسے پاسکیں گے جن کے اذہان وقلوب اخلاق و کردار کے ذریعہ سے پاکیزگی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔

〈۳〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُؤْتٰى بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفّٰى عَلَيْهِ

الدَّیْنُ فَیُسْئَلُ: "هَلْ تَرَکَ لِدَیْنِهٖ قَضَآءً" فَاِنْ حُدِّثَ اَنَّهٗ تَرَکَ وَفَاءً صَلّٰی وَ اِلَّا قَالَ لِلْمُسْلِمِیْنَ "صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ" فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْفُتُوْحَ قَامَ قَالَ: اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَتَرَکَ دَیْنًا فَعَلَیَّ قَضَاءُهٗ وَ مَنْ تَرَکَ مَالاً فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی ایسے شخص کا جنازہ لایا جاتا جس پر قرض ہوتا تو آپؐ دریافت فرماتے کہ "کیا اس شخص نے اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟" اگر بتایا جاتا کہ یہ شخص اتنا مال چھوڑ کر مرا ہے کہ جس سے اس کا قرض ادا کیا جاسکتا ہے تو آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھ لیتے۔ اور اگر یہ نہ بتایا جاتا تو آپؐ مسلمانوں سے فرماتے کہ "تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔" پھر جب اللہ نے آپ پر فتوحات کے دروازے کھولے تو آپؐ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: "میں اہل ایمان پر خود ان کی اپنی جانوں سے بڑھ کر حق رکھتا ہوں۔ لہٰذا جو مومن شخص اس حالت میں انتقال کرے کہ اس پر قرض ہو تو اس کا قرض ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔ اور جو شخص مال چھوڑ کر انتقال کرے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے۔"

تشریح: یہ کسی کے لیے کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ خدا کا رسول موجود ہو اور وہ اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کردے۔ مقروض میت کی نماز جنازہ پڑھنے سے آپؐ کے انکار کرنے کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح لوگوں کو تنبیہ ہوگا کہ مقروض ہو کر دنیا سے جانا کتنا سنگین قسم کا جرم ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یہ راز بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کے دل میں ترحم کا جذبہ پیدا ہوگا اور مرنے والے کے قرض کے ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی۔ چناں چہ روایت میں آتا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کیا اور کہا کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو تو حضرت علیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ عَلَیَّ دَیْنُهٗ "اس کا قرض ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔" پھر آپؐ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (شرح السنہ)

ایسے ہی ایک موقع پر جب کہ مرنے والا تین دینار کا مقروض تھا۔ اور اس نے اپنے پیچھے کچھ چھوڑا بھی نہ تھا کہ اس سے اس کا قرض ادا کیا جاسکتا۔ آپؐ نے نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا اور کہا کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ حضرت قتادہؓ نے عرض کیا: صَلِّ عَلَیْهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ عَلَیَّ دَیْنُهٗ (بخاری) "یا رسول اللہ، آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ اس کا قرض

کی کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔"

پھر جب جنگی فتوحات کے بعد مالی کشادگی اور فراوانی حاصل ہوئی اور عسرت کا زمانہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ مرنے والے کے ذمہ اگر قرض ہے تو اسے ادا کرنا میرے ذمہ ہے۔ بلکہ ایک روایت میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِاَھْلِہٖ وَمَنْ تَرَکَ دَیْنًا اَوْ ضَیَاعًا فَاِلَیَّ وَ عَلَیَّ (مسلم) "جس نے اپنے پیچھے مال چھوڑا تو وہ اس کے اہل وعیال کو ملے گا اور جس کسی نے اپنے پیچھے قرض یا چھوٹے کمزور بچے وغیرہ چھوڑے ہیں تو وہ قرض میری طرف منتقل ہوگا اور بچوں وغیرہ کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہے۔"

(۴) وَعَنْ اَبِی الْیُسْرِؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْہُ اَظَلَّہُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوالیسرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: "جو شخص تنگ دست کو مہلت دے یا اپنا قرض معاف کر دے تو اللہ اسے اپنے سایے میں جگہ عنایت کرے گا۔"

تشریح: یعنی خدا کی رحمت اس پر سایہ فگن ہوگی اور وہ ہر قسم کی تپش اور سختیوں سے مامون و محفوظ رہے گا۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جس شخص کا برتاؤ خدا کے کسی بندے کے ساتھ یہ ہو کہ وہ اسے پریشانیوں اور تکلیفوں سے بچانے کے لیے اگر وہ اس کا مقروض ہے تو زیادہ سے زیادہ مہلت دیتا ہے بلکہ اگر اسے محسوس ہوتا ہے کہ قرض ادا کرنا اس کے لیے آسان نہیں ہے تو اسے پریشانیوں سے بچانے کے لیے وہ اس قرض ہی کو معاف کر دیتا ہے جس کے بار سے وہ دبا ہوا تھا۔ اب جس شخص کا اخلاق اور طرزِ حیات یہ ہو کیا خدا اسے گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس سے مختلف رویہ اختیار کرے جو اس شخص کا بندگانِ خدا کے ساتھ رہا ہے۔

(۵) وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْہُ اَنْجَاہُ اللّٰہُ مِنْ کَرْبِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص (اپنا مطالبہ وصول کرنے میں) تنگ دست کو مہلت دے یا اپنا قرض معاف کر دے تو

اللہ اسے قیامت کے روز کی سختی سے نجات دے گا۔“

تشریح: قیامت کا دن نہایت ہول ناک اور سخت ہوگا۔ اس دن کی سختی سے وہی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں جو خود یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی سختی اور پریشانی میں مبتلا ہو۔ روز قیامت حقیقت میں ہماری زندگی کی حقیقی تصویر بن کر ہمارے لیے نمودار ہوگا۔ ہمارا حقیقی وجود اخلاقی ہے۔ اخلاق کے لحاظ سے ہم جیسے ہوں گے وہ دن بھی ہمارے لیے اسی کے مطابق خوش گوار یا ہول ناک اور روح فرسا ہوگا۔ جس شخص کا اخلاق یہ ہے کہ اُسے کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھنا پسند نہیں پھر خدا کیسے اسے گرفتار مصائب دیکھنا پسند کر سکتا ہے!

〈۶〉وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ یُرِیْدُ اَدَاءَ هَا اَدَّی اللّٰهُ عَنْهُ وَ مَنْ اَخَذَ یُرِیْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص لوگوں کے مال (قرض) لے اور ان کو ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ اس سے ادا کرا دیتا ہے۔ اور جو شخص لوگوں کے اموال قرض لے اور اس کا ارادہ ان کو ضائع کرنے کا ہو (ادا کرنے کی نیت نہ ہو) تو اللہ اس کو اس کے اس رویہ کی بنا پر تباہ اور ضائع کر دے گا۔“

تشریح: نیت اگر درست ہے تو خدا قرض کے ادا ہونے کا سامان کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس طرح سے یہ سامان ہوتا ہے کہ عقل حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن کسی نے اگر مال بہ طور قرض لے تو لیا لیکن نیت اس کی خراب ہوگئی۔ وہ اسے لوٹانے کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ بہت ہوشیار ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑے خسارے میں ڈال رہا ہے۔ وہ تو وقت پر کام آنے والے یعنی قرض دینے والے کو صرف مالی نقصان پہنچائے گا لیکن اپنے اس طرزِ عمل سے وہ خود کو جو نقصان پہنچائے گا مالی نقصان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے اس کی شخصیت تباہ ہو جائے گی، وہ بے کردار ہو جائے گا۔ کردار نہ ہو تو انسان کی حیثیت ایک مردہ کی ہوتی ہے جس میں جان نہیں ہوتی۔ اس مردے کو اپنے گھر میں رکھنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ پھر جس شخص کی تباہی کا ارادہ خدا کر لے اسے جس ذلت، نکبت اور خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا تو ہمارے لیے اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

〈۷〉 وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ یَّلْقَاہُ بِھَا عَبْدٌ بُعْدَ الْکَبَائِرِ الَّتِیْ نَھَی اللّٰہُ عَنْھَا اَنْ یَّمُوْتَ رَجُلٌ وَ عَلَیْہِ دَیْنٌ لاَ یَدَعُ لَہٗ قَضَاءً. (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ نے روکا ہے خدا کے نزدیک عظیم ترین گناہ جس کے ساتھ بندہ اس سے ملے یہ ہے کہ کوئی شخص اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کا قرض ادا ہو سکے۔''

تشریح: یعنی ان بڑے گناہوں کے بعد جن سے مسلمانوں کو بچنا چاہیے۔ اور جن سے باز رہنے کی اللہ نے تاکید فرمائی ہے، یہ عظیم ترین گناہ ہے کہ کوئی قرض کا بوجھ لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو اور جب وہ خدا سے ملے تو اس کا دامن اس سنگین قسم کے گناہ سے داغ دار دکھائی دے۔ ہر ایک مسلم شخص کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے کہ خدا اس سے خوش ہو کہ اس میرے بندے نے اپنی پوری زندگی سے میری اطاعت کی۔ کسی معاملہ میں اس نے میرے احکام کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور بندے کے دل میں یہ وجد آفریں جذبہ پایا جاتا ہو کہ آج وہ اپنے رب سے ملاقی ہے جس سے ملاقات کی تمنا اور انتظار میں اس کی زندگی گزری ہے۔ جس کی بے انتہا نوازشیں اس پر ہوئی ہیں آج اس کے دستِ رحمت سے بہ راہِ راست اور عیاں طور پر نعمت ہائے فراواں وہ حاصل کر سکے گا۔

〈۸〉 وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَطْلُ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔''

تشریح: جس کسی کے ذمہ قرض ہے اور وہ کسی تنگی میں بھی نہیں ہے۔ وہ واجب الادا رقم ادا کر سکتا ہے تو پھر اسے ادا نہ کرنا اور اس میں تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لینا صریحاً ظلم و زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اس کی ظاہری تنگی اور عسرت تو دور ہوگئی لیکن اس کے دل کی تنگی ابھی تک نہ گئی۔ ورنہ کیا چیز اس کے لیے قرض کے ادا کرنے میں مانع ہو سکتی

تھی۔ ایک شخص وقتِ ضرورت اس کے کام آیا اور اس نے اسے قرض دیا لیکن وہ اس کے احسان کو فراموش کر رہا ہے۔ احسان کا بدلہ تو احسان ہوتا ہے نہ کہ اُلٹے اپنے محسن کو پریشانی میں ڈالنا۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہم پر کتنے واجبات ہیں۔ خدا کے، اس کے دین کے، اعزہ و اقربا کے اور عامۃ الناس کے کتنے سارے حقوق اور واجبات ہیں جو ہمیں ادا کرنے میں وہ ہم پر قرض ہی کی طرح واجب ہیں جن کا ادا کرنا ہم پر فرض ہے۔ اگر ہم ان واجبات اور فرائض کو ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہوئے ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں تو عدل وانصاف کی نگاہ میں ہم ظالم قرار پاتے ہیں اب یہ ہماری ذمہ داری ہوتی ہے کہ ہم واجب الادا فرائض کو سمجھیں اور یہ دیکھیں کہ ہم ان کو کہاں تک ادا کر سکتے ہیں۔ جس حد تک بھی ہمارے اندر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سکت ہے اس سے غفلت برتنا ظلم ہوگا۔ اور ظلم کبھی بھی اچھے نتائج کا حامل نہیں ہوا کرتا۔ کیا خدا کا ہم پر یہ احسان نہیں ہے کہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور مختلف قسم کی نعمتوں سے ہمیں نوازا۔ اور ہماری ہدایت کا سامان فراہم کیا۔ کیا اب یہ اس کا ہمارے ذمہ قرض نہیں ہے کہ ہم احسان کا بدلہ احسان سے دیں اور اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہیں۔ کیا اس کے دین کا یہ حق نہیں ہے کہ ہم اس کے فروغ اس کی اقامت اور اس کے استحکام کی سعی وجہد میں اپنا حصہ ادا کریں۔

کیا والدین کا ہم پر قرض نہیں ہے کہ انھوں نے ہمارے لیے جو تکالیف برداشت کیں۔ انھوں نے صرف ہماری پرورش ہی نہیں کی بلکہ اپنی شفقت ومحبت سے ہمیں نوازنے میں بھی انھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اب کیا ہم پر یہ لازم نہیں ہوتا کہ اپنے نیک کردار اور خدمت سے ان کو راحت پہنچائیں اور انھیں ہرگز ملول اور رنجیدہ نہ ہونے دیں۔ اسی پر آپ دوسرے حقوق کے بارے میں بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کے ادا کرنے میں اگر غفلت اور کوتاہی ہوتی ہے تو اسے ظلم وستم کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

﴿۹﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَدْعُوْا فِي الصَّلٰوةِ وَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَاثَمِ وَالْمَغْرَمِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں دعا مانگتے تو فرماتے: ”اے اللہ میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ جب قرض اور گناہ سے بچنے کے لیے خدا کا رسولؐ خدا سے دعائیں مانگتا ہے تو ہمارے لیے بھی اس سے غافل رہنے کا کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھی گناہ اور قرض کی مصیبت سے بچنے کے لیے خدا سے دعا کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ خدا کی مدد کے بغیر نہ ہم کسی گناہ سے بچ سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت سے مامون ومحفوظ رہ سکتے ہیں۔ خدا ایک زندہ جاوید ہستی ہے۔ وہ سمیع وبصیر ہے۔ ہر چیز پر اسے قدرت حاصل ہے، جس کا بھی اس پر توکل ہوگا وہ ہر معاملہ میں اس کی طرف رجوع کرے گا اور اس سے مدد کا خواست گار ہوگا۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِؓ قَالَ کَانَ لِیْ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ دَیْنٌ فَقَضَانِیْ وَزَادَنِیْ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے ذمہ میرا قرض تھا تو آپؐ نے مجھے وہ قرض ادا کیا تو مجھے کچھ زیادہ دیا۔

تشریح: حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ''لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو قرض اکے دا کرنے میں سب سے اچھا ہو۔'' فَاِنَّ خَیْرَ النَّاسِ اَحْسَنُھُمْ قَضَاءً (مسلم) روایتوں میں کئی واقعات ایسے ملتے ہیں کہ آپؐ نے قرض کے ادا کرنے میں خوشتر اور بہتر انداز اختیار فرمایا اور اسی کا حکم آپؐ نے دوسرے کو بھی دیا۔ مثلاً آپؐ نے پائجامہ خریدا تو جس شخص سے آپؐ نے پائجامہ خریدا تھا اس کو طے شدہ قیمت سے زیادہ مال عنایت فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص کسی کا مطالبہ قرض وغیرہ ادا کرے اور اپنی طرف سے کچھ زیادہ ہی دیدے تو یہ درست ہے، یہ سود نہیں ہے۔ بہ شرطے کہ یہ زیادہ دینا مشروط نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص متعین مدت کے لیے کسی کو بہ طور قرض پانچ سو روپے دیتا ہے اور یہ شرط عائد کرتا ہے کہ واپسی کے وقت اسے بیس روپے مزید دینے ہوں گے تو یہ قطعاً حرام ہے۔

﴿۱۱﴾ وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: صَاحِبُ الدَّیْنِ مَاسُوْرٌ بِدَیْنِہٖ یَشْکُوْ اِلٰی رَبِّہِ الْوَحْدَةَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (شرح السنۃ)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے محبوس ہوگا۔ چناں چہ وہ قیامت کے روز اپنی تنہائی کی شکایت اپنے رب سے کرے گا۔''

تشریح: یعنی وہ صالحین کی صحبت اور رفاقت سے محروم ہوگا۔ مقروض ہونے کی وجہ سے اسے تنہائی کی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ قید تنہائی کی پریشانی اور اضطراب کی شکایت وہ قیامت کے روز خدا سے کرے گا۔ لیکن جب تک قرض کے ادا ہونے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوگی اسے اس مصیبت سے نجات نہ مل سکے گی۔ ایک دوسری روایت میں جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں۔ آپؐ کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: نَفسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَیْنِهٖ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْهُ (شافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ) ''مومن کی روح اپنے قرض کی وجہ سے معلق رہتی ہے (اُدھر میں پڑی رہتی ہے) جب تک کہ اس کا قرض چکا نہ دیا جائے۔''

قید تنہائی کی مصیبت خواہ عالمِ برزخ میں پیش آئے یا عالمِ آخرت میں بڑی وحشت خیز مصیبت ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین صالحین کو نہ عالمِ برزخ میں تنہائی کی مصیبت پیش آئے گی اور نہ عالمِ آخرت میں وہ اس مصیبت سے دوچار ہوں گے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ کوئی بے جا اور غیر ضروری اخراجات کے لیے نہیں بلکہ اپنی ناگزیر ضروریات اور حقوق واجبہ کے ادا کرنے کے لیے بہ قدرِ ضرورت قرض لیتا ہے۔ اس کی نیت قرض ادا کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر قرض ادا کرنے سے پہلے اس کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی بات دوسری ہے۔ توقع ہے کہ خدا قرض خواہوں کو اپنی عطا کے ذریعہ سے راضی کر کے اسے قرض سے سبک دوش کر دے گا۔ تنہائی کے عذاب سے اسے بچا لے گا۔ اسلامی حکومت یا مسلم حکمراں اور مسلم معاشرہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے قرض کے ادا کرنے کا سامان کرے اور قرض کے بارگراں سے اس کی روح کو نجات دلائے۔

ودیعت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَدِّ الْاَمَانَةَ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَکَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَکَ. (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے تمہیں امین بنایا اس کی امانت ادا کرو اور جو کوئی تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔''

تشریح: یعنی جس نے تم پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے تم اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔ اگر اس نے

تمہارے پاس حفاظت کی غرض سے کوئی چیز یا رقم وغیرہ رکھی ہے تو تم اس کے طلب کرنے پر فوراً اسے لوٹا دو۔ اگر کسی نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہو تو تم انتقاماً بھی اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ اگر تم خیانت کرتے ہو تو تم بھی اسی طرح خائن ٹھہرو گے۔ مومن خیانت کا مرتکب ہو کر کبھی بھی اپنی سیرت کو داغ دار نہیں کرسکتا۔ وہ دنیا میں سب سے بڑھ کر جس کی حفاظت کرتا ہے وہ اس کی سیرت اور کردار ہی ہے۔

ودیعت اس مال کو کہتے ہیں جو حفاظت کی غرض سے کسی کے پاس رکھا جائے تا کہ مال رکھنے والا جب چاہے اپنا مال واپس لے سکے۔ ودیعت جس کو عام اصطلاح میں امانت کہتے ہیں اس کے ضائع ہونے کی صورت میں مودع (جس کے پاس امانت رکھی گئی ہو) ضامن نہیں ہوتا بہ شرطے کہ امانت کی حفاظت میں اس نے کوئی کوتاہی نہ کی ہو۔

حجر

〈۱〉 عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّ رَجُلاً عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَبْتَاعُ وَفِیْ عَقْدَتِهٖ ضُعْفٌ فَاَتٰی اَهْلَهٗ نَبِیَّ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالُوْا يَا نَبِیَّ اللّٰهِ اِحْجُرْ عَلٰی فُلاَنٍ فَاِنَّهٗ يَبْتَاعُ وَ فِیْ عَقْدَتِهٖ ضُعْفٌ فَدَعَاهُ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَنَهَاهُ عَنِ الْبَيْعِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ لاَ اَصْبِرُ عَنِ الْبَيْعِ فَقَالَ صلی اللہ علیہ وسلم اِنْ كُنْتَ غَيْرَ تَارِكٍ لِلْبَيْعِ فَقُلْ هَاءَ وَهَاءَ وَلاَ خِلاَبَةَ. (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خرید و فروخت کیا کرتا تھا، اس کی عقل میں فتور تھا تو اس کے اعزہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص پر حجر کیجیے (تا کہ اس کا کوئی تصرف صحیح نہ ہو) کیوں کہ وہ سودا کرتا ہے جب کہ اس کی عقل میں فتور ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور خرید و فروخت سے اس کو روک دیا۔ اس نے کہا اے اللہ کے رسول، مجھ سے صبر نہ ہوگا کہ میں خرید و فروخت سے باز آجاؤں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو معاملہ کرتے وقت یہ کہا کرو اس معاملہ میں فروخت اور چکمہ نہیں ہے۔''

تشریح: کسی شخص کو کم عمری یا جنون یا کم عقلی یا افلاس کی وجہ سے تصرفات مالی سے روک دینے کو حجر کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ. (نساء:۵) ''اور اپنے مال جسے اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، بدعقلوں کو نہ دو، ہاں انھیں اس میں کھلاتے اور پہناتے رہو۔''

دوسری جگہ ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (نساء:۶) ''اور یتیموں کو جانچتے رہو یہاں تک کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں، تو پھر اگر تم دیکھو کہ ان میں سمجھ بوجھ آ گئی ہے تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔''

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ پر مالی تصرف کی پابندی لگادی تھی جب کہ وہ مقروض ہو گئے تھے۔ پھر آپؐ نے ان کے مال میں سے پورا قرض ادا فرمایا۔ (دارقطنی، حاکم)

جس شخص کے سلسلہ میں نبی ﷺ سے درخواست کی گئی تھی کہ ان پر خرید و فروخت کرنے کی پابندی لگادیں اور لوگوں کو مطلع کر دیں کہ وہ ان سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ نہ کریں۔ یہ حضرت حبان بن منقذؓ تھے جیسا کہ ابن حجر اور امام نوویؒ نے اپنی شرح میں اس کی صراحت کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ اپنے لوگوں پر کس درجہ مہربان تھے۔ امکان کی حد تک آپؐ لوگوں کی رعایت فرماتے تھے۔

تاوان

⟨۱⟩ عَنْ جَسْرَةَ بِنْتِ دَجَاجَةَ قَالَتْ: قَالَتْ عَائِشَةُ رضی اللہ عنہا مَارَأَيْتُ صَانِعًا طَعَامًا مِثْلَ صَفِيَّةَ صَنَعَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ طَعَامًا فَبَعَثَتْ بِهٖ فَاَخَذَنِیْ اَفْكَلٌ فَكَسَرْتُ الْاِنَاءَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا كَفَّارَةُ مَاصَنَعْتُ؟ قَالَ: اِنَاءٌ مِثْلُ اِنَاءٍ وَ طَعَامٌ مِثْلُ طَعَامٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: جسرہ بنت دجاجہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو ایسا کھانا پکاتے نہیں دیکھا جیسا صفیہؓ رسول ﷺ کے لیے پکاتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار آپؐ کے لیے

کھانا بھیجا مجھے غیرت آ گئی (کہ میری باری کے موقع پر کیوں کھانا بھیجا) میں نے برتن توڑ ڈالا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، جو یہ حرکت مجھ سے ہوئی اس کا کفارہ کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''برتن کا بدلہ اسی جیسا برتن ہے اور کھانے کا بدلہ اسی جیسا کھانا ہے۔''

تشریح: یعنی حضرت عائشہ کو غیرت آئی کہ حضور ﷺ ان کے یہاں تشریف رکھتے ہیں اور آپؐ کے لیے کھانا کہیں اور سے آئے۔ اس موقع پر آپؐ نے سامعین صحابہؓ سے فرمایا غَارَتْ اُمُّکُمْ ''تمہاری ماں کو غیرت آ گئی۔''

اگر کوئی شخص کسی کی چیز کو نقصان پہنچاتا یا اسے ضائع کر دیتا ہے تو اس سے اس کا تاوان لیا جائے گا۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ نقصان کے بدلے میں نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے۔ صرف تاوان اس کا بدلہ ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ اُنَاسٍ مِّنْ آلِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ صَفْوَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: یَا صَفْوَانَ هَلْ عِنْدَکَ سَلَاحٌ؟ قَالَ: عَارِیَةً اَوْ غَصْبًا؟ قَالَ: لَا بَلْ عَارِیَةً. فَاَعَارَهُ مَابَیْنَ الثَّلَاثِیْنَ اِلَی الْاَرْبَعِیْنَ دِرْعاً وَ غَزَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ حُنَیْنًا فَلَمَّا هُزِمَ الْمُشْرِکُوْنَ جُمِعَتْ دُرُوْعُ صَفْوَانَ فَفُقِدَ مِنْهَا اَدْرَاعًا. فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ لِصَفْوَانَ اِنَّا قَدْ فَقَدْنَا مِنْ اَدْرَاعِکَ اَدْرَاعًا فَهَلْ نَغْرُمُ لَکَ قَالَ: لَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لِاَنَّ فِیْ قَلْبِی الْیَوْمَ مَالَمْ یَکُنْ یَوْمَئِذٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: آل صفوان کے بعض لوگوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے صفوان، کیا تمہارے پاس کچھ ہتھیار ہوں گے؟'' کہا: عاریتاً چاہتے ہیں یا زبردستی؟ آپؐ نے فرمایا: ''زبردستی نہیں، بلکہ عاریتاً چاہیے۔'' صفوان نے تیس سے چالیس تک زرہیں آپ کو دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حنین کی جنگ کی۔ پھر جب مشرکین کو شکست ہوئی تو صفوان کی زرہیں اکٹھا کی گئیں۔ ان میں سے کچھ زرہیں کھو چکی تھیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے صفوان، ہم سے تمہاری کچھ زرہیں کھو گئی ہیں۔ کہو تو اس کا تاوان تمہیں دے دیں؟'' انھوں نے عرض کیا کہ نہیں یارسول اللہ، میرے دل میں وہ بات اب نہیں ہے جو اس دن (یعنی پہلے) تھی۔

تشریح: یعنی اب میں مسلمان ہو گیا ہوں، پہلی جیسی حالت اب نہیں ہے۔ میں آپؐ سے تاوان نہیں لوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کسی کا نقصان ہوا ہو وہ چاہے تو تاوان معاف کر سکتا ہے۔

قحط

〈۱〉 عَنْ عَبَّادِ بْنِ شُرَحْبِيلٍ قَالَ اَصَابَتْنِي سَنَةٌ فَدَخَلْتُ حَائِطًا مِّنْ حِيطَانِ الْمَدِيْنَةِ فَفَرَكْتُ سُنْبُلاً فَاَكَلْتُ وَ حَمَلْتُ فِي ثَوْبِي فَجَاءَ صَاحِبُهُ فَضَرَبَنِي وَ اَخَذَ ثَوْبِي فَاَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهُ مَا عَلَّمْتَ اِذْ كَانَ جَاهِلاً وَلاَ اَطْعَمْتَ اِذْ كَانَ جَائِعًا اَوْ قَالَ سَاغِبًا وَ اَمَرَهُ فَرَدَّ عَلَيَّ ثَوْبِي وَ اَعْطَانِي وَسَقًا اَوْ نِصْفَ وَسَقٍ مِنْ طَعَامٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: عباد بن شرحبیلؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے قحط نے ستایا تو میں مدینہ کے باغوں میں سے ایک باغ میں گیا اور ایک خوشہ کو پکڑ کر کھایا اور اپنے کپڑے میں کچھ پھل باندھ لیے۔ اتنے میں باغ کا مالک آ گیا۔ اس نے مجھے مارا اور میرا کپڑا چھین لیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپؐ نے اس (باغ والے) سے فرمایا: ''یہ جاہل تھا تو تم نے اسے مسئلہ سکھایا نہیں۔ اور یہ بھوکا تھا تم نے اس کو کھلایا نہیں۔'' آپؐ کے حکم سے اس نے میرا کپڑا مجھے واپس کر دیا اور اس نے مجھے ساٹھ صاع یا تیس صاع اناج دیے۔

تشریح: یعنی تمہیں اس کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا چاہیے تھا۔ تم اس کو سمجھاتے کہ یہ نادان ہے۔ تم سمجھاتے کہ اس طرح کسی کے باغ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بھوکے اور مجبور کے ساتھ اور خاص طور پر قحط کے زمانے میں ہمارا رویہ نرمی اور ہمدردی کا ہونا چاہیے۔ پھر بھوکے کو کھانا کھلانا اور اس کی بھوک دور کرنا جس طرح ضروری ہے اسی طرح جو بے خبر اور نادان ہو اس کو دین کی تعلیمات سے باخبر کرنا بھی ہمارا فرض ہوتا ہے۔

قانونِ وراثت

کسی مسلمان کے انتقال کے بعد اس کا چھوڑا ہوا مال یا جائداد اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اسلام میں اس سلسلہ کے احکام واضح انداز میں دیے گئے ہیں۔ فرائض میراث کے ان حصوں کو کہتے ہیں جو قرآن یا حدیث میں ورثاء کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ کسی

شخص کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ کو حق داروں کی طرف منتقل کرنے کو وراثت کہتے ہیں۔ اس سلسلہ کی چند اصطلاحوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ذوی الفروض: وہ افراد جن کا میت سے نسبی تعلق ہو اور ترکہ میں شریعت نے ان کا حصہ متعین کیا ہو۔

عصبہ: جن کا میت سے نسبی تعلق مرد کے واسطے سے ہو۔ ذوی الفروض کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچتا ہو وہ ان کا ہوگا۔

ذوی الارحام: جن کا تعلق میت سے عورت کے واسطے سے ہو۔ مثلاً خالہ، نواسی وغیرہا۔

حقیقی بھائی بھن: میت کی اولاد ہوں، جن کی ماں بھی ایک ہو۔

علاتی بھائی بھن: جو میت کی محض باپ شریک اولاد ہوں۔

اخیافی بھائی بھن: جو میت کی محض ماں شریک اولاد ہوں۔

محجوب: جو کسی وارث کی موجودگی کی وجہ سے وارث قرار نہ پا سکے۔ اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اس کا حصہ کم ہو جاتا ہو یا اسے سرے سے کوئی حصہ نہ مل سکے۔

اصول: میت کے باپ، دادا، پردادا۔

فروع: میت کے بیٹے، پوتے، بیٹی اور پوتی۔

مرنے والے کا مال وارثوں میں تقسیم کرنے سے قبل تین چیزوں کا خرچ نکال لیں گے۔ تجہیز و تکفین کے مصارف، قرض اگر ہے تو اسے ادا کرنا اور وصیت کی تکمیل۔ ترکہ کی تقسیم سے پہلے قرض ادا کرنا اور وصیت کی تکمیل ضروری ہے۔ شریعت نے وارثوں کے جو حصے مقرر کیے ہیں اسی کے مطابق ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض وجوہ سے کوئی وارث ترکہ میں حصہ پانے کا حق دار نہیں رہتا یا اس کا حصہ کم ہو جاتا ہے۔

بالکل محروم ہونے کے اسباب:

۱- **کفر:** رشتہ ہونے کے باوجود نہ تو مسلمان کافر کا وارث ہوگا اور نہ کافر مسلمان کا وارث قرار پائے گا۔

۲- **قتل:** کوئی اگر جان بوجھ کر کسی شخص کے قتل کا مرتکب ہوا ہے تو وارث ہونے کے باوجود اس مقتول کی وراثت میں حصہ نہیں پا سکتا۔

۳-غلام: نہ غلام کا وارث کوئی آزاد شخص ہوتا ہے اور نہ غلام ہی کسی آزاد شخص کا وارث قرار پاسکتا ہے۔ غلام خواہ مکمل ہو یا ناقص وہ نہ وارث ہوتا ہے اور نہ موروث۔ لیکن بعض علماء نے موخر الذکر کو مستثنیٰ ٹھہرایا ہے۔ ان کے نزدیک جس حد تک وہ آزاد ہو چکا ہے اس کے مطابق وہ وارث اور موروث ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کے اس غلام کے متعلق جس کا کچھ حصہ آزاد ہو چکا ہے۔ (فی العبد یعتق بعضہ) روایت کیا ہے: یَرِثُ وَ یُوْرَثُ عَلٰی قَدْرِ مَا عُتِقَ مِنْهُ (المغنی) ''آزادی کے بہ قدر وہ وارث اور موروث ہوگا۔''

۴-زنا: زنا زادہ اپنے والد کا وارث نہیں قرار پائے گا۔ اور نہ اس کا باپ ہی اس کا وارث ہوگا۔ البتہ وہ اپنی ماں کا وارث ہوگا اور اس کی ماں اس کی وارث ہوگی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفَرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ''اولاد صاحب بستر کی ہے اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔''

۵- لعان: شوہر و بیوی نے اگر لعان کیا ہے تو اس صورت میں بیٹا باپ کا اور باپ اس بیٹے کا وارث نہیں ہوسکتا۔

۶-مردہ پیدا ہونا: وضع حمل کے وقت اگر بچے کے منہ سے آواز نہیں نکلی اور وہ مردہ پیدا ہوتا ہے تو نہ وہ وارث ہوگا اور نہ موروث۔ کیوں کہ وراثت کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ ذوی الفروض وہ ورثاء ہیں جن کے لیے حصے شریعت نے مقرر کردیے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں چار مرد ہیں اور آٹھ عورتیں:

۱-باپ ۲-دادا خواہ اوپر کے درجے کے ہوں جیسے پردادا ۳-اخیافی بھائی (یعنی ماں شریک بھائی) ۴-شوہر ۵-بیوی ۶-ماں ۷-جدہ (دادی یا نانی) خواہ اوپر کے درجے کی ہوں جیسے پردادی ۸-بیٹی ۹-پوتی ۱۰-حقیقی بہن ۱۱-علاتی بہن (سوتیلی، باپ شریک) ۱۲-اخیافی بہن (یعنی ماں شریک بہن)۔

دادا، دادی اور نانی، حقیقی بہن اور علاتی اصل حق دار نہیں۔ دادا باپ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ باپ کی موجودگی میں وہ میراث کا حق دار نہ ہوگا۔ اسی طرح دادی اور نانی درحقیقت ماں کی

قائم مقام ہیں۔ باپ کی موجودگی میں بھی دادی کا حق نہیں ہوتا۔ بہن میراث میں دراصل بیٹی کی قائم مقام ہوتی ہے۔

عصبات: عصبات میں وہ ورثاء آتے ہیں جن کے حصے مقرر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ذوی الفروض ورثاء کے حصول یعنی سہام سے بچا ہوا مال ان کا ہوتا ہے۔ یہ ورثاء بالترتیب چار ہیں:

(۱) بیٹا پھر پوتا، پر پوتا (یا اس کے نیچے کے درجے کے) (۲) باپ پھر دادا پھر پردادا (یا اس کے اوپر کے درجے کے) (۳) حقیقی اور سوتیلے بھائی اور ان کے بیٹے (اگرچہ نیچے کے درجے کے ہوں) (۴) چچا پھر چچا کا بیٹا پھر اس کا پوتا۔

باپ ذوفرض ہے لیکن میت کا بیٹا وغیرہ نہ ہو تو اس کا باپ عصبہ بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح بھائی کو باپ وغیرہ نہ ہونے پر حصہ ملے گا۔ چچا اس صورت میں حق پائے گا جب کہ بھائی وغیرہ نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بیٹی کے ساتھ بیٹا بھی ہے یا پوتی کے ساتھ پوتا بھی ہے یا غیر اخیافی کے ساتھ اس کا بھائی بھی ہو تو ان صورتوں میں بیٹی، پوتی اور بہن عصبہ ہو جاتی ہیں۔ ذوی الفروض نہیں رہتیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر بہن کے ساتھ بیٹی ہو تو بہن عصبہ قرار پائے گی۔

ان چاروں کی ترتیب یہ ہے۔ پہلے درجہ کا کوئی عصبہ موجود ہے تو باقی تینوں درجوں کے عصبات ترکہ میں حصہ دار نہ ہوں گے۔ پہلے درجے کے عصبات نہیں ہیں مگر دوسرے درجے کا کوئی عصبہ ہے تو تیسرے اور چوتھے درجے کے عصبات حصہ نہ پاسکیں گے۔

(۱) میت کی بیٹی، پوتی، پر پوتی (خواہ اس سے بھی نیچے کے درجے کی اولاد ہو)۔ یعنی میت کے نواسہ، نواسی، میت کے بیٹے کا نواسہ، نواسی۔ میت کے نواسہ کا بیٹا بیٹی، میت کی نواسی کا بیٹا بیٹی۔ میت کے پوتے کے نواسہ نواسی۔

(۲) دادا فاسد، دادی فاسدہ اور نانی فاسدہ (خواہ یہ اوپر کے درجے کے ہوں)۔ دادا فاسد سے مراد وہ ہے جس کے اور میت کے درمیان عورت کا واسطہ پایا جاتا ہو جیسے میت کا نانا اور میت کی دادی یا نانی کا باپ۔ دادی فاسدہ یا نانی فاسدہ اس دادی یا نانی کو کہیں گے جس کے اور میت کے درمیان دادا فاسد کا واسطہ پایا جاتا ہو۔ جیسے نانا کی ماں اور دادی یا نانی کے باپ کی ماں۔ یہ سب ذوی الارحام ہیں۔ جب کہ دادا صحیح اور دادی و

نانی صحیحہ ذوی الفروض ہیں۔

(۳) حقیقی بہنوں کی اولاد، سوتیلی بہنوں کی اولاد، اخیافی بہنوں کی اولاد، اخیافی بھائی کی اولاد، حقیقی بھائی کی بیٹیاں، سوتیلے بھائی کی بیٹیاں۔

(۴) پھوپھیاں خواہ حقیقی ہوں یا سوتیلی اور اخیافی ہوں۔ اخیافی چچا، ماموں اور خالائیں۔ عصبات کی طرح ان کی بھی ترتیب ہے اور وہ یہ ہے کہ ذوی الارحام کا ترکہ میں حصہ نہ ہوگا۔ اسی طرح درجہ دوم کی موجودگی میں درجہ سوم اور چہارم کے ذوی الارحام کا حصہ نہ ہوگا۔ اور تیسرے درجہ کے ذوی الارحام کی موجودگی میں چوتھے درجہ کے ذوی الارحام محروم قرار پائیں گے۔

ذوی الفروض کے حصے: میت کے ترکے میں باپ کا حصہ چھٹا ہے جب کہ میت کا بیٹا یا پوتا یا پرپوتا موجود ہو۔ اگر ان کے بجائے بیٹی یا پوتی یا پرپوتی موجود ہو تو باپ چھٹا حصہ پائے گا اور وہ عصبہ بھی ہوگا اور اگر میت کا باپ موجود نہ ہو تو اس کا دادا باپ کے مانند ہوگا۔

اخیافی بھائی اور اخیافی بہن کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا بہ شرطے کہ وہ ایک ہو۔ اگر وہ دو یا دو سے زیادہ ہیں تو ان کے لیے تہائی حصہ ہے جو ان میں برابر برابر تقسیم ہوگا۔ میت کے باپ یا دادا یا اس کے بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں اخیافی بھائی بہن ترکہ میں حصہ نہ پائیں گے۔

بیوی کے مرنے پر ترکہ میں شوہر کا نصف حصہ ہے بہ شرطے کہ مرنے والی کی کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر اولاد بیٹا بیٹی یا بیٹے کی اولاد ہو تو شوہر صرف چوتھائی کا مستحق ہوگا۔

خاوند کے مرنے پر اگر وہ بے اولاد ہے تو اس کے ترکے میں بیوی کو چوتھائی ملے گا۔ اولاد ہونے پر وہ صرف آٹھواں حصہ کی حق دار ہوگی۔ اگر بیویاں کئی ہیں تو وہ اس حصہ کو باہم برابر برابر تقسیم کرلیں گی۔

میت کے ترکے میں ماں کا چھٹا حصہ ہے بہ شرطے کہ میت کے اولاد یا اولاد کی اولاد یا ایک بہن یا دو بھائی اور دو بہن یا دو سے زائد بھائی بہن ہوں (خواہ حقیقی بھائی بہن ہوں یا سوتیلے اور اخیافی موجود ہوں) اگر ان میں سے کوئی موجود نہیں ہے تو ماں کو کل ترکہ کا تہائی ملے گا۔ اگر ماں کے ساتھ باپ اور خاوند یا بیوی بھی ہو تو ایسی صورت میں خاوند یا بیوی کو حصہ دے کر جو باقی بچے گا اس میں ماں کو تہائی ملے گا۔ دادی یا نانی کا حصہ چھٹا ہے۔

میت کی بیٹی میراث سے کبھی محروم نہیں ہوتی۔ اگر میت کا بیٹا موجود ہے تو وہ عصبہ بن جاتی ہے ورنہ ذوی الفروض رہتی ہے۔ میت کی اگر صرف ایک بیٹی ہے اور اس کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے تو ترکہ سے اسے نصف ملے گا۔ اگر کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو باقی نصف بھی اسی کے حصے میں آئے گا۔ بیٹیاں اگر دو یا دو سے زائد ہوں اور ان کا کوئی حقیقی یا سوتیلا بھائی نہیں ہے تو ان بیٹیوں کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ جسے وہ باہم برابر برابر تقسیم کرلیں گی۔ بیٹیوں کے ساتھ اگر میت کا بیٹا موجود ہے تو میت کے ترکہ میں جس قدر بیٹے کو ملے گا اس کا نصف ہر بیٹی پائے گی۔

اگر میت کے صرف ایک پوتی ہو تو اسے ترکہ میں سے نصف ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ پوتیاں ہیں تو کل ترکہ کا تہائی انھیں ملے گا جسے وہ باہم برابر برابر تقسیم کرلیں گی۔ اگر میت کے بیٹا یا پوتا یا پر پوتا نہیں ہے ایک بیٹی ہے تو اس صورت میں پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا۔

اگر میت کی اولاد ہو یا اس کے بیٹے کی اولاد ہو خواہ وہ نیچے ہی کے درجے کی ہو تو اخیافی بہن بھائی ترکہ میں حق دار نہیں ہوں گے۔ اسی طرح میت کے باپ دادا کی موجودگی میں بھی اخیافی (ماں شریک) بہن بھائی محروم قرار پائیں گے۔

اگر میت کے صرف ایک حقیقی بہن ہے تو وہ بیٹی کے قائم مقام ہوگی۔ حقیقی بہن بھی نہ ہو تو سوتیلی بہن اس کے قائم مقام ہوگی۔

میت کی بیٹی، پوتی، پر پوتی کی موجودگی میں حقیقی بہن عصبہ ہو جاتی ہے۔ حقیقی بہن نہ ہو تو سوتیلی بہن عصبہ قرار پائے گی۔ میت کے حقیقی بھائی کی موجودگی میں سوتیلے بھائی بہن کا حصہ نہیں ہوتا۔

اگر میت کی ایک حقیقی بہن ہے تو اس کی موجودگی میں سوتیلی بہن چھٹا حصہ پائے گی۔ اگر حقیقی بہن ایک سے زیادہ ہیں تو سوتیلی بہن کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ اگر سوتیلی بہن کے ساتھ سوتیلا بھائی بھی ہے تو سوتیلی بہن کا حصہ ساقط نہ ہوگا۔ سوتیلی بہن سوتیلے بھائی کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی۔

میت کے بیٹا یا پوتا یا پر پوتا موجود ہو تو میت کا حقیقی بھائی بہن اور سوتیلے بھائی بہن محروم رہیں گے۔ اسی طرح میت کے باپ دادا کی موجودگی میں حقیقی یا سوتیلے بھائی بہن محروم رہیں گے۔

قرآن میں چھ مقرر حصوں کا ذکر

نصف حصہ اس کے حق دار پانچ ہوتے ہیں:

۱- خاوند بہ شرطے کہ مرنے والی کی اولاد یا اولاد کی اولاد نہ ہو۔

۲- بیٹی بہ شرطے کہ وہ اکیلی ہو۔

۳- پوتی جب وہ اکیلی ہو۔ اس کا کوئی بھائی نہ ہو۔

۴- حقیقی بہن جب کہ میت کا بھائی، باپ، بیٹا اور پوتا نہ ہو۔

۵- پدری بہن (یعنی علاتی) کو جب کہ وہ اکیلی ہو۔ میت کا بھائی، باپ، بیٹا اور پوتا نہ ہو۔

چوتھائی حصہ- اس کے حق دار دو ہوتے ہیں:

۱- خاوند اگر مرنے والی کی اولاد یا اولاد کی اولاد نہ ہو۔

۲- بیوی اگر مرنے والے خاوند کی اولاد یا اولاد کی اولاد نہ ہو۔

آٹھواں حصہ- صرف ایک فرد وارث ہوتا ہے:

۱- بیوی جب کہ خاوند کی اولاد یا اولاد کی اولاد ہو۔

دو تہائی- اس کے چار وارث ہوتے ہیں:

۱- دو یا زیادہ بیٹیاں جب کہ ان کے ساتھ میت کا بیٹا نہ ہو۔

۲- دو یا زیادہ پوتیاں جب کہ میت کی صلبی اولاد (بیٹے، بیٹیاں یا پوتا) نہ ہو۔

۳- دو یا زیادہ حقیقی بہنیں جب کہ میت کا باپ، صلبی اولاد اور حقیقی بھائی موجود نہ ہو۔

۴- دو یا زیادہ پدری بہنیں، جب کہ ان کے ساتھ میت کا باپ، صلبی اولاد اور حقیقی یا پدری (باپ شریک، علاتی) بھائی موجود نہ ہو۔

تہائی- تین افراد اس کے وارث ہوتے ہیں:

۱- ماں جب کہ میت کی اولاد یا اولاد کی اولاد نہ ہو، اور نہ اس کے دو یا زیادہ بھائی بہنیں ہوں۔

۲- دو یا زیادہ مادری بھائی (اخیافی) جب کہ میت کا باپ، دادا اور اولاد یا اولاد کی اولاد نہ ہو۔

۳- دادا جب کہ میت کے بھائی موجود ہوں اور ایک تہائی اس کے لیے وافر حصہ ہو۔ پھر بھی یہ اس صورت میں ہے جب کہ بھائیوں کی تعداد دو بھائیوں یا چار بہنوں سے زیادہ ہو۔

چھٹا حصہ-سات افراد اس کے حق دار ہوتے ہیں:

۱- ماں، جب کہ میت کی اولاد یا اولاد کی اولاد یا دو یا دو سے زیادہ حقیقی، علاتی یا اخیافی بھائی نہ ہوں۔ وہ وارث ہوں یا محجوب۔

۲- نانی۔ اگر میت کی ماں نہ ہو تو وہ اکیلی وارث ہوگی۔ اور اگر اس کے ساتھ دادی بھی ہو تو وہ دونوں سدس (چھٹے حصے) کو برابر برابر تقسیم کرلیں گی۔

۳- باپ علی الاطلاق چھٹے حصہ کا وارث ہوتا ہے۔ میت کی اولاد ہو یا نہ ہو۔

۴- دادا۔ یہ باپ کی عدم موجودگی میں اس کا قائم مقام ہونے کی وجہ سے وارث ہوتا ہے۔

۵- اخیافی بھائی بہن جب کہ میت کا باپ، دادا، اولاد اور اولاد کی اولاد نہ ہو۔ اور اخیافی بھائی یا اخیافی بہن اکیلی ہو۔

۶- پوتی یا پوتیاں جب کہ میت کی صرف ایک بیٹی ہو۔ نیز پوتی کا کوئی بھائی نہ ہو اور نہ ہی اس کے مساوی درجہ میں اس کے چچا کا کوئی بیٹا ہو۔

۷- علاتی بہن جب کہ اس کے ساتھ ایک حقیقی بہن موجود ہو۔ نیز اس کے ساتھ کوئی علاتی بھائی، ماں دادا، اور اولاد، یا اولاد کی اولاد نہ ہو۔

نوٹ: وراثت کے سلسلہ میں یہاں کچھ خاص باتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کے تفصیلی مسائل کے لیے فرائض کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں یا فرائض کے ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب ہم وراثت کے سلسلہ کی کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔

وراثت

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْحِقُوْا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِیَ فَهُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میراث کے حصے (جو قرآن میں متعین کیے گئے ہیں) حصہ داروں کو دو پھر جو کچھ بچے وہ قریب تر مرد کے لیے ہے (یعنی جو میت کا سب سے قریب تر عزیز ہو اس کا حق ہے)''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سے سب سے پہلے ان لوگوں کو دیا جائے گا جن کے حصے قرآن نے متعین کر دیے ہیں۔ جنھیں ذوی الفروض کہتے ہیں۔ انھیں دینے کے بعد جو

کچھ بچے گا وہ عصبات کا ہوگا۔ اور عصبات میں مقدم وہ ہے جو میت کا سب سے قریبی رشتہ دار ہو۔ قریب کے عزیز کی موجودگی میں بعید کا عصبہ ترکہ کا وارث نہ ہوگا۔

〈۲〉 وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنَّكُمْ تَقْرَؤُنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ وَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ وَ اِنَّ اَعْيَانَ بَنِى الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِى الْعَلَّاتِ. اَلرَّجُلُ يَرِثُ اَخَاهُ لِاَبِيْهِ وَ اُمِّهِ دُوْنَ اَخِيْهِ لِاَبِيْهِ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَ رِوَايَةِ الدَّارِمِيِّ قَالَ الْاِخْوَةُ مِنَ الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ بَنِى الْعَلَّاتِ اِلٰى آخِرِهٖ. (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت علیؓ نے (ایک روز) لوگوں سے فرمایا تم اس آیت کو پڑھتے ہو: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ (اس کے بعد کہ جو وصیت وہ کر جائیں وہ پوری کر دی جائے یا جو قرض ہو وہ چکا دیا جائے) جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: ''حقیقی بھائی وارث ہوتے ہیں، سوتیلے بھائی نہیں۔ اور یہ کہ آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے سوتیلے بھائی کا نہیں۔'' اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ دارمی کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا'' وہ بھائی جو ماں میں بھی شریک ہوں (یعنی ماں باپ دونوں میں شریک ہوں، حقیقی بھائی) ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں نہ کہ وہ بھائی جو صرف باپ میں شریک ہوں (یعنی سوتیلے بھائی)'' آگے حدیث کے الفاظ وہی ہیں جو اوپر نقل ہوئے ہیں۔

تشریح: اس حدیث میں جو آیت نقل کی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میراث کی تقسیم سے پہلے میت کی اگر کوئی وصیت ہے تو اسے پوری کریں اور اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہے تو اس کو ادا کر دیں۔ اس کے بعد ورثاء میں میراث تقسیم کی جائے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرض کی ادائیگی سے پہلے وصیت کی تکمیل کی جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ آیت میں وصیت کا ذکر اگر قرض سے پہلے آیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وصیت کی تکمیل قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے۔ بلکہ وصیت کا ذکر پہلے اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگوں کو تنبیہ ہو اور وہ وصیت کو ناقابلِ لحاظ چیز تصور نہ کریں۔

〈۳〉 وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: تَحُوْزُ الْمَرْاَةُ ثَلٰثَ

مَوَارِيثَ عَتِيقَهَا وَ لَقِيطَهَا وَ وَلَدَهَا الَّذِىْ لَاعَنَتْ عَنْهُ. (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت واثلہ ابن اسقعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت تین شخصوں کی وارث بنتی ہے: ایک تو اپنے آزاد کردہ غلام کی، دوسرے اپنے لقیط کی، اور تیسرے اپنے اس بچہ کی جس کی وجہ سے لعان ہوا ہو۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے ایک غلام آزاد کیا اور وہ آزاد کردہ غلام مرا اور اس کا کوئی نسبی عصبہ نہیں ہے تو یہ عورت اپنے آزادہ کردہ غلام کی اسی طرح وارث ہوگی جس طرح ایک مرد اپنے آزاد کیے ہوئے غلام کا وارث ہوتا ہے اگر اس کا کوئی نسبی عصبہ نہ ہو۔

لقیط سے مراد وہ بچہ ہے جو کہیں پڑا ہوا مل جائے۔ کسی عورت کو اگر کہیں کوئی لاوارث بچہ پڑا ہوا مل گیا اور اس نے اُسے اٹھالیا اور اس کو پالا پوسا تو اس لقیط کے مرنے کے بعد اس کی میراث وہی عورت پائے گی۔

بعض علماء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ البتہ قاضی کہتے ہیں کہ اس فقرہ کا منشا یہ ہے کہ لقیط کا چھوڑا ہوا مال اصلاً بیت المال کا حق ہوتا ہے۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ عورت جس نے لقیط اُٹھایا اور پالا پوسا اس کی زیادہ مستحق ہے کہ بیت المال کی طرف سے لقیط کا چھوڑا ہوا مال اس پر خرچ ہو۔

اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر تہمت لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے یہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے وہ میرا نہیں ہے اور بیوی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے کہ وہ بچہ ولد الزنا ہے۔ ایسی صورت میں اسلامی عدالت لِعان کے ذریعہ سے ان میں علیٰحدگی کرادے گی۔ لعان کا طریقہ سورۃ النور کے شروع ہی میں بیان ہوا ہے۔ اس میں شوہر چار شہادتیں دے گا کہ بہ خدا وہ بالکل سچا ہے اور پانچویں شہادت یہ کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ بیوی بھی چار شہادتیں دے گی کہ بہ خدا وہ بالکل جھوٹا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے گی کہ اس بندی پر خدا کا غضب ہو اگر وہ (یعنی اس کا شوہر اپنے دعویٰ میں) سچا ہو۔ لعان کے بعد ان میں علیٰحدگی کرادی جائے گی۔ بچہ عورت کے پاس رہے گا۔ شوہر چوں کہ بچہ کا باپ ثابت نہیں ہوتا اس لیے وہ اور وہ بچہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔ وراثت کا تعلق نسب سے ہوتا ہے۔ اِس بچہ کا نسب ماں سے ثابت ہے اس لیے وہ بچہ اور اس کی ماں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ یہی حکم ولد الزنا کے بارے میں بھی ہے۔

〈۴〉 وَعَنْ عَائِشَةَ رضؓ اَنَّ مَوْلٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَاتَ وَ تَرَكَ شَيْئًا وَلَمْ يَدَعْ حَمِيْمًا وَلَا وَلَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطُوْا مِيْرَاثَهٗ رَجُلًا مِّنْ اَهْلِ قَرْيَتِهٖ.
(ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک آزاد کردہ غلام مرا، اس نے کچھ مال چھوڑا تھا لیکن نہ تو اس نے کوئی رشتہ دار اپنے پیچھے چھوڑا اور نہ اولاد چھوڑی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اس کا چھوڑا ہوا مال اس کی بستی کے آدمی کو دے دو۔''

تشریح: چوں کہ اس آزاد کردہ غلام کا کوئی نسبی وارث نہیں تھا اس لیے اس کے مال کا حق دار اصلاً بیت المال ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کے مال کو اس کی بستی کے کسی ضرورت مند کو دلا دیا۔ اس میں ترکہ کی تقسیم کی اسپرٹ کی رعایت بھی ہوگئی۔

〈۵〉 وَعَنْ اَنَسٍ رضؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِبْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ. (بخاری مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''کسی قوم کا بھانجہ اسی قوم میں سے ہے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر اس بھانجے کے ذوی الفروض اور عصبات موجود نہیں ہیں تو ماموں اس کا وارث ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ ذوی الارحام میں سے ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ذوی الارحام اس صورت میں میت کے وارث ہوتے ہیں جب کہ ذوی الفروض اور عصبات موجود نہ ہوں۔

〈۶〉 وَعَنْ اَنَسٍ رضؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی قوم کا مولیٰ اسی قوم میں سے ہے۔''

تشریح: مولیٰ سے مراد وہ شخص ہے جس نے غلام کو آزاد کیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آزاد شدہ غلام کا وارث اس کا مولیٰ یعنی جس نے اسے آزاد کیا وہ ہوگا۔ اس کے برخلاف غلام آزاد شدہ اس شخص کا وارث نہیں ہوتا جس نے اسے آزاد کیا ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مولیٰ سے مراد آزاد کرنے والا آقا نہیں بلکہ وہ غلام ہے جسے آزاد کردیا گیا ہو۔ جس قبیلہ و فرد نے کسی غلام کو آزاد کیا ہے اس کی جو حیثیت ہوگی وہی

حیثیت اور درجہ اس آزاد شدہ غلام کو دیا جائے گا۔

〈۷〉 وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ اِذَا لَمْ تَكُنْ دُوْنَهَا اُمٌّ.
(ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دادی اور نانی کا چھٹا حصہ مقرر کیا ہے جب کہ ماں اسے محجوب نہ کردے۔

تشریح: میت کی ماں اگر زندہ نہیں ہے تو دادی اور نانی کو ترکہ سے چھٹا حصہ ملے گا۔ ماں کی موجودگی میں ان کا میت کے ترکہ میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

〈۸〉 وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَا اسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوَرِّثَ. (ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”اگر بچہ نے کوئی آواز نکالی ہو (اور پھر مرجائے) تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور اسے وارث قرار دیا جائے۔“

تشریح: آواز نکالنا چوں کہ زندگی کی علامت ہے اس لیے اس کا ذکر کیا گیا۔ بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کے پیٹ سے اگر آدھے سے زیادہ نکلا اور اس میں زندگی کے آثار پائے گئے مثلاً سانس، چھینک، آواز اور حرکت، اور پھر وہ مرگیا تو اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھیں گے اور اسے وارث قرار دے کر اس کی میراث تقسیم ہوگی۔

یہاں یہ مسئلہ بھی جان لینا چاہیے کہ ایک شخص مرجاتا ہے اور اس کا وارث ابھی حالتِ حمل میں ہے تو اس کا انتظار کریں گے اس کی میراث روک رکھی جائے گی۔ اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وارث قرار پائے گا اور اس کے بعد اس کی میراث اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگی اور اگر زندہ پیدا نہیں ہوتا تو وہ وارث نہیں ہوگا۔ میراث دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگی۔

〈۹〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَايَتَوَارِثُ اَهْلُ الْمِلَّتَيْنِ شَتّٰى. (ابوداؤد، ابن ماجہ، ورواہ الترمذی عن جابرؓ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دو مختلف مذہب رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔“

تشریح: غیر مسلم کسی مسلمان کا اور مسلمان کسی غیر مسلم کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں حقوق اور معاملات کی بنیاد بھی اصلاً اخلاق ہی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان دینی اختلاف کی وجہ سے جو دوری پائی جاتی ہے وہ اخلاقی لحاظ سے ایک کو دوسرے کا وارث ہونے میں مانع ہوتی ہے۔ دنیا میں تو انسانیت یا خوش خلقی وغیرہ کے تحت ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہوئے باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرسکتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد اصل حقیقت سامنے آجاتی ہے اور مہلت کا زمانہ بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ ایمان و اسلام کے ساتھ دوسرے رشتے بھی محترم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر دین کا رشتہ نہیں پایا جاتا تو دوسرے تمام رشتے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ اخلاقی غیرت اور دینی حمیت کے خلاف ہے کہ اختلاف مذہب کے باوجود آدمی ایک دوسرے کا وارث بن سکے۔

(۱۰) وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْقَاتِلُ لَایَرِثُ. (ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قاتل (مقتول کے مال کا) وارث نہیں ہوتا۔“

تشریح: اپنے مورث کو اگر کسی نے ناحق قتل کر دیا تو یہ قتل محض ایک شخص کا قتل نہیں ہے بلکہ قاتل نے اس رشتے کی حرمت کو بھی باقی نہیں رکھا جو ان دونوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔ اس صورت میں اس کے اپنے مقتول مورث کا وارث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۱۱) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَیُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ اَوْ اَمَةٍ فَالْوَلَدُ وَلَدُ الزِّنَاءِ لَایَرِثُ وَلَا یُوْرَثُ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کرے تو (اس کے نتیجہ میں) جو بچہ پیدا ہوگا وہ ولد الزنا (حرامی) ہوگا۔ نہ وہ (بچہ) کسی کا وارث ہوگا اور نہ اس کی میراث کسی کو ملے گی۔“

تشریح: وارث کا اصل تعلق نسب سے ہے۔ زانی اور ولد الزنا کے درمیان نسبت قائم نہیں ہوتا گو وہ اسی زانی کے نطفے سے پیدا ہوا ہو۔ اس لیے زانی ولد الزنا کا وارث نہیں ہوسکتا۔ البتہ ولد الزنا کی ماں اس کی وارث ہوگی اور وہ اپنی ماں کی میراث پائے گا۔

وصیت

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَا حَقُّ إمْرَءٍ لَهٗ شَیْءٌ یُرِیْدُ اَنْ یُوْصٰی فِیْهِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلاَّ وَصِیَّتُهٗ مَکْتُوْبَةٌ عِنْدَهٗ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلمان کے پاس کوئی چیز ہو جس کے سلسلہ میں وہ وصیت کرنی چاہتا ہے تو دو راتیں بھی نہ گزرنے پائیں کہ تحریری وصیت اس کے پاس موجود ہو۔''

تشریح: وصیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے ورثاء سے کہہ جائے کہ میرے بعد تمہیں یہ کام کرنا ہے مثلاً اتنی رقم صدقہ کرنی ہے۔ میرے ذمہ کچھ واجبات یا فرائض رہ گئے ہیں ان کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ ایسے موقع پر اگر وہ کچھ نصیحتیں کرتا ہے تو ان کو بھی وصیت کے معنی میں لیا جاتا ہے۔

وصیت کے لیے ضروری ہے کہ وصیت کرنے والا (موصی) عاقل ہو۔ اور جو وصیت وہ کر رہا ہے حلال و مباح ہو، حرام اور ناجائز نہ ہو۔ حرام ہونے کی صورت میں اس کا نفاذ نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ موصی اپنی وصیت سے رجوع یا اس میں تغیر و تبدل کرسکتا ہے۔ (یُغَیِّرُ الرَّجُلُ مِنْ وَصِیَّتِهٖ مَایَشَآءُ) جس شخص کے ورثاء موجود ہوں وہ اپنے ترکہ سے صدقہ وغیرہ کے لیے تہائی مال سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا۔

〈۲〉 وَعَنْ سَعْدٍؓ قَالَ: عَادَنِی النَّبِیُّ ﷺ فَقُلْتُ اُوْصِیْ بِمَالِیْ کُلِّهٖ فَقَالَ: لَا قُلْتُ فَالنِّصْفُ فَقَالَ: لَا فَقُلْتُ بِالثُّلُثِ. فَقَالَ: نَعَمْ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے میری عیادت فرمائی، اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ میں اپنے سارے مال کے لیے وصیت کر جاؤں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں۔'' میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کے لیے وصیت کر جاؤں؟ فرمایا ''نہیں۔'' میں نے عرض کیا تو پھر تہائی کے لیے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں اور تہائی بھی بہت ہے۔''

تشریح: ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: مَاحَقُّ إمْرَءٍ مُسْلِمٍ لَهٗ مَا یُوْصِیْ فِیْهِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلاَّ وَوَصِیَّتَهٗ مَکْتُوْبَةٌ عِنْدَهٗ. (بخاری، مسلم) ''جو مسلمان وصیت کرنی چاہتا ہے وہ دو راتیں بھی نہ گزارے الا یہ کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی ہو۔'' معلوم ہوا کہ جس کے ذمہ وصیت کے لائق

حقوق اور اموال ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ان حقوق اور اموال کے سلسلہ میں لکھی ہوئی وصیت اس کے پاس موجود رہے۔ ایسا نہ ہو کہ موت اچانک آ جائے اور وہ وصیت نہ لکھ سکے۔

بعض کے نزدیک وصیت مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ اور بعض کے نزدیک واجب ہے۔ لیکن اگر کسی شخص پر قرض ہو یا کوئی حق یا امانت ہو تو بالاتفاق وصیت واجب ہے۔ بہتر یہ ہوگا وصیت لکھ کر اس پر گواہ بنا کر گواہوں کے دستخط بھی لے لیے جائیں۔

اسی طرح کی ایک روایت میں نبیؐ کے یہ بیشتر الفاظ بھی نقل کیے گئے ہیں: اِنْ تَذَرْ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَاءَ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَّتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ ''اگر تم اپنے ورثاء کو اپنے پیچھے مال دار چھوڑ جاؤ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔''

حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ کاش لوگ تہائی سے گھٹا کر چوتھائی کی وصیت کریں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تہائی بہت ہے۔ (لَوْ اَنَّ النَّاسَ غَضُّوْا مِنَ الثُّلُثِ اِلَی الرُّبُعِ)۔ جمہور علماء تہائی سے کم کی وصیت کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے خمس (پانچویں حصے) کی وصیت کی تھی۔ اور ابن عمرؓ اور اسحاق نے ربع (چوتھائی) کی۔ بعض سدس (چھٹویں) کی اور بعض نے عشر (دسویں حصے) کی وصیت کی ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ جس کسی کے ورثاء زیادہ ہوں اس کے لیے سرے سے وصیت نہ کرنا ہی مستحب ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْأَةَ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّیْنَ سَنَةً ثُمَّ یَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّةِ فَتَجِبَ لَهُمَا النَّارُ. (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی مرد اور عورت ساٹھ سال اللہ کی اطاعت میں گزار دیتے ہیں پھر ان کے مرنے کا وقت آتا ہے: اور وہ وصیت کے ذریعہ سے ورثاء کو نقصان پہنچا جاتے ہیں تو ان دونوں کے لیے جہنم واجب ہو جاتا ہے۔''

تشریح: حضور ﷺ نے ایک مرد اور عورت کی مثال پیش فرماتے ہیں کہ وہ دونوں طویل مدت تک خدا کی اطاعت اور بندگی میں مصروف رہتے ہیں، لیکن دنیا سے جاتے جاتے اپنی وصیتوں

میں ناانصافی سے کام لے کر اپنے ورثاء کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی یہ طویل عرصہ تک اللہ کی عبادت واطاعت ان کے کچھ کام نہیں آنے کی، وہ جہنم کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ حقوق اللہ کے ساتھ جب تک آدمی حقوق العباد کو ادا کرنے کی بھی فکر نہیں رکھتا، وہ اس اخلاق و کردار کا حامل نہیں ہوسکتا جس کو خدا ہمارے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک حدیث میں تو صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے: لاَاِیْمَانَ لِمَنْ لاَّ اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِیْنَ لِمَن لاَّ عَهْدَ لَهٗ (بیہقی فی شعب الایمان) ''اس شخص میں ایمان نہیں جس میں امانت داری نہیں پائی جاتی اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جو عہد کا پابند نہ ہو۔'' معلوم ہوا دین وایمان کا تعلق آدمی کی پوری زندگی سے ہے۔ اگر وہ زندگی کے ہر معاملہ میں حق و صداقت اور عدل وانصاف کو ملحوظ نہیں رکھتا تو ابھی اس نے جانا ہی نہیں کہ دین کیا ہے؟ ایسا رسمی دین جس کا اعلیٰ کردار واخلاق سے کوئی تعلق نہ ہو خدا کے یہاں اس کا کوئی وزن نہیں ہوسکتا۔

اس روایت میں وصیت کے ذریعے سے ورثاء کو نقصان پہنچانے پر جہنم کے وجوب کی جو خبر دی گئی ہے اس کی تائید میں راوی حضرت ابو ہریرہؓ نے سورۃ النساء کی ان آیتوں کی تلاوت کی جن میں کہا گیا ہے کہ وصیت کے ذریعہ ورثاء کو نقصان نہ پہنچانا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں۔ جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اس کو خدا پُر بہار جنتوں میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس کے آگے کی آیت میں ہے کہ جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے تجاوز کرے گا اس کو خدا آگ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رُسوا کن عذاب ہے۔

باب دوم:

سیاست وحکومت

سیاست وحکومت

سیاست یا حکومت انسانی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے۔ دنیا میں قیام امن و آشتی میں حکومت بڑا اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ لیکن حکومت پر اگر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو خود سر اور دنیا پرست ہیں تو اس حکومت کے ذریعہ سے زمین میں ایسا فساد اور بگاڑ پیدا ہوسکتا ہے جس کا عام حالات میں اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں ہماری رہ نمائی کی ہے اسی طرح سیاسی امور میں بھی اس نے ہماری رہ نمائی کی ہے۔ اور وہ اپنے پیروؤں کو اس کا مکلّف قرار دیتا ہے کہ وہ زندگی کے دیگر امور کی طرح سیاسی امور میں بھی اسلامی تعلیمات کی پیروی اختیار کریں۔ اسلام، دین وسیاست کی تفریق کو روا نہیں رکھتا۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے کائنات کی ساری مملکت کا خالق، رب اور اس کا اصل فرماں روا خدا ہی ہے۔ اس کی مملکت اور حکمرانی میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اکیلا ساری کائنات کا فرماں روا ہے۔ سارے ہی انسان خدا کے بندے ہیں۔ اور ان کی حیثیت مربوب اور مملوک کی ہے۔ قرآن میں ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (البقرہ:۱۰۷) ''کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (الفرقان:۲) اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے۔''

اس لیے خدا ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم اس کے احکام کی بے چوں و چرا پیروی کریں۔ حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا حق اسی کو اور صرف اسی کو حاصل ہے۔ انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دل و جان سے اپنے رب اور آقا کی اطاعت اور اس کی فرماں برداری کرے۔ قرآن میں ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف:۵۴) خبردار رہو خلق اور امر اسی کے لیے ہے۔" خدا کے احکام سے انسان کیسے واقف ہو؟ خدا کے احکام اس کے رسولوں کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچے ہیں۔ رسول نہ صرف یہ کہ خدا کی مرضیات اور خدا کے احکام سے لوگوں کو باخبر کرتا ہے بلکہ وہ اپنے قول و عمل سے خدا کے دیے ہوئے احکام و ہدایات کی تشریح بھی کرتا ہے۔ رسول درحقیقت زمین پر خدا کا نمایندہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی رہ نمائی میں زندگی بسر کرنے ہی میں ہماری فلاح اور نجات ہے۔ خدا کے رسول کی مخالفت درحقیقت خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب اور رسول کی سنت کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسلامی نظریۂ سیاسی کی رو سے خدا کی حاکمیت کے تحت اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ خدا کی مملکت میں اسی کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کا احترام کرتے ہوئے اس کا منشا پورا کرنا ہی اسلامی حکومت کی اصل ذمہ داری ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست میں حاکمیت خدا کی ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی خلافت خدا کی حاکمیت کے تحت ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کو خلافت کے حقوق و اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ریاست کا نظم چلانے کے لیے لوگ اپنے اختیارات اپنے منتخب کردہ ایک امیر کے سپرد کردیتے ہیں، وہ ان کی طرف سے خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عام جمہوری ممالک میں حاکمیت جمہور کی ہوتی ہے۔ اور حکومت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جمہور کے منشا کو پورا کرے۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومت اس آئین کی پابند ہوتی ہے جو آئین خدا کا عطا کردہ ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست میں خلافت کا حامل کوئی ایک شخص، طبقہ یا خاندان نہیں ہوتا بلکہ وہ گروہ خلافت کا حامل ہوتا ہے جس نے خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ریاست کے قیام کو عملی شکل دی ہو۔ اہلِ ایمان کے گروہ کا ہر فرد خلافت میں برابر کا شریک ہوتا۔ کسی شخص یا طبقہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ عام اہل ایمان سے خلافت کے اختیارات اپنے حق میں سلب کرلے۔

قرآن میں ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (النور:۵۵) " اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے اور انھوں نے

نیک اعمال اختیار کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں لازماً خلافت (اقتدار) بخشے گا جیسے اس نے ان کو خلافت عطا کی تھی جو ان سے پہلے تھے، اور ان کے لیے لازماً ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ:۲۰) ''اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا، ''اے میرے لوگو! اللہ کی اس نوازش کو یاد کرو جو تم پر رہی ہے، جب کہ اس نے تم میں نبی مقرر کیے، اور تمھیں بادشاہ کیا۔''

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ اقتدار میں سبھی اہل ایمان کی شرکت ہوتی ہے، البتہ نبوت میں اس طرح حصہ داری نہیں ہوتی۔ خدا جس کو چاہتا ہے نبوت سے سرفراز فرماتا ہے۔ نبی یا رسول کی اطاعت کرنی اہل ایمان کا فرض ہوتا ہے۔ نبوت اور رسالت کے ذریعہ سے حاصل شدہ ہدایات اور رہ نمائی سے مستفیض ہونے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ بھلائی کو فروغ حاصل ہو اور زمین سے ظلم وستم کا خاتمہ ہو۔ چناں چہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید:۲۵) ''یقیناً ہم نے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا بھی اتارا جس میں ہولناکی بھی ہے اور لوگوں کے لیے کتنے ہی فائدے ہیں۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج:۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین میں ہم انھیں اقتدار عطا کریں۔ تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، اور زکوٰۃ دیں گے، اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے، اور تمام امور کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

اسلام نے خیر وشر دونوں کی واضح تصویریں پیش کی ہیں۔ خدا کی پسند، ناپسند کوئی چیستاں نہیں ہے۔ اسلامی ریاست زمانہ اور اس ماحول کو جو اسے میسر ہوا سے پیش نظر رکھتے ہوئے

اصلاحی پروگرام ترتیب دے سکتی ہے، اور اسے دینا چاہیے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس میں اخلاقی اصولوں اور زندگی کی قدروں کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ریاست اس کی روادار نہیں ہوگی کہ ملکی یا قومی مصالح کے پیشِ نظر صداقت، دیانت اور عدل و انصاف کو نظر انداز کر دے۔ اور ملکی یا قومی اغراض و مصالح کے تحت جھوٹ، فریب اور بے انصافی کو گوارا کرنے پر آمادہ ہو سکے۔ وہ طاقت کو ستم ڈھانے کا نہیں بلکہ انصاف کے قیام کا ذریعہ سمجھے گی۔ اقتدار اور طاقت کو ہمیشہ ایک امانت تصور کرے گی جس کا ایک دن خدا کی جناب میں حساب دینا ہوگا۔

افراد ہی نہیں ریاست بھی اگر کسی سے کوئی معاہدہ کرتی ہے تو اس کا پاس ولحاظ رکھے گی۔ وہ اپنے حقوق کو ہی نہیں اپنے فرائض بھی یاد رکھے گی۔ انسانی حقوق کیا ہیں؟ اور شہریت کے حقوق کیا ہوتے ہیں؟ یہ سب اس پر واضح کر دیے گئے ہیں۔

انسانیت کا احترام لازمی ہے۔ انسان کی جان اور اس کے مال کا احترام ضروری ہے۔ بغیر حق کے کسی کا خون نہیں بہایا جا سکتا۔ عورتوں، بچوں اور ضعیفوں اور بیماروں یا زخمیوں پر کسی حال میں بھی ہاتھ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ عورت کی عصمت کا ہر حال میں احترام کیا جائے گا۔ اسے بے آبرو نہیں کیا جا سکتا۔ بھوکے کو روٹی اور ننگے کو کپڑا چاہیے۔ بیمار یا زخمی علاج اور تیمارداری کا مستحق ہوتا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں غافل نہیں رہ سکتی۔

ریاست کے حدود میں رہنے والوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ:

۱۔ حکومت کی اطاعت کریں۔

۲۔ قانون اور ضوابط کی پابندی کریں تاکہ نظم برقرار رہ سکے۔

۳۔ وہ بھلائی کے کاموں میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔

۴۔ دفاع کے سلسلے میں جان و مال سے مدد کریں۔

جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے حدود میں رہ رہے ہوں گے، جن کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لی ہو اصطلاح میں ان کو ذمّی کہا جاتا ہے۔

ان ذمّیوں کی جان و مال اور آبرو کا احترام اسی طرح کیا جائے گا جس طرح عام مسلمانوں کی جان و مال اور اُن کی آبرو کو محترم سمجھا جاتا ہے۔

فوجداری اور دیوانی کے قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔

ذمیوں کے پرسنل لاء میں حکومت کسی طرح کی مداخلت نہیں کرے گی۔ وہ اس معاملہ میں آزاد ہوں گے۔

وہ اپنے مذہبی نظریات وعقائد اور مذہبی رسوم اور عبادت کے ادا کرنے میں آزاد ہوں گے۔

ذمی کو اپنے فکر کے اظہار کا پورا موقع حاصل ہوگا۔ وہ تہذیب اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتے ہیں۔

حکومت کا انتظام چلانے کے لیے ایک امیر کا انتخاب ہوگا۔ وہ شخص امارت کے منصب کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا جو خدا ترسی، روح اسلامی کی واقفیت اور فکر و تدبر کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہو۔ اور ان پہلوؤں سے زیادہ سے زیادہ لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں۔

امیر کے تعاون کے لیے ایک مجلسِ شوریٰ ہوگی۔ شوریٰ کے ارکان بھی لوگوں کے منتخب کردہ ہوں گے۔ امیر کو حکمرانی کا حق اسی وقت تک حاصل رہے گا جب تک لوگوں کا اس پر اعتماد ہوگا۔ عام شہریوں کو بھی اس کا پورا حق حاصل ہوگا کہ اگر وہ ضرورت سمجھیں تو حکومت یا امیر پر تنقید کرسکیں۔

خدا کے عطا کردہ قوانین میں ردوبدل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ان کی روشنی میں نئے حالات اور ضروریاتِ زمانہ کے پیشِ نظر نئے قوانین وضع کیے جاسکتے ہیں۔ ان امور و معاملات کا میدان نہایت وسیع ہے جن کے متعلق شریعت نے واضح حکم نہ دے کر ان کو ہماری عقل وفہم اور قوتِ اجتہاد کے حوالہ کر دیا ہے۔ اس طرح کے امور ومسائل میں مجلسِ شوریٰ قوانین وضع کرسکتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ وہ قوانین اسلامی اسپرٹ کے مطابق ہوں۔

اسلامی ریاست میں عدالت آزاد ہوگی۔ وہ انتظامیہ کے ماتحت نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ براہِ راست خدا کے آگے جواب دِہ ہوگی۔ عدالت کے ججوں وغیرہ کا تقرر حکومت ہی کرے گی۔ لیکن عدالت کا فیصلہ بے لاگ ہوگا۔ حکومت یا رئیس اعلیٰ کے خلاف بھی مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہے اور عدالت رئیس اعلیٰ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتی ہے۔

الغرض اسلامی حکومت ایک ایسی آزاد قوم کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے جو اپنی مرضی سے اپنے آپ کو خدا کے احکام کے تابع قرار دے اور ان ہدایات واحکام کے مطابق حکومت چلائے جو خدا نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے عطا فرمائے ہیں۔ یہ

ریاست حقیقت میں ایک نظریاتی ریاست ہے جو ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے چلائی جاسکتی ہے جو اس کے نظریات اور اصولوں کو صحیح تسلیم کرتے ہوں۔ لیکن وہ تمام مدنی یا شہری حقوق اپنی غیر مسلم رعایا کو بھی دیتی ہے جو وہ ان لوگوں کو دیتی ہے جو اسلامی ریاست کے بنیادی نظریات اور اس کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

نظریاتی ریاست ہونے کی وجہ سے ریاست رنگ و نسل، زبان اور علاقہ کی عصبیتوں سے اپنے کو پاک رکھے گی۔ اور صرف اعلیٰ اصولوں پر قائم ہوگی۔ اسلامی ریاست جیسا کہ عرض کیا گیا خدا کے عطا کردہ قانون کی پابند ہوتی ہے۔ وہ افراد کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کرتی۔ اس طرح ریاست میں انفرادی شخصیت کی نشو ونما اور ارتقا کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ خیر و فلاح اور بھلائی کے کاموں میں حکومت کو بھی ان کا مکمل تعاون حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ مملکت میں خلل ڈالنے کے بجائے وہ جان و مال سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت: امتیازی خصوصیات

﴿۱﴾ عَنْ اُمِّ حُصَیْنٍؓ قَالَتْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَوْلاً کَثِیْرًا (فِیْ حِجَّةِ الْوِدَاعِ) ثُمَّ سَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ: اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ حَسِبْتُھَا قَالَتْ اَسْوَدُ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَ اَطِیْعُوْا. (مسلم، ترمذی)

ترجمہ: حضرت ام حصینؓ بیان کرتی ہیں کہ حجۃ الوداع کے اجتماع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ ان میں سے ایک بات یہ میں نے سنی۔ آپؐ فرما رہے تھے: ’’اگر سیاہ، نکٹا غلام تم پر امیر مقرر کیا جائے تو اس کی بات سنو اور اس کی فرماں برداری کرو جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) کے مطابق تم پر حکومت کر رہا ہو۔‘‘

تشریح: اسلام میں اجتماعیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اجتماعیت کے بغیر نہ کسی معاشرہ کا تصور ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر کسی تنظیم اور سیاسی نظام کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اجتماعیت سے فرار اختیار کرنے والے شخص کی روش سرتاسر اسلام کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خالص رسم عبادت اور پرستش میں بھی اسلام نے انسان کے اجتماعی پہلو کی پوری رعایت رکھی ہے۔ چناں چہ نماز باجماعت کی احادیث میں بڑی تاکید کی گئی ہے۔ حج سارے عالم

کے مسلمانوں کو ایک ساتھ مل کر کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے بھی ایک ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○ (البقرہ:۴۳) ''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔'' ترمذی میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: وَيَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَى النَّارِ ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے جو کوئی جماعت سے الگ ہوا وہ الگ ہو کر دوزخ میں گیا۔'' اجتماعیت جب بااقتدار ہوتی ہے تو ایک ایسی حکومت اور سلطنت وجود میں آتی ہے جو زمین پر فتنہ وفساد کو کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتی۔ اسلام میں حکومت و سلطنت کوئی شجرۂ ممنوعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہاں دین اور حکومت دو جوڑواں بچے تسلیم کیے گئے ہیں۔ (الدين والملک توأمان)۔ حضرت داوٗدؑ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰـهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (البقرہ:۲۵۱)

''داوٗد نے جالوت کو قتل کر دیا، اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت دی۔ اور جو کچھ وہ چاہے اس سے اس کو آگاہی بخشی۔ اور (اس طرح سلطنت قائم کر کے) اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین تباہ وخراب ہو جاتی۔ لیکن اللہ اہلِ عالم کے حق میں صاحبِ فضل وکرم ہے۔'' عدل وانصاف کا قیام قرآن کی نگاہ میں اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے پھر حکومت کا قیام اور اس کا نظم وانصرام قرآن کی ہدایت کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ اس سلسلے کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

انضباط اور نظم واطاعت کے بغیر ہم کسی حکومت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حکومت کے سربراہ یا امیر کی اطاعت میں اگر کوتاہی برتی جائے گی تو ظاہر ہے اس سے حکومت کمزور ہی نہیں ہوگی بلکہ ایسی حکومت دیر تک قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تم یہ نہ دیکھو کہ صدرِ مملکت سیاہ ہے یا اونچے خاندان کا نہیں ہے وہ کوئی بھی ہو اگر وہ امیر یا صدرِ مملکت ہے تو ضروری ہے کہ اس کی اطاعت میں تساہل ہرگز نہ ہونے پائے۔

⟨۲⟩ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ. (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: (اسلامی ریاست کے

سربراہ کی بات) سننا اور اس کی اطاعت لازم ہے جب تک کہ (اللہ کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ پس جب (خدا کی) نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ طاعت۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ کسی شخص کے صدر مملکت یا رہبر ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اسے یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ جو چاہے احکام صادر کرے۔ اسے یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دے جس کی تعمیل میں خدا کی نافرمانی ہوتی ہو یا وہ کام معصیت کا ہو۔ اسلامی حکومت میں حاکم کا فرض تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے احکام کا پابند بنانے کی کوشش کرے۔ اگر وہ اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے تو لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے سربراہ کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کو اپنے لیے لازم سمجھیں۔

﴿۳﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: مَنْ کَرِهَ مِنْ اَمِیْرِهٖ شَیْئًا فَلْیَصْبِرْ فَاِنَّهٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا مَّاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "جس کسی کو اپنے امیر کی کوئی بات ناپسند ہو تو اسے صبر سے کام لینا چاہیے کیوں کہ جس نے بالشت بھر بھی اقتدار سے خروج کیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

تشریح: نظام کے بغیر کوئی قوم صحیح معنی میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے نظام اور حکومت یا سلطنت کی بقا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے اقتدار سے خروج کو اسلامی طرزِ عمل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اسے جاہلیت ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ہمارے کسی طرزِ عمل سے اگر اسلامی نظام کو ذرا بھی نقصان پہنچتا ہے تو یہ سنگین جرم ہوگا۔ اسی لیے بالشت بھر بھی خروج کو جاہلیت قرار دیا۔ امیر اور سربراہ ریاست کی کوئی بات ناپسند اور ناگوار بھی ہو تو بھی صبر سے کام لینا چاہیے اور اطاعت اور وفاداری میں فرق نہیں آنے دینا چاہیے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ. (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا قلادہ (پٹا) اپنی گردن سے نکال پھینکا۔"

تشریح: اسلام میں اجتماعیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور جماعت کے بغیر ہم کسی

اجتماعیت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہر مومن شخص کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جماعت سے ہرگز علیٰحدگی اختیار نہ کرے۔ جماعت کو اس کا تعاون حاصل ہو۔ پھر اسلامی نقطۂ نظر سے اصل جماعت وہی ہے جو اسلامی اصولوں پر قائم ہو اور قیام دین جس کا اصل نصب العین ہو۔ مسلمان اگر ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کر کے زندگی نہیں گزارتے جسے اسلام کی روشنی میں جماعت کہا جا سکے تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہوگا کہ وہ اپنی اصل حیثیت کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اسلامی اجتماعیت وجود میں لے آئیں۔ منتشر گروہ کے بجائے ایک منظّم جماعت کی شکل اختیار کریں۔ ان کا ایک منتخب سربراہ ہو جس کی قیادت میں لوگ زندگی گزار سکیں اور اپنے لیے میدان کار متعین کر سکیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جماعت سے وابستگی آدمی کے دین وایمان کی محافظ ہوتی ہے۔ شیطان کے لیے یہ نہایت آسان بات ہوتی ہے کہ وہ ایسے شخص کو جو کسی نظم کے تحت زندگی نہیں گزارتا اُچک لے اور راہِ حق سے بے گانہ رہنے پر اسے مطمئن کر دے اور باطل کے حملوں اور شیطانی سازشوں سے وہ اپنی حفاظت نہ کر سکے۔

ایجابی واصولی ریاست

﴿۱﴾ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍؒ قَالَ: زُرْتُ عَائِشَةَ مَعَ عُبَیْدِ بْنِ عُمَیْرِنِ اللَّیْثِیِّ فَسَأَلْنَاهَا عَنِ الْهِجْرَةِ، فَقَالَتْ لَاهِجْرَةَ الْیَوْمَ کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ یَفِرُّ اَحَدُهُمْ بِدِیْنِهٖ اِلَی اللّٰهِ وَ اِلٰی رَسُوْلِهٖ مَخَافَةَ اَنْ یُّفْتَنَ عَلَیْهِ فَاَمَّا الْیَوْمَ فَقَدْ اَظْهَرَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ وَالْیَوْمَ یَعْبُدُ رَبَّهٗ حَیْثُ شَاءَ وَلٰکِنْ جِهَادٌ وَّ نِیَّةٌ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عطاء بن ابی رباحؒ بیان کرتے ہیں کہ میں عبید بن عمیر لیثیؒ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ملاقات کے لیے گیا۔ ہم نے ان سے ہجرت کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ ”اب ہجرت نہیں ہے۔ پہلے مومنین اس حال میں تھے کہ ان میں سے کوئی اپنے دین کو لے کر خدا اور رسول کی طرف اس خوف سے ہجرت کر جاتا تھا کہ اسے اپنے دین کی وجہ سے سخت آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب تو خدا نے اسلام کو غلبہ عطا کر دیا۔ آج تو وہ جہاں چاہے آزادی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر سکتا ہے (اس لیے اب ہجرت کی ضرورت باقی نہیں رہی) البتہ جہاد اور نیت اب بھی باقی ہے۔“

تشریح: اسلامی ریاست ایک اصولی ریاست ہوتی ہے۔ اس کا تعلق ان آفاقی اصولوں سے ہوتا ہے جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ وہ محدود مقاصد کو لے کر اور نسل، رنگ اور زبان وغیرہ کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتی۔ اس کے اصول ومقاصد آفاقی ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے پیشِ نظر ساری انسانیت ہوتی ہے۔ پھر اس کے سامنے اصلاً انسانی زندگی کا مثبت پہلو ہوتا ہے۔ وہ محض کسی چیز کے ردعمل کے طور پر (خواہ وہ برائی ہی کیوں نہ ہو) وجود میں نہیں آتی۔ اسلام کا غلبہ دراصل حق اور مبنی برعدل آفاقی اصولوں اور اقدارِ حیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں آدمی بے خوف ہوکر خدا کی اطاعت اور بندگی میں زندگی گزار سکتا ہے۔ خدا کی اطاعت کی راہ میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور نہ خداپرستی کو جرم قرار دے کر کسی پر ظلم وستم روا رکھا جاسکتا ہے۔ اسلامی ریاست میں ظلم وستم کے مواقع باقی نہیں رہتے۔ اسلام اپنے اصول وقوانین اور اپنی فطرت کے لحاظ سے غالب رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلام کا غلبہ حق وانصاف کی فتح ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ نے فرمایا اسلام کے غلبہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہجرت تو اپنے دین اور ایمان کی حفاظت کے لیے کی جاتی تھی۔ اسلامی ریاست میں دین وایمان کے لیے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔ اسلامی حکومت میں خدا کی عبادت اور اس کی بندگی میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے کہ آدمی گھربار چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہو۔ مومن کے لیے جو چیز ہر حال میں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ارادے ہمیشہ نیک ہوں۔ اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جذبہ جہاد کبھی سرد نہ ہونے پائے۔ معلوم نہیں کب حق وصداقت کے لیے جان ومال کی قربانی دینے کی ضرورت پیش آجائے۔ خداطلبی اور حق پسندی ہی مومن کا اصل شعار ہے اس میں کبھی بھی فرق نہیں آنا چاہیے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ خَبَّابِ بْنِ الْاَرَتِّؓ قَالَ: شَكَوْنَا اِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً لَهُ فِيْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ فَقُلْنَا اَلاَ تَسْتَنْصِرُ لَنَا اَلاَ تَدْعُو اللّٰهَ لَنَا؟ قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ فِيْمَنْ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهُ فِي الْاَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيْهَا، فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوْضَعُ عَلٰى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ بِاثْنَيْنِ وَمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِيْنِهِ وَ يُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِيْدِ مَادُوْنَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ وَ عَصَبٍ وَّمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِيْنِهِ، وَاللّٰهِ لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْاَمْرُ حَتّٰى يَسِيْرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ اِلٰى حَضْرَ مَوْتَ لَايَخَافُ اِلَّا اللّٰهَ اَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهِ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت خباب ابن الارتؓ سے روایت ہے کہ ہم نے نبی ﷺ سے شکایت کی۔ اس وقت آپؐ کعبہ کے سایے میں چادر سر کے نیچے رکھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ کیا آپؐ ہمارے لیے (اللہ سے) مدد طلب نہیں فرماتے؟ کیا آپؐ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے کہ اس ظلم وستم کا خاتمہ ہو جو اہل مکہ اہل ایمان پر توڑ رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ اُن میں سے کسی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا۔ پھر اس کو اس گڑھے میں کھڑا کیا جاتا، پھر آرا لاکر اس کے سر پر رکھا جاتا اور اس سے چیر کر اس کے جسم کے دو ٹکڑے کردیے جاتے۔ پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتا۔ اور اس کے جسم میں لوہے کے کنگھے چبھوئے جاتے جو گوشت سے گزر کر ہڈیوں اور پٹھوں تک پہنچ جاتے مگر وہ اپنے دین سے نہ پھرتا۔ خدا کی قسم، یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعا (یمن) سے حضر موت تک کا سفر اختیار کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ یا پھر خوف ہوگا تو کسی کو بھیڑیا کا کہ کہیں وہ اس کی بکریوں پر حملہ نہ کرے۔ لیکن تم لوگ جلدی کر رہے ہو۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایمان کی دولت اتنی قیمتی ہے کہ اگر یہ ہاتھ آ جائے تو سمجھیے کہ آدمی نے سب کچھ پالیا۔ ہر قسم کی اذیت برداشت کر کے حتی کہ اپنی جان دے کر بھی اگر کوئی اپنے ایمان کو بچا سکتا ہے تو اسے جان دے کر اپنے ایمان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ماضی میں ایسے اہلِ ایمان گزرے ہیں جنھیں وہ تمام مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئیں جن کا کوئی تصور کر سکتا ہے لیکن کوئی بھی چیز ان کو حق سے برگشتہ نہ کر سکی۔

اس حدیث میں دین کے غالب ہونے کی جو خبر دی گئی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی۔ اسلام کے غلبہ سے جہاں بہت سے فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں وہیں ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سے مملکت میں ایسا امن قائم ہوتا ہے جس کا عام حالات میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس حدیث میں خبر دی گئی کہ یمن سے بحرین و حضر موت تک کے وسیع علاقہ میں اسلام دشمن طاقتوں کا زور باقی نہیں رہے گا اور ایسا امن قائم ہوگا کہ لوگ آزادی کے ساتھ خدا کی بندگی کر سکیں گے اور دور دور تک کہیں کسی قسم کا خوف اور خطرہ باقی نہیں رہے گا۔

اسلامی حکومت کے مقاصد

⟨۱⟩ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ

اَلْمُقْسِطِیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَ مِّنْ نُّوْرٍ عَنْ یَّمِیْنِ الرَّحْمٰنِ وَ کِلْتَا یَدَیْہِ یَمِیْنٌ الَّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِیْ حُکْمِھِمْ وَ اَھْلِیْھِمْ وَمَا وَلُوْا. (مسلم)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ’’عادل حکمراں خدا کے یہاں نور کے منبروں پر رحمٰن کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور اس کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ وہ حاکم جو اپنے احکام میں، اپنے اہل میں، اور اپنے زیرِ تصرف معاملات میں عدل کرتے ہیں۔‘‘

تشریح: عادل حکمراں رحمٰن کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا مرتبہ خدا کے یہاں نہایت بلند ہے۔

اللہ کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے دایاں بائیں کے مقابلہ میں ہے۔ اور بایاں دائیں کے مقابلہ میں کمزور ہوتا ہے۔ خدا ہر قسم کے نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ ہاتھ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم اللہ کو ہوسکتا ہے۔

عادل حکمراں حکومت و امارت سے متعلق جو امور ہوتے ہیں ان کو انجام دینے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حقوق کے ادا کرنے میں حق اور انصاف کو ہرگز فراموش نہیں کرتے۔ جو چیز بھی ان کی نگرانی میں ہوتی ہے مثلاً وقف کی جائداد، یتیموں اور افلاس زدہ لوگوں کی خبر گیری وغیرہ ان سب میں وہ اپنے فرائض کو بہ خوبی جانتے ہیں اور اپنے فرائض کے ادا کرنے میں وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامِ عدل و انصاف اسلامی حکومت کے مقاصد میں سے ایک اہم اور بنیادی مقصد ہے۔

〈۲〉 وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ یَسَارٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: مَا مِنْ عَبْدٍ یَّسْتَرْعِیْہِ اللّٰہُ رَعِیَّۃً فَلَمْ یَحُطْھَا بِنَصِیْحَۃٍ اِلَّا لَمْ یَجِدْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت معقل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ’’جس کسی بندے کو خدا رعیت کی نگہبانی سپرد کرے اور وہ بھلائی اور خیر خواہی کے ساتھ نگہبانی نہ کرے وہ جنت کی بو نہ پائے گا۔‘‘

تشریح: حکمراں اگر اپنی رعیت کا خیر خواہ نہیں ہے تو یہ ایسا ستم ہے کہ اس ستم کو روا رکھنے والا کسی طرح بھی اس کا مستحق نہیں ہوسکتا کہ اسے جنت کی خوشبو بھی مل سکے یا وہ اہل جنت کے ساتھ بہشت جاوداں میں داخل ہو سکے۔ اور پر مسرت دائمی زندگی اس کے حصے میں آئے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلامی حکومت پبلک کی خیر خواہ ہوتی ہے۔ اس کا کام عوام کی خیر خواہی ہے نہ کہ ان کو مبتلائے مصیبت رکھنا۔

〈۳〉 وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَّنْ رَضِيَ وَ تَابَعَ قَالُوْا: اَفَلاَ نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لاَ مَا صَلُّوْا لاَ مَا صَلُّوْا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خداؐ نے ارشاد فرمایا: ”تم پر ایسے حاکم مقرر ہوں گے جو اچھے کام بھی کریں گے اور برے کام بھی کریں گے، جس نے انکار کیا وہ بری الذمہ ہوگیا اور جس کسی نے دل سے (ان کے برے افعال کو) برا جانا وہ سلامت رہا۔ لیکن جو ان کے فعل پر راضی رہا اور ان کی پیروی کی (وہ نہ بری الذمہ قرار پائیں گے اور نہ ان کے لیے عافیت اور سلامتی ہے)۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم ان (حکمرانوں) سے جنگ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک کہ وہ نماز قائم کریں، نہیں جب تک کہ وہ نماز قائم کرتے ہوں۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس نے برے کاموں کی تائید نہیں کی بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کی، اس کی خدا کے یہاں گرفت نہ ہوگی۔ اور جس کسی نے برائی کو برائی نہیں سمجھا، برائیوں میں حاکم کا اتباع کیا وہ گناہ کے وبال سے ہرگز بچ نہیں سکتا۔

نماز کا قیام بھی اسلامی حکومت کے مقاصد میں سے ایک بنیادی اور اہم مقصد ہے۔

قرآن نے بھی اسلامی حکومت کے اصل مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ چناں چہ ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید:۲۵) ”یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور لوہا بھی اُتارا جس میں بڑی ہولناکی اور لوگوں کے لیے کتنے ہی فائدے ہیں۔“ یعنی خدا نے عادلانہ نظام بھی اور مبنی بر عدل ہدایت بھی نازل کی اور لوہا یعنی قوت

اور سیاسی طاقت بھی عطا کی۔ اور اس کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور باقی نہ رہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج:۴۱) ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین میں ہم انھیں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔''

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے۔ نیکیوں اور بھلائیوں کو فروغ حاصل ہو اور برائیوں کو دبا دیا جائے۔ نیکیاں اور بھلائیاں اللہ کو پسند ہیں اور برائیاں اسے بہت ہی مبغوض ہیں۔

اسلامی ریاست کی بنیادیں

تصور کائنات و حیات:

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَنَّ اَبَا بَکْرِنِ الصِّدِّیْقَ قَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مُرْنِیْ بِکَلِمَاتٍ اَقُوْلُھُنَّ اِذَا اَصْبَحْتُ وَ اِذَا اَمْسَیْتُ. قَالَ: قُلِ اللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ وَ مَلِیْکَہٗ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنْتَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَ شِرْکِہٖ. قَالَ: قُلْھَا اِذَا اَصْبَحْتَ وَ اِذَا اَمْسَیْتَ وَ اِذَا اَخَذْتَ مَضْجَعَکَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، آپ مجھے چند کلمات کا حکم دیجیے جن کو میں صبح و شام پڑھا کروں۔ آپؐ نے فرمایا: ''کہو اے اللہ، آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے والے، چھپے اور کھلے کے جاننے والے، ہر چیز کے رب اور مالک، میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تیری پناہ مانگتا ہوں بچنے کے لیے اپنے نفس کے شر سے، شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے۔'' آپ نے فرمایا: ان کلمات کو صبح و شام اور جب بستر پر جاؤ، پڑھا کرو۔''

تشریح: نبی ﷺ نے جو دعا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سکھائی ہے اور جسے صبح و شام اور سوتے وقت پڑھنے کی تلقین کی ہے اس دعا سے واضح ہے کہ کائنات اور انسان کی زندگی کے

بارے میں اسلام کا تصور کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ یہ کائنات بے خدا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک خالق ہے، اس کے علم وارادہ اور اسی کے منصوبہ کے تحت یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ وہی خدا درحقیقت اپنی وسیع کائنات کا مالک اور جائز فرماں روا ہے۔ انسان کو بھی اسی کی بندگی اور غلامی میں اپنی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جب سب کا خالق وہ ہے تو حکم دینے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ قرآن میں ہے: اَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: ۵۴) ''خبردار اسی کی خلق ہے اور امر بھی۔''

کائنات کا خالق ہی انسان کا بھی خالق اور رب ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (الاعراف: ۵۴) ''بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔'' یہ کائنات نہ تو بے خدا ہے اور نہ یہ اپنے آپ وجود میں آئی ہے۔ اس کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اسی نے اپنے منصوبہ کے مطابق اس کائنات کی تخلیق کی اور اس کے ایک گوشہ میں انسان کو آباد کیا ہے۔ اسی کے حضور آخر میں ہم سب کو حاضر ہونا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا احساس آدمی کو ہر وقت حتی کہ سوتے وقت بھی ہونا چاہیے۔ ہمارا خالق اور ہمارا رب ہی ہمیں ہر طرح کی برائی سے بچا کر ہمیں سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق دے سکتا ہے۔ اور وہی ہمیں کفر وشرک کی گندگی سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اللہ ہی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھنی چاہییں۔

حاکمیت الٰہ

〈۱〉 عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ عَنِ النَّبِىِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: يَقْبِضُ اللّٰهُ الْاَرْضَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَطْوِى السَّمَآءَ بِيَمِيْنِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ قیامت کے روز زمین کو اپنی مٹھی میں لے لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹے گا اور فرمائے گا کہ'' میں بادشاہ ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟''

تشریح: جیسے کوئی شخص ایک گیند اپنے ہاتھ میں لے لے، اسی طرح وہ زمین کو اپنے قبضہ میں لے لے گا۔ اور آسمان اس کے ہاتھ میں اس طرح لپٹے ہوں گے جیسے لپٹا ہوا رومال کوئی اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہو۔ اس وقت یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگی کہ ساری کائنات اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اسی لیے حقیقی بادشاہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ اس روز

وہ علی الاعلان فرمائے گا کہ جس کسی کو شک وشبہ ہو وہ دیکھ لے کہ کائنات کی سلطنت کا مالک اور بادشاہ درحقیقت کون ہے۔ زمین میں جو اپنی بادشاہی اور شہنشاہیت کا دم بھرتے تھے آج وہ کہاں ہیں؟ ان کا رعب اور دبدبہ کیا ہوا؟

جو حقیقت آخرت میں منکشف ہوگی وہ اگر دنیا کی زندگی ہی میں آدمی پر منکشف ہو جائے تو وہ ہرگز رب کائنات کے مقابلہ میں باغیانہ روش اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ کائنات کا بادشاہ اور حاکم اللہ ہی ہے۔ اس لیے کائنات میں حاکمیت (Sovereignty) بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہوسکتی۔ کسی شخص یا گروہ کو سرے سے یہ حق نہیں پہنچتا کہ حاکمیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔ قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (البقرہ:۱۰۷) "کیا تم جانتے نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کی ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف:۵۴) خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کی حکمرانی بھی ہے۔"

اللہ حاکمیت کی جملہ صفات سے متصف ہے۔ جملہ اختیارات حقیقت میں ایک اللہ ہی میں مرکوز ہیں۔ وہ سب پر غالب، بے عیب اور سب کا نگہبان ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ○ (الانعام:۱۸) اسے اپنے بندوں پر پورا غلبہ حاصل ہے۔ اور وہ صاحبِ حکمت، باخبر ہے۔ "لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ○ (الانبیاء:۲۳) "جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی اس سے باز پرس نہیں۔ لیکن اُن سے (دوسروں سے) باز پرس ہوگی۔" یعنی وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں لیکن دوسرے سبھی جواب دہ ہیں۔

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ فِي الْمَسَاجِدِ خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ انْطَلِقُوْا اِلٰى يَهُوْدَ فَخَرَجْنَا حَتّٰى جِئْنَا بَيْتَ الْمِدْرَاسِ فَقَالَ: اَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا وَ اعْلَمُوْا اَنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنِّيْ اُرِيْدُ اَنْ اُجْلِيَكُمْ مِنْ هٰذَا الْاَرْضِ فَمَنْ يَّجِدُ مِنْكُمْ بِمَالِهٖ شَيْئًا فَلْيَبِعْهُ وَ اِلَّا فَاعْلَمُوْا اَنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد ہی میں تھے کہ نبی ﷺ باہر تشریف لے آئے اور فرمایا: "یہود کے پاس چلو۔" ہم لوگ نکلے یہاں تک کہ جب ہم بیت المدراس میں پہنچ گئے تو آپؐ نے (یہود سے) فرمایا: "اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے۔ اور خوب جان لو کہ یہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس سرزمین سے نکال باہر

کردوں۔تم میں سے جس کے پاس مال ہو وہ اسے فروخت کردے۔ ورنہ یہ بات جان رکھو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول ہی کی ہے۔‘‘

تشریح: یہود کی مسلسل باغیانہ روش کی وجہ سے آپؐ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ انھیں نکال باہر کیا جائے۔ آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی کہ اس میں ان کی دنیا و آخرت کی بھلائی اور ان کے لیے سلامتی و عافیت تھی۔ بہ صورت دیگر ان کے بارے میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ انھیں اب یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انھیں اب نکل جانا پڑے گا۔ بس ان کے ساتھ اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مال کو فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ اس موقع پر آپؐ نے اس کا اعلان فرمایا کہ زمین حقیقت میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہے۔ اس کا حقیقی مالک وہی اور صرف وہی ہے۔ وہ اس کے بارے میں اپنے رسول کے ذریعے سے اپنا فیصلہ نافذ کر رہا ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ وَ زَیْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ: کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ: لَاَقْضِیَنَّ بَیْنَکُمَا بِکِتَابِ اللّٰہِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبیؐ کے پاس تھے تو آپؐ نے فرمایا: ’’میں تمھارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دوں گا۔‘‘

تشریح: یعنی بالاتر قانون (Supreme Law) اللہ ہی کا ہے۔ رسول تو خدا کے قانون کو انسانوں تک پہنچانے میں صرف ذریعہ ہوتا ہے۔ رسول دراصل خدا کی قانونی حاکمیت (Legal Sovereignty) کا نمائندہ محض ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ من مانی نہیں کرتا۔ اس کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے حکم کے مطابق ہی ہوگا۔ اسی لیے اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء:۸۰) ’’جس کسی نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔‘‘ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے: فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (النساء:۶۵) ’’پس تمھیں تمھارے رب کی قسم، یہ مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ (اے نبی) ان کے درمیان جو جھگڑا اٹھے اس میں یہ تم سے فیصلہ نہ کرائیں۔ پھر تم جو فیصلہ کرو اس پر یہ اپنے دل میں کوئی تنگی نہ پائیں، اور پوری طرح تسلیم کرلیں۔‘‘

اطاعتِ رسولؐ

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: كُلُّ اُمَّتِیْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی۔ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَبٰی؟ قَالَ: مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری امت کے سبھی لوگ جنت میں داخل ہوں گے سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔“ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ، اور کون انکار کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ”جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کسی نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا (وہ جنت میں داخل نہ ہوگا)۔“

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ رسول خدا کی نافرمانی ایک طرح سے اس کا انکار ہے۔ اس انکار کے بعد وہ جنت اور خدا کے انعامات کا مستحق نہیں رہ جاتا، جنت اصل میں ان لوگوں کے لیے ہے جن کی زندگی خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔ خدا کی اطاعت اور اس کی بندگی کیسے کی جائے؟ یہ خدا کے رسولؐ کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے بندگیِ رب کے لیے اطاعتِ رسولؐ ناگزیر ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں چوں کہ خدا کے دیے ہوئے احکام وقوانین کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ احکام وقوانین رسول ہی کے ذریعہ سے ہمیں ملے ہیں۔ اور رسولؐ نے اپنے ارشادات اور طرزِ عمل سے ان احکام وقوانین کی توضیح اور شرح بھی کردی ہے۔ اس لیے رسول کی اطاعت سے نہ کوئی شخص بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ کسی اسلامی مملکت کے لیے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ وہ رسولؐ کی اطاعت اور فرماں برداری سے بے نیاز ہوکر رہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ مَالِكِ بْنِ اَنَسٍؓ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ رَسُوْلِهٖ. (موطا)

ترجمہ: حضرت مالک بن انسؒ سے ایک مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں جب تک انھیں تھامے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے: خدا کی کتاب (قرآن) اور اس کے رسول کی سنت۔“

تشریح: یعنی تعلیمات اسلامی اور اسلامی احکام وقوانین اور ضوابط کی اصل اساس کتاب و سنت ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا۔ فکری وعملی ہر قسم کی گمراہی اور بے راہ روی

سے محفوظ رہنے کی بس یہی ایک صورت ہے کہ قرآن اور سنت (یعنی طریقۂ رسولؐ) کو مضبوطی سے تھاما جائے۔ اور ان کی روشنی اور رہ نمائی میں سارے امور اور معاملات کا (خواہ وہ شخصی ہوں یا اجتماعی یا سیاسی) فیصلہ کیا جائے۔ ضلالت سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی پیروی کے ساتھ نبی ﷺ کی سنت اور آپؐ کے طریقہ کی بھی پیروی کی جائے۔ آپؐ کتاب اللہ کے شارح اور ترجمان ہیں۔ آپؐ کی زندگی اور آپؐ کا طرزِ عمل قرآن کی شرح کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ آپ کی ایک اہم ذمہ داری یہ بھی رہی ہے کہ آپؐ لوگوں کو کتاب (احکام) وحکمت کی تعلیم دیں (البقرہ:۱۲۹، آل عمران:۱۶۴، الجمعہ:۲)۔ پھر آپؐ سے بے نیاز ہوکر کوئی شخص کیسے راہِ راست پا سکتا ہے اور اس پر قائم رہ سکتا ہے!''

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَ مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس کسی نے میری نافرمانی کی اُس نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کیے ہوئے) حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری اطاعت کی اور جس کسی نے میرے (مقرر کیے ہوئے) حاکم کی نافرمانی کی اس نے حقیقت میں میری نافرمانی کی۔''

تشریح: خدا کی اطاعت رسول اللہؐ کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی بھی معاملہ میں خدا کو کیا پسند ہے اور کس چیز کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ یہ ہمیں صرف خدا کے رسولؐ کے ذریعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس پہلو سے رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دنیا میں خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کے پیغمبر کو نہیں پہچانتے اور نہ پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں، ان کا دعویٰ محض دعویٰ ہے خدا کے یہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکم عادل کی اطاعت بھی ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر نظام اسلامی کا قیام ممکن نہیں۔ حاکم بھی اس کا پابند ہے کہ وہ احکام کے نفاذ میں رسولِ خدا کی لائی ہوئی شریعت کا پورا لحاظ رکھے۔ وہ ایسے احکام صادر نہ کرے جو اسلام کے خلاف اور اسلامی شریعت کے منافی ہوں۔

〈۴〉 وَعَنهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: دَعُونِی مَا تَرَکتُم اِنَّمَا هَلَکَ مَن کَانَ قَبلَکُم بِسُؤَالِهِم وَاختِلَافِهِم عَلٰی اَنبِیَآئِهِم. فَاِذَا نَهَیتُکُم عَن شَیءٍ فَاجتَنِبُوهُ وَ اِذَا اَمَرتُکُم بِاَمرٍ فَأتُوا مِنهُ مَا استَطَعتُم. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم مجھے چھوڑ دو جب تک کہ میں تمہیں چھوڑے رکھوں (یعنی بلاضرورت مجھ سے سوال نہ کیا کرو)۔ تم سے پہلے کی قومیں اپنے سوالات اور اپنے نبیوں سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے پرہیز کرو اور جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اس کو کرو جتنا تم سے ہو سکے۔''

تشریح: اس حدیث سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس حدیث سے واضح ہے کہ دین میں تنگی نہیں توسع پایا جاتا ہے۔ اس توسع کی قدر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ خدا کا رسول ﷺ جن باتوں میں ہمیں چھوٹ دیتا ہے۔ ہمیں چھوڑے رکھتا ہے، ہماری کوئی گرفت نہیں کرتا، اس کی قدر کرنی چاہیے۔ وسعت کے مقابلہ میں تنگی کو ترجیح دینا کفرانِ نعمت کے سوا اور کیا ہوگا۔ رسول سے سوال کر کر کے احکام میں وسعت کے دائرے کو تنگ کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف اور یہ خود اپنے اوپر بھی ظلم ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے اور یہی اصل تقویٰ ہے کہ خدا کا رسول جس سے ہمیں روکے اس سے ہم باز رہیں اور جس بات کا وہ ہمیں حکم دے اسے بجالائیں۔

گزری ہوئی قوموں کے لوگوں کی ہلاکت کے وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ انھوں نے اپنے انبیاء سے بے ضرورت سوالات کر کے احکام میں پائے جانے والے توسع کو نقصان پہنچایا۔ پھر نبیوں کے دیے ہوئے احکام پر چلنے سے کتراتے بھی رہے۔ اس طرح راہ راست سے منحرف ہو کر رہے۔ وہ اپنے آپ کو نبیوں کے ذوق و مزاج اور ان کی لائی ہوئی شریعت سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ قومیں پیوند خاک کر دی گئیں اور ان پر آنسو بہانے والا کوئی نہ رہا۔

خلافت

〈۱〉 عَن اَبِی هُرَیرَةَؓ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: کَانَت بَنُو اِسرَآئِیلَ تَسُوسُهُم

الْاَنْبِیَاءُ کُلَّمَا ھَلَکَ نَبِیٌّ خَلَفَهٗ نَبِیٌّ وَ اِنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَ سَیَکُوْنُ خُلَفَآءُ فَیَکْثُرُوْنَ قَالُوْا فَمَا تَامُرُنَا. قَالَ: فُوْابِبَیْعَةِ الْاَوَّلِ فَالْاَوَّلِ اَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ. فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بنی اسرائیل میں امور کی تدبیر اور انتظام انبیاء کرتے تھے۔ جب ایک نبی کی وفات ہوجاتی تو اس کا جانشین کوئی دوسرا نبی ہوجاتا۔ (اس طرح یکے بعد دیگرے انبیاء آتے رہے) لیکن میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ البتہ میرے بعد خلفاء وامراء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر آپؐ ہمیں کیا حکم دے رہے ہیں؟ فرمایا: ''پہلے امیر کی بیعت پوری کرو پھر (دوسرے زمانہ میں) پہلے امیر کی۔ اور ان کا حق ادا کرو، اللہ نے مخلوق کی نگہ داشت اور حکومت کی جو ذمہ داری انھیں سونپی ہے اس کے بارے میں وہ خود اُن سے پوچھ لے گا۔''

تشریح: یعنی بنی اسرائیل میں سربراہی اور قوم کی قیادت وسیادت کا فریضہ انبیاء علیہم السلام انجام دیتے رہے ہیں۔ سیاسی امور ہوں یا معاشرتی مسائل تمام ہی معاملات میں قوم کی رہ نمائی انھیں کے ذمہ تھی۔ چناں چہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے حکمراں ان کے یہاں ہوئے ہیں جن کی اصل حیثیت نبی کی تھی۔ ایک نبی کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ اس طرح قوم کی رہبری اصلاً ان کے انبیاء ہی کرتے رہے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری حیثیت امت کے قائد اور امام کی ہے۔ سماجی اور ثقافتی ہوں یا معاشی اور سیاسی، سارے ہی امور کی نگہ داشت میرے ذمہ ہے۔ خدا کے رسول کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی باگ ڈور بھی میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن سلسلۂ نبوت مجھ پر ختم ہورہا ہے۔ میرے بعد کسی نبی کے آنے کا امکان اب نہیں ہے۔ اب قیادت اور نظم مملکت کے سنبھالنے کی ذمہ داری ان خلفاء پر ہوگی جو میرے بعد ہوں گے۔ وہ نبی نہیں ہوں گے ان کی حیثیت امراء وخلفاء کی ہوگی۔ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ میری لائی ہوئی ہدایت کے مطابق سلطنت کا نظم سنبھالیں۔ عدل وقسط کو قائم کریں۔ خدا کی زمین سے ظلم وفساد دور کریں اور زمین میں عادلانہ نظامِ حکومت کی بقا اور اس کے قیام کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل رہیں۔

نبی ﷺ نے یہ جو کہا کہ تم پہلے امیر کی بیعت پوری کرو پھر اس کے بعد جو امیر مقرر ہو

اس کی اطاعت کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علی الترتیب یکے بعد دیگرے خلیفہ یا امیر مقرر ہوں گے، تم بھی ترتیب کے ساتھ ایک کے بعد دوسرے کی اطاعت کرو۔ اگر کسی وقت ایک سے زیادہ افراد خلافت کا دعویٰ کرنے لگیں تو جو پہلے امیر مقرر ہوا ہو اس کی اطاعت کرو۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم ان خلفاء کے حقوق ادا کرو جو یکے بعد دیگرے ہوں گے۔ اگر وہ تمہارے حقوق کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیں تو خدا کے یہاں اس کے لیے وہ جواب دہ ہوں گے۔

﴿۲﴾ وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰهَ وَمَن يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَن يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے درحقیقت اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس کسی نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔“

تشریح: یعنی مملکت اسلامی کے امراء کی اطاعت تمہارے لیے لازم ہے۔ سمع وطاعت کے بغیر کسی حکومت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور عادلانہ حکومت کے بغیر زمین میں امن کا قیام ممکن نہیں۔ عادلانہ نظامِ حکومت کے بغیر زمین ظلم وستم اور فتنہ وفساد کا ایک گہوارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ نظمِ مملکت کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سربراہ مملکت کی اطاعت کی جائے۔ اس کی نافرمانی یا باغیانہ انداز اختیار کر کے حکومت کو کمزور اور غیر موثر بنانے کی کوشش ایک سنگین قسم کا جرم ہے۔ اس حدیث میں امیر کی اطاعت کو رسول کی اطاعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسالت کا منشا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ زمین میں خلفشار پیدا ہو اور امن وامان باقی نہ رہے۔ امن وسلامتی کے بغیر نہ عوام کو آرام اور چین میسر آسکتا ہے اور نہ وہ علمی وروحانی اور مادّی کسی پہلو سے زندگی کے کسی میدان میں ترقی کر سکتے ہیں۔

امارت

اِمارت کی طلب

〈۱〉 عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَؓ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لاَ تَسْأَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُکِلْتَ اِلَیْھَا وَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اِمارت طلب مت کرو۔ اس لیے کہ اگر مانگنے سے تمھیں امارت ملی تو تم اسی کے حوالہ کردیے جاؤ گے اور اگر بغیر طلب کیے تمھیں امارت ملے تو (اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے) خدا کی جانب سے تمہاری مدد کی جائے گی۔''

تشریح: یعنی امارت وحکومت کی ذمہ داریاں آسان نہیں ہوتیں کہ اسے طلب کیا جائے۔ یہ ذمہ داریاں اتنی دشوار اور سخت ہوتی ہیں کہ جب تک خدا کی تائید ونصرت شاملِ حال نہ ہو کوئی اس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ خدا کی نصرت اور تائید وتوفیق کے لیے ضروری ہے کہ اس کی خواہش اور طلب کے بغیر کسی کو امارت کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ ایسی صورت میں خدا اس کا حامی اور مددگار ہوجاتا ہے اور خدا کی طرف سے اسے اس کی توفیق عطا ہوتی ہے کہ وہ ذاتی اغراض و مقاصد میں پڑنے کے بجائے عدل وقسط کا قیام عمل میں لائے اور امارت کی جملہ ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا کرسکے۔

〈۲〉 وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ اَنَا وَ رَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُ الرَّجُلَیْنِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاکَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وَ

قَالَ الْاٰخَرُ مِثْلُ ذٰلِکَ فَقَالَ: اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی هٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَأَلَهٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْهِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ دو میرے چچازاد بھائی بھی تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یارسول اللہ، مجھے ان ملکوں میں سے جو اللہ عزوجل نے آپؐ کو عطا کیے ہیں کسی کی امارت عطا فرمائیں۔ دوسرے شخص نے بھی ایسا ہی کہا۔ آپؐ نے فرمایا: ''بہ خدا ہم یہ خدمت اس کو نہیں سونپتے جو اس کی درخواست کرے اور نہ کسی ایسے شخص کو سونپتے ہیں جو اس کا حریص ہو۔''

تشریح: امارت یا حکومت کی ذمہ داری اتنی بڑی اور نازک ہوتی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کو اس ذمہ داری کا پورا احساس ہو اور وہ صحیح معنی میں خدا سے ڈرنے والا ہو کبھی بھی اس ذمہ داری کے بوجھ کو اُٹھانے کے لیے خود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر کوئی شخص امارت کا طالب ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے یا تو مناصب کی ذمہ داریوں اور ان کی نزاکتوں کا احساس نہیں ہے یا وہ ہوسِ اقتدار کا شکار ہے۔ ان میں سے جو صورت بھی ہو امارت کے لیے کسی کی نااہلی کے لیے کافی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: تَجِدُوْنَ مِنْ خَیْرِ النَّاسِ اَشَدُّهُمْ کَرَاهِیَةً لِهٰذَا الْاَمِیْرِ (بخاری، مسلم عن ابی هریرةؓ) ''لوگوں میں بہتر تم اسے پاؤ گے جو اس (سیادت وامارت) کو سخت ناپسند کرتا ہو۔''

امیر کا انتخاب

〈۱〉 عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّهٗ سَمِعَ خُطْبَةَ عُمَرَ الْاٰخِرَةَ حِیْنَ جَلَسَ عَلَی الْمِنبَرِ وَ ذٰلِکَ الْغَدُ مِنْ یَوْمٍ تُوُفِّیَ النَّبِیُّ ﷺ فَتَشَهَّدَ وَ اَبُوْبَکْرٍ صَامِتٌ لَّایَتَکَلَّمُ قَالَ: کُنْتُ اَرْجُوْ اَنْ یَّعِیْشَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی یَدْبُرَنَا یُرِیْدُ بِذٰلِکَ اَنْ یَّکُوْنَ اٰخِرَهُمْ فَاِنْ یَّکُ مُحَمَّدٌ ﷺ قَدْ مَاتَ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی جَعَلَ بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ نُوْرًا تَهْتَدُوْنَ بِهٖ هُدَی اللّٰهِ مُحَمَّدًا ﷺ وَ اِنَّ اَبَا بَکْرٍ صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ثَانِیَ اثْنَیْنِ فَاِنَّهٗ اَوْلَی الْمُسْلِمِیْنَ بِاُمُوْرِکُمْ فَقُوْمُوْا

فَبَايَعُوْهُ وَ كَانَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ قَدْ بَايَعُوْهُ قَبْلَ ذٰلِكَ فِيْ سَقِيْفَةِ بَنِيْ سَاعِدَةَ وَ كَانَتْ بَيْعَةُ الْعَامَّةِ عَلَى الْمِنْبَرِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کا دوسرا خطبہ (تقریر) سنا جب کہ وہ منبر پر بیٹھے۔ یہ نبی ﷺ کی وفات کا دوسرا روز تھا۔ انھوں نے خطبہ پڑھا اور ابوبکرؓ خاموش تھے، بول نہیں رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا انتقال ہمارے بعد ہوگا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ سب کے بعد انتقال فرمائیں گے۔ پھر اگر محمد ﷺ انتقال فرما گئے تو خدا تعالیٰ نے تمہارے سامنے نور پیدا کر دیا ہے جس کے ذریعہ سے تمہیں ہدایت ملے گی۔ اسی کے ذریعے سے تمہیں ہدایت ملتی ہے جس سے اللہ نے حضرت محمد ﷺ کی ہدایت فرمائی۔ اور بلا شبہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ابوبکرؓ جو غار میں دو میں دوسرے ساتھی تھے۔ پس وہ مسلمانوں میں تمہارے امور کے مالک ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔ لہٰذا اٹھو اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرو۔“

ان میں سے ایک جماعت اس سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ ہی میں بیعت کر چکی تھی اور بیعت عام منبر پر ہوئی۔

تشریح: نظمِ حکومت کو قائم رکھنے اور مملکت کے نظام کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک امیر ہو۔ اور امیر یا سربراہ مملکت اس شخص کو بنایا جائے جو تقویٰ، دیانت، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ وغیرہ ہر اعتبار سے اس اہم منصب کا اہل ہو۔ حضرت عمرؓ عام مسلمانوں میں یہ واضح کر دینا چاہتے تھے کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد ہم میں سے جو سب سے بڑھ کر امارت کے منصب کے لائق ہے وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ اس لیے سارے ہی مسلمانوں کو ان کی امارت پر اپنا اتفاق ظاہر کرنا چاہیے۔ چناں چہ حضرت عمرؓ کی تائید سب ہی نے کی اور بیعت عام ہوئی۔ اس سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک جماعت نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اپنی رضامندی ظاہر کر چکی تھی۔ لیکن پھر بھی ضروری تھا کہ اعتماد میں سارے ہی مسلمانوں کو لیا جائے تاکہ قوم میں کسی قسم کی بے اطمینانی اور شکایت نہ پائی جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اقتدار میں سارے ہی مسلمانوں کا حصہ ہوتا ہے۔ خلافت اور حکمرانی میں درحقیقت سبھی شریک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نظم کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کا ایک سربراہ یا

امیر ہو۔ امیر بہ ظاہر ایک ہوتا ہے لیکن در پردہ اس امارت اور حکمرانی میں سبھی کی شرکت ہوتی ہے۔ یہی حقیقی جمہوریت ہے۔ البتہ نبوت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ نبوت میں کسی پہلو سے کوئی نبی کا شریک نہیں ہوتا۔ نبی تو بس وہی شخص ہوتا ہے جس کو خدا نبوت کے منصب کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ نبی کے اپنے اعزہ واقربا نبی کی نبوت میں شریک نہیں ہوتے۔ یہ الگ بات ہے کہ خدا ان میں سے کسی کو خود نبوت سے سرفراز فرمائے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَرَضِهٖ اُدْعِيْ لِيْ اَبَابَكْرٍ اَبَاكِ وَ اَخَاكِ حَتّٰى اَكْتُبَ كِتَابًا فَاِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّتَمَنّٰى مُتَمَنٍّ وَ يَقُوْلُ قَائِلٌ اَنَا وَلَا وَيَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَا بَكْرٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض وفات میں مجھ سے فرمایا: ''(اے عائشہ!) اپنے والد ابوبکر اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ) کو میرے پاس بلادو تاکہ میں ایک تحریر (خلافت کے متعلق) لکھادوں۔ مجھے خوف ہے کہ (خلافت کی) تمنا رکھنے والا کوئی شخص اس کی تمنا کرے اور کوئی کہنے والا کہنے لگے کہ میں اس کا مستحق ہوں۔ حالاں کہ وہ اس کا مستحق نہ ہو۔ اور اللہ کو اور مومنین کو ابوبکر کے سوا کوئی منظور نہ ہوگا۔''

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوا کہ اپنے مرضِ وفات میں نبی ﷺ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ اپنے بعد خلافت کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو نامزد فرمادیں اور ایک تحریر اس سلسلے میں لکھ دیں۔ لیکن پھر آپؐ کو یقین ہوگیا کہ مشیتِ الٰہی یہی ہے کہ آپؐ کے بعد مومنین ابوبکر ہی کو خلیفہ منتخب کریں گے۔ وہ کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب نہیں کریں گے۔ اس لیے تحریر لکھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور مناسب یہی معلوم ہوا کہ بغیر کسی نامزدگی کے مومنین کے انتخاب کے ذریعے سے ابوبکر خلیفہ ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے خلیفہ مقرر کرنے کا ایک طریقہ نامزدگی اور استخلاف بھی ہوسکتا ہے اور انتخاب کے ذریعہ سے بھی خلیفہ کی تقرری ہوسکتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد فرمایا تو بہت ممکن ہے کہ حضور ﷺ کا قصد وارادہ ان کے سامنے رہا ہو اور اسے نامزدگی کے جواز کی دلیل قرار دی ہو۔

قرآن میں ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدہ:۲۰) ''اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا

تھا، ”اے میرے لوگو، اللہ کی اس نوازش کو یاد کرو جو تم پر رہی ہے، جیسا کہ اس نے تم میں نبی مقرر کیے، اور تمھیں بادشاہ بنایا۔“

اس آیت پر غور کریں۔ بنی اسرائیل سے خدا کی نوازش کا ذکر کیا جارہا ہے کہ کس طرح خدا کی ان پر عنایات رہی ہیں۔ ایک طرف تو انھیں حکمراں بنایا اور دوسری طرف ان کے اندر انبیاء مبعوث فرمائے۔ بنی اسرائیل کے تمام ہی افراد نبی نہ تھے۔ اس لیے ان سے فرمایا کہ تم میں انبیاء مقرر کیے (جَعَلَ فِيكُمْ اَنْبِيَآءَ)۔ لیکن حکمرانی کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ تم میں حکمراں (بادشاہ) بنائے بلکہ اس کے بجائے فرمایا کہ تمھیں حکمراں (بادشاہ) بنایا۔ حالاں کہ بنی اسرائیل کے سارے ہی افراد حکمراں یا بادشاہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود بادشاہت اور حکمرانی کو سب کی طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حکمرانی میں شرکت سبھی کی ہوتی ہے۔ انتظاماً قوم کا ایک فرد مملکت کی سربراہی کا فرض انجام دیتا ہے۔ جب کہ نبوت میں کسی طرح کی شرکت کی گنجائش نہیں ہوتی۔

امیر یا خلیفہ نظم حکومت کے تقاضے کے طور پر سب کی طرف سے ایک اہم ذمہ دارانہ منصب کو قبول کرتا ہے۔ وہ حکومت کے منصب پر فائز ہو کر اپنے لیے وہ زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنے میں نہیں لگ جاتا۔ تعیش کی زندگی گزارنے کے بجائے وہ خود کو لوگوں کا خادم تصور کرتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی حکومت میں کسی بھی شخص پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ ترقی کے مواقع سب کو حاصل ہوں اور کوئی بھی زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ رہنے پائے۔ یہ فکر اسے بے چین رکھتی ہے جب کہ عام لوگ اطمینان سے سو رہے ہوتے ہیں۔ احساسِ ذمہ داری سے اُس کی نیند اڑ جاتی ہے۔ اسے یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ کس طرح لوگوں کو مختلف پریشانیوں سے بچائے۔ وہ لوگوں کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ان کی ضروریات سے واقف ہو سکے۔ پھر وہ لوگوں کی دنیوی بھلائی ہی کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کی آخرت کی کامیابی کے لیے بھی فکر مند رہتا ہے اور اس کے لیے مناسب و موثر تدابیر سوچتا اور ان کو عمل میں لاتا ہے۔

بہترین قیادت

(۱) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکِ نِ الْاَشْجَعِيِّ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: خِيَارُ

اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیۡنَ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَکُمۡ وَ تُصَلُّوۡنَ عَلَیۡهِمۡ وَ یُصَلُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ وَ شِرَارُ اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیۡنَ تُبۡغِضُوۡنَهُمۡ وَ یُبۡغِضُوۡنَکُمۡ وَ تَلۡعَنُوۡنَهُمۡ وَیَلۡعَنُوۡنَکُمۡ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت رکھیں۔ تم ان کے لیے دعا کرو اور وہ تمہارے لیے دعا گو ہوں۔ اور تمہارے حاکموں میں بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ اور تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔''

تشریح: معلوم ہوا کہ بہترین حاکم عوام پر عذاب بن کر مسلط نہیں ہوتا۔ لوگوں سے اس کے اور اس سے لوگوں کے تعلقات نہایت خوش گوار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا سے محبت کرتا ہے اور رعایا بھی اسے جان و دل سے پسند کرتی ہے۔ اور خدا سے اس کے لیے دعائیں کرتی ہے۔ اس کے برخلاف بدترین حاکم وہ ہے جس سے لوگ حد درجہ متنفر ہوں اور وہ بھی لوگوں سے بغض و عناد رکھتا ہو۔ لوگ دعا کے بہ جائے اس پر لعنت بھیجتے ہوں۔ اور وہ بھی لوگوں پر لعنتیں برساتا رہتا ہو۔ اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایسے حاکم سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ وہ عوام کی کوئی خدمت کرسکتا ہے اور لوگوں کا تعاون حاصل کرنے میں کبھی اسے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنۡ عُمَرَ بۡنِ الۡخَطَّابؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اَفۡضَلَ عِبَادِ اللّٰهِ عِنۡدَ اللّٰهِ مَنۡزِلَةً یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِمَامٌ عَادِلٌ رَفِیۡقٌ وَ اِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنۡدَ اللّٰهِ مَنۡزِلَةً یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِمَامٌ جَائِرٌ خَرِقٌ. (بیہقی)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے: ''قیامت کے روز اللہ کے بندوں میں اللہ کے نزدیک مرتبہ و مقام کے لحاظ سے سب سے بہتر عادل و نرم خو حاکم ہوگا۔ اور قیامت کے روز اللہ کے نزدیک سب سے بدتر انسان ظالم اور سخت گیر حاکم ہوگا۔''

تشریح: یہ ایک اہم حدیث ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام رہبانیت کی تعلیم دینے کے لیے نہیں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئیڈیل اور مثالی شخص اس کو قرار دیا جارہا ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہو لیکن وہ عدل و انصاف پر قائم ہو۔ اور نرم خوئی اس کا شعار ہو۔ اس کے برعکس خدا کی نگاہ میں بدترین شخص اس حاکم کو قرار دیا جارہا ہے جو ستم پیشہ اور رعایا کے لیے سخت گیر ہو۔

〈۳〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ: اِمَامٌ عَادِلٌ وَشَابٌ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ فِیْ خَلَاءٍ فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ. وَ رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسْجِدِ وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ اِمْرَاَةٌ ذَاتَ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ اِلٰی نَفْسِهَا قَالَ: اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰی لَاتَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا صَنَعَتْ یَمِیْنُهٗ.

(بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ قیامت کے روز سات قسم کے لوگوں کو اپنے سایہ میں جگہ عنایت فرمائے گا جس روز کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا: امام عادل، وہ نوجوان جس کی نشو ونما اللہ کی بندگی میں ہوئی، وہ شخص جس نے خدا کو تنہائی میں یاد کیا اور اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے، وہ دو افراد جو باہم اللہ کے لیے محبت کریں، وہ شخص جسے کوئی منصب والی حسین عورت اپنی طرف بلائے اور وہ کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں (اس لیے برا کام میں نہیں کرسکتا)، اور وہ جو چھپا کر اس طرح صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا کیا۔''

تشریح: اس حدیث میں امام عادل کو ان سات قسم کے لوگوں میں شمار کیا گیا ہے جو خدا کے خاص منظورِ نظر ہوں گے اور قیامت کی سختیوں سے مامون ومحفوظ ہوں گے۔ قیامت کے روز جن کو خدا اپنے سایہ رحمت میں لے لے گا اور وہ کسی قسم کی پریشانی اور سختی سے دوچار نہ ہوں گے۔ امام عادل کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس کا شمار ان نوجوانوں میں کیا جائے گا جن کی نشو ونما خدا کی بندگی میں ہوئی ہو۔ اور وہ ان پاک بازوں میں شامل سمجھا جائے گا جو خدا کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں۔ اور اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہوگا جو خدا کے خوف سے گناہوں سے دور رہتے ہیں۔ کوئی گناہ خواہ اپنے اندر کتنی ہی کشش اور جاذبیت کیوں نہ رکھتا ہو اور وہ نفس کے لیے خواہ کتنا ہی لذت بخش کیوں نہ ہو جو اپنے کو اس سے دور رکھتے ہیں اور امام عادل کو ان لوگوں میں شمار کیا جائے گا جو حق کے ایسے مزاج شناس ہوتے ہیں کہ ریاکاری اور نام ونمود کی خواہش کا جن کے یہاں شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو۔

〈۴〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ

الْمُقْسِطِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ عَلٰى مَنَابِرَ مِّنْ نُّوْرٍ عَنْ يَّمِيْنِ الرَّحْمٰنِ وَ كِلْتَا يَدَيْهِ يَمِيْنٌ، اَلَّذِيْنَ يَعْدِلُوْنَ فِيْ حُكْمِهِمْ وَ اَهْلِيْهِمْ وَمَا وَلُوْا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عادل حکمراں اللہ کے یہاں نور کے منبروں پر رحمان کے دائیں ہاتھ کی طرف ہوں گے اور اللہ کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ جو اپنے احکام، اپنے اہل اور اپنے زیرِ تصرف امور میں عدل و انصاف کرتے ہیں۔''

تشریح: عادل حکمراں تاریکی کے پرستار نہیں ہوتے۔ وہ ظلم وستم کے روادار نہیں ہوتے۔ اس لیے جن منبروں پر ان کو جگہ دی جائے گی وہ منبر بھی نورانی اور روشن ہوں گے۔ مرتبہ ومنزلت کے حاملین ہمیشہ دائیں جانب جگہ پاتے ہیں، خدا کے یہاں بھی اس کے دائیں ہاتھ کی طرف ہوں گے۔ یہ جو فرمایا کہ رحمٰن کے دونوں ہی ہاتھ داہنے ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ یہاں دایاں بائیں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے۔ بایاں ہاتھ دائیں کے مقابلے میں کمزور ہوتا ہے اور خدا ہر طرح کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ رحمان کے دائیں ہاتھ سے مراد کیا ہے؟ اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یوں ہاتھ کا استعمال قوت اور قدرت کے لیے بھی ہوتا ہے۔

عادل حکمراں حقیقت میں وہی ہوتے ہیں جو ہمیشہ اور ہر معاملہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حکومت سے متعلق امور کی انجام دہی کا معاملہ ہو یا اپنے ماتحت لوگوں کے حقوق کے ادا کرنے کا معاملہ ہو، وہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں جو افراد اور جو لوگ ان کی نگرانی میں کام کرتے ہیں ان کے سلسلہ میں بھی وہ اپنے فرائض کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کو انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

بدترین قیادت

〈۱〉 عَنْ عَائِذِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ الشَّرَّ الرِّعَاءِ الْحُطَمَةُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائذ ابن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''حاکموں میں بدترین حاکم وہ ہے جو ظالم ہو۔''

تشریح: حاکم کے ہاتھ میں چوں کہ حکومت کی طاقت ہوتی ہے، وہ بااقتدار ہوتا ہے اس لیے وہ اگر ظالم ہوا تو اس کا ظلم وستم عام ظالموں سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہوگا۔ حاکم میں اگر کچھ دوسرے عیوب ہیں لیکن وہ ظالم نہیں ہے تو اس سے اس درجہ کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا جس درجہ کا نقصان کسی ظالم حاکم کے ذریعہ سے پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے بدترین حاکم ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

〈۲〉 وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌ لَهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ.

(بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت معقل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو حاکم بھی حکومت و سیادت حاصل کر کے اپنی رعیت پر حکمرانی کرے اور اس کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ خائن وظالم ہو تو لازماً خدا اس پر جنت حرام کردے گا۔''

تشریح: یعنی خائن اور ظالم حکمراں اگر اپنے ظلم وستم سے باز نہیں آتا یہاں تک کہ موت ہی آ کر لوگوں کو اس سے نجات دلاتی ہے تو ایسے ظالم وخائن شخص کے لیے خدا کی جنت میں کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ اُسے ٹھکانا دوزخ ہی میں مل سکتا ہے۔

〈۳〉 وَعَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت معقل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس بندے کو بھی خدا رعیت کی نگہبانی سپرد کرے اور وہ خیرخواہی کے ساتھ نگہبانی نہ کرے تو لازماً وہ جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔''

تشریح: حاکم کو رعیت کا خیرخواہ ہونا چاہیے۔ وہ اگر اپنی رعیت کے ساتھ بدخواہی کرتا ہے۔ رحمت کے بجائے لوگوں کے لیے مصیبت ثابت ہوتا ہے تو اس کے قدرناشناس ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ خدا نے تو اسے اپنی مخلوق کی خدمت اور نگہبانی کا کام سونپا تھا اور وہ اپنی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر بیٹھا۔ ایسا قدرناشناس آخرت میں خدا کی نوازشوں سے محروم رکھا جائے گا۔ ایسا شخص جنت تو کیا جنت کی خوشبو تک نہیں پاسکتا۔

〈۴〉 وَعَنِ بْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ اُمَّتِیْ وَلِیَ مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ شَیْئًا لَّمْ یَحْفَظْھُمْ بِمَا یَحْفَظُ بِہٖ نَفْسَہٗ وَ اَھْلَہٗ اِلَّا لَمْ یَجِدْ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ. (المعجم الصغیر للطبرانی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے جو شخص بھی مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنا پھر اس نے اس طرح سے ان کی حفاظت نہیں کی جس طرح وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے تو لازماً وہ جنت کی خوشبو تک نہ پا سکے گا۔''

تشریح: اسلامی نقطۂ نظر سے حاکم کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اپنے اہل وعیال کی طرح عزیز رکھے، جس طرح کوئی شخص اپنی ذات اور اپنے اعزہ واقربا کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے ٹھیک اسی طرح اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور اس کی حفاظت و خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اب اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے لوگوں کی حفاظت سے کنارہ کش رہتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ آخرت میں وہ خدا کی عنایت کا کسی طرح مستحق نہیں ہو سکتا۔ آخرت میں وہ خدا کی جنت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

امیر کی ذِمہ داری

〈۱〉 عَنِ ابْنِ اَبِیْ بُرْدَۃَؓ قَالَ: بَعَثَ النَّبِیُّ ﷺ جَدَّہٗ اَبَا مُوْسٰی وَ مَعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ فَقَالَ: یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَ بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَ تَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن ابی بردہؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ان کے دادا ابو موسیٰؓ اور معاذؓ کو (امیر و حاکم بنا کر) یمن بھیجا تو فرمایا: ''آسانی کا برتاؤ کرنا، مشکلات میں نہ ڈالنا۔ خوش خبری دینا، متنفر نہ کرنا، باہم اتفاق واتحاد قائم رکھنا، اختلاف نہ کرنا۔''

تشریح: یعنی حاکم کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ اس کا سلوک رعایا کے ساتھ سختی کے بجائے نرمی کا ہو۔ اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو مشکلات سے نکالے نہ کہ اس کی وجہ سے لوگ مشکلات میں مبتلا ہو جائیں۔ اس کی موجودگی لوگوں کے لیے خوش خبری کا سامان ہو۔ وہ ایسا انداز ہرگز اختیار نہ کرے کہ لوگ بیزار ہوں اور اس کو اپنے لیے مصیبت تصور کرنے لگ جائیں۔ دین کی اصل

حیثیت بشارت ہی ہے۔ لوگ دین وایمان کو نعمت کے بجائے ناخوش گوار بوجھ سمجھنے لگیں تو یہ ان کی ناسمجھی ہے اور اگر اس میں حاکم کے غلط رویہ کا دخل ہو تو جان لیں کہ حاکم دین کی صحیح نمایندگی سے قاصر ہے۔ حاکم کی یہ بھی ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں میں باہم اتفاق واتحاد کی فضا کو باقی رکھے۔ وہ لوگوں کو افتراق واختلاف سے بچائے۔ افتراق اور تحزب درحقیقت ایک سنگین جرم ہے۔ حاکم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سلسلہ میں نہایت حساس واقع ہوا ہو۔ وہ لوگوں کو افتراق واختلاف کے مرض سے محفوظ رکھے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَللّٰهُمَّ مَنْ وُلِیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِی شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْفُقْ عَلَيْهِ وَ مَنْ وُلِیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِی شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ فَارْفُقْ بِهٖ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ، جس کسی کو میری امت کے امور میں سے کسی کا والی بنایا گیا پھر وہ لوگوں پر مشقت وسختی مسلط کر دے، اس پر تو بھی مشقت وسختی مسلط کر دے اور جس کسی کو میری امت کے امور میں سے کسی کا والی بنایا گیا اور اس نے لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا تو اس کے ساتھ تو بھی نرمی کا معاملہ فرما۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کو اپنی امت سے کس درجہ محبت ہے۔ آپؐ کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ حاکم یا والی کا معاملہ لوگوں کے ساتھ نرمی وشفقت کا نہ ہو اور وہ لوگوں کو مشقتوں اور سختیوں میں ڈال دے۔ اسی لیے آپؐ کی زبان مبارک سے دعائیہ کلمات اس حاکم کے لیے نکلے ہیں جس کا سلوک رعایا کے ساتھ رفق اور نرمی کا ہو۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰی بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِیَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''خبردار تم میں

سے ہر ایک رعیت کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ پس سربراہ مملکت جو لوگوں کا نگہبان ہے وہ اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے اہلِ خانہ کا نگہبان ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی اور اس کے بچوں کی نگہبان ہے اس سے ان کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے۔ وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔ خبردار! تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے ذمہ دار ہے اور اسے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیے۔ قیامت کے روز ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں دریافت کیا جائے گا کہ اس نے اسے کہاں تک پورا کیا۔ سربراہِ مملکت سے اگر رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس نے کہاں تک اپنی رعیت کی نگہبانی کا حق ادا کیا تو مرد سے اس کے اہل خانہ کے بارے میں اور عورت سے شوہر کے گھر اور بچوں کی نگہبانی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس نے اس کا کہاں تک خیال رکھا۔ اسی طرح غلام اور خادم سے دریافت کیا جائے گا کہ اس نے اپنے آقا کے مال کی حفاظت اور نگہبانی کی یا نہیں۔ الغرض ہر شخص کسی نہ کسی حیثیت سے نگراں اور نگہبان ہے اسے اپنی ذمہ داری کی طرف سے ہرگز غافل نہیں رہنا چاہیے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ مُعَاوِيَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَا مُعَاوِيَةُ، اِنْ وُلِّيْتَ اَمْرًا فَاتَّقِ اللّٰهَ وَاعْدِلْ، قَالَ: فَمَا زِلْتُ اَظُنُّ اِنِّيْ مُبْتَلًى بِعَمَلٍ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ حَتّٰى ابْتُلِيْتُ. (احمد)

ترجمہ: حضرت امیر معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "اے معاویہ، اگر تمھیں والی وحاکم مقرر کیا جائے تو اللہ کا ڈر رکھنا اور عدل کے دامن کو ہرگز نہ چھوڑنا۔"

حضرت امیر معاویہؓ کہتے ہیں کہ مجھے برابر یہ خیال رہا کہ نبی ﷺ کے فرمانے کے بہ موجب میں لازماً امارت میں مبتلا کیا جاؤں گا، یہاں تک کہ میں مبتلا کیا گیا۔

تشریح: یہ حدیث درحقیقت ایک پیش گوئی ہے۔ چناں چہ یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی۔ حضور ﷺ نے حضرت معاویہؓ کو جو نصیحت کی وہ یہ کہ حکومت ہاتھ میں آئے تو تم خدا سے غافل نہ ہوجانا، اللہ سے ڈرتے رہنا اور ہمیشہ عدل و انصاف کے تقاضے کو ملحوظ رکھنا۔

اجتماعی نظم

〈۱〉 عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ رَاٰی مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئًا یَکْرَھُهٗ فَلْیَصْبِرْ عَلَیْهِ فَاِنَّهٗ لَیْسَ اَحَدٌ یُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَیَمُوْتُ اِلاَّ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اسے چاہیے کہ صبر سے کام لے۔ کیوں کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا اور وہ مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔‘‘

تشریح: اسلام میں اجتماعیت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے اسلام اجتماعی تنظیم کو مضبوط سے مضبوط تر دیکھنا چاہتا ہے۔ مضبوط تنظیم کے بغیر یہ امت وہ عظیم کام انجام نہیں دے سکتی جس کے لیے اسے وجود میں لایا گیا ہے۔ بلکہ مضبوط تنظیم کے بغیر امت کا خود اپنا وجود ہی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اجتماعی نظم کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ضروری ہے۔ امام و امیر اور لیڈر شپ کے بغیر اجتماعی تنظیم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچے اس کے لیے امیر کی بعض کمزوریوں کو گوارا کرنا چاہیے۔ اور صبر و تحمل اور حکمت کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کمزوریاں دور ہو جائیں۔ لیکن اس کے بجائے اگر کوئی امام یا امیر سے بد دل ہو کر اپنے کو امام یا امیر کی اطاعت سے آزاد کر لیتا ہے اور مسلمانوں کی تنظیم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور موجودہ اجتماع و اتحاد کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں اس کو موت آ جاتی ہے تو اس کی موت جاہلیت پر ہو گی۔ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس سے ایک بالشت بھی الگ ہونا اس کی نگاہ میں کسی ستم سے کم نہیں۔

〈۲〉 وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ فَمَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً وَمَنْ قَاتَلَ تَحْتَ رَایَةٍ عُمِّیَّةٍ یَغْضَبُ بِعَصَبِیَّةٍ اَوْ یَدْعُوْا لِعَصَبِیَّةٍ اَوْ یَنْصُرُ عَصَبِیَّةً فَقُتِلَ فَقِتْلَةٌ جَاهِلِیَّةٌ وَمَنْ خَرَجَ عَلٰی اُمَّتِیْ بِسَیْفِهٖ یَضْرِبُ بَرَّهَا وَ فَاجِرَهَا وَلاَ یَتَحَاشٰی مِنْ مُؤْمِنِهَا وَلاَ یَفِیْ لِذِیْ عَهْدٍ عَهْدَهٗ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَلَسْتُ مِنْهُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص (امیر کی) اطاعت سے نکل جائے اور جماعت سے الگ ہو جائے تو ایسے شخص کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اور جو شخص اندھے پرچم کے تحت جنگ کرے، عصبیت (جاہلی) سے برانگیختہ ہو یا عصبیت کی طرف دعوت دے یا عصبیت کی حمایت کرے، پھر اسی حال میں مارا گیا تو وہ جاہلیت کی حالت میں مارا گیا۔ اور جو کوئی میری امت کے خلاف خروج کرے، حال اس کا یہ ہو کہ وہ نیک و بد سب کو مارتا ہے اور مومن کا کوئی لحاظ نہیں کرتا اور صاحبِ عہد و پیمان کو پورا نہیں کرتا ہے تو ایسا شخص مجھ سے نہیں اور نہ میں اس سے ہوں۔“

تشریح: یعنی علم و بصیرت کے بغیر جو پرچم بلند کیا جا رہا ہو اور نظمِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے کے لیے جنگ کی جا رہی ہو تو جو شخص اس جنگ میں شریک ہوتا ہے اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اسلام کے لیے نہیں جاہلیت کی حمایت میں برسرِ پیکار ہو رہا ہے۔

جو شخص اسلامی شعور سے بے گانہ ہو کر جاہلی جذبات سے برانگیختہ ہو یا اسلام کے بجائے جاہلی عصبیت کی طرف لوگوں کو دعوت اور جاہلی عصبیت کی حمایت میں سرگرم ہو اور اسی حالت میں مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت ہی کی موت ہوگی۔

حضور ﷺ صاف طور سے اعلان فرما رہے ہیں کہ اس شخص سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں ہے جو آپؐ کی امت سے خروج کرے۔ نہ اسے نیک و بد کا لحاظ ہو نہ وہ مومن اور غیر مومن میں کوئی فرق کرتا ہو۔ کسی کو تہِ تیغ کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہو۔ اور نہ اسے اس کی پروا ہو کہ کسی سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ عصبیت میں وہ اتنا اندھا ہو گیا ہو کہ عہد شکنی کو وہ سرے سے معیوب ہی نہ سمجھتا ہو۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ خَلَعَ يَداً مِّنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَاحُجَّةَ لَهٗ وَمَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جو اپنا ہاتھ اطاعت سے الگ کر لے وہ قیامت کے روز خدا سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس (اپنے اس عمل کے حق میں) کوئی دلیل نہ ہوگی۔ اور جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اس

کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ ہو تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

تشریح: کوئی اجتماعی نظم سمع و طاعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اب اگر کوئی شخص اطاعت امیر کو اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتا اور اپنے کو اطاعت سے الگ کر لیتا ہے تو قیامت کے روز اس کے پاس اپنی اس روش کے حق میں کوئی دلیل و حجت نہ ہوگی۔ وہ خدا کے یہاں سراپا مجرم قرار پائے گا۔

اسلامی زندگی کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ آدمی امام یا امیر کی قیادت کو تسلیم کرتا ہو۔ امیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے لیے لازم قرار دیتا ہو۔ اگر کوئی شخص ایسا ہے جو بیعت اور امیر کی اطاعت سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے اور اسی حالتِ بے نیازی میں اس کی موت آجاتی ہے تو یہ موت لازماً جاہلیت کی ہوگی۔ خدا کے یہاں وہ ہرگز کامیاب اور سرخ رو نہیں ہو سکتا۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَرْفَجَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ اَتَاكُمْ وَ اَمْرُكُمْ جَمِيْعٌ عَلٰى رَجُلٍ وَاحِدٍ يُرِيْدُ اَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ اَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْا.
(مسلم)

ترجمہ: حضرت عرفجہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو شخص تمہارے پاس آئے جب کہ ایک شخص کی قیادت پر سب کا اتفاق ہو چکا ہو اور وہ تمہاری جمعیت کو توڑنا چاہے یا تمہاری جماعت میں افتراق پیدا کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو۔''

تشریح: اجتماعی تنظیم میں تفرقہ پیدا کرنا سنگین جرم ہے۔ جب ایک شخص پر سب کا اتفاق ہو گیا تو پھر اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا حقیقت میں اسلام کی طاقت کو نقصان پہنچانا اور اجتماعی تنظیم کو درہم برہم کرنا ہے۔ یہ ایسا سنگین جرم ہے جسے کسی حال میں بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس جرم کی سزا، سزائے موت سے کم نہیں ہو سکتی۔ حدیث کے ترجمے میں جس فقرے کا ترجمہ ہم نے ''اور وہ تمہاری جمعیت کو توڑنا چاہے'' کیا ہے وہ فقرہ ہے: يُرِيْدُ اَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ ''وہ تمہاری لاٹھی کو چیر ڈالنا چاہے۔'' حدیث میں اجتماعی قوت اور اہلِ اسلام کے اتحاد و اتفاق اور کسی ایک رائے پر مجتمع ہو جانے کو لاٹھی، سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ تعبیر کتنی بامعنی ہے اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يَكُوْنُ عَلَيْكُمْ اُمَرَاءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ فَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ بَرِئَ وَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰكِنْ مَنْ رَّضِيَ وَ تَابَعَ

قَالُوْا: اَفَلاَ نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لاَ مَاصَلُّوْا لاَ مَاصَلُّوْا. (مسلم)

ترجمہ: ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر ایسے امراء بھی مقرر کیے جائیں گے جن کے اچھے کام بھی تم دیکھو گے اور برے کام بھی تم دیکھو گے۔ جس نے انکار کیا وہ بری الذمہ ہو گیا اور جس نے اسے برا سمجھا وہ سالم و محفوظ رہا۔ لیکن جو (حاکم کے برے فعل پر) راضی ہوا اور اس کی پیروی کی وہ تباہ ہوا، صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ان کے خلاف جنگ نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، جب تک وہ نماز ادا کریں، نہیں جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔''

تشریح: یعنی جس نے برائی کو برائی کہا اور اس کے خلاف آواز اُٹھائی اس نے اپنا فرض ادا کیا اور جس کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ وہ برائی کو برملا برائی کہہ سکے مگر اپنے دل میں اس نے برائی کو ناپسند کیا تو ایسا شخص بھی برائی میں شریک ہونے کے وبال سے محفوظ رہا۔ لیکن اگر کوئی شخص حکمراں کے برے افعال پر راضی رہا اور اس کی پیروی کی تو وہ ہرگز برائی کے وبال سے بچ نہیں سکتا۔ وہ کسی طرح بھی اپنے کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناپسندیدہ امور کے باوجود حکومت کے خلاف جنگ کرنی صحیح نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ اقدام اس خرابی سے بڑی خرابی اور تباہی کا موجب ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے یہ اقدام کیا جارہا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو جو نظم حکومت قائم ہے اسے باقی رکھا جائے اور جو خرابی رونما ہوگئی ہوں ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ جنگ یا حکومت کو بدل دینے کے لیے کوئی اقدام تو آخری چارۂ کار ہے۔ جب حکومت بالکل ہی اسلام کے اعلیٰ مقاصد کو فراموش کردے یہاں تک کہ اقامتِ صلوٰۃ تک سے گریز اختیار کرے۔ اور کسی پہلو سے بھی وہ اس کی گنجائش باقی نہ رکھے کہ اسے اسلامی حکومت کہا جاسکے۔ اسلام کے بجائے باطل کی حکمرانی اگر قائم ہوجاتی ہے تو پھر اس سے نکلنے کے لیے سعی و جہد کرنا مسلمانوں کا فرض ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی کارگر اور نتیجہ خیز تدبیر اختیار کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس کے لیے جنگ بھی کی جاسکتی ہے۔ آج کے دور میں اس کے لیے کارگر اور نتیجہ خیز تدبیر یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر وہ روح اور اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلامی حکومت کے سوا کوئی بھی طرزِ حکومت اس کے لیے قابلِ قبول نہ ہوسکے۔

امیر کی تعظیم

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰہِ اِکْرَامُ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ وَ حَامِلِ الْقُرْاٰنِ غَیْرُ الْغَالِیْ فِیْہِ وَالْجَافِیْ عَنْہُ وَ اِکْرَامُ ذِی السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ کی تعظیم میں سے ہے بوڑھے مسلمان اور اس حامل القرآن کا اکرام جو نہ اس میں غلو اختیار کرتا ہو اور نہ اس میں کوئی اور کوتاہی کرتا ہو اور اس حاکم کا اکرام جو منصف ہو۔''

تشریح: تعظیم و اکرام کے مستحق جو لوگ ہوں ان کا اکرام و تعظیم ضروری ہے۔ یہی تہذیبِ اسلامی کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ معاشرہ اگر قابل تعظیم ہستیوں کی توقیر و تعظیم نہیں کرتا تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ معاشرہ میں ابھی اسلامی اقدار کا شعور پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ خدا کی عظمت اور بزرگی کا احساس اس کے تصور کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے خدا کی تعظیم کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ لیکن بندگانِ خدا کے حقوق کو بالعموم ہم فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو کسی پہلو سے کوئی فضیلت حاصل ہے تو یہ فضیلت تعظیم کی متقاضی ہوتی ہے۔ کسی صاحبِ فضل کی حق تلفی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ پسند نہیں کہ خدا کسی کو کوئی فضیلت عطا کرے۔ یہ تو خود خدا کے جلال اور اس کی عظمت کا انکار ہے۔ خدا کے ساتھ مطابقت اور موافقت تو یہ ہے کہ ہم ہر اس شخص کی فضیلت کو تسلیم کریں جس کو زندگی میں کوئی فضیلت اور امتیاز حاصل ہو۔

بڑی عمر والا اپنی عمر کے لحاظ سے اس کا حق دار ہے کہ اس کی بزرگی کا لحاظ رکھا جائے۔ جو شخص قرآن سے شغف رکھتا اور اس کے آداب کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ نہ وہ قرآن کریم کی تلاوت میں اس کے حسن و وقار کو نقصان پہنچاتا ہے اور نہ وہ اس کے معنی و مفہوم کے اخذ کرنے میں کبھی حق و انصاف کو نظر انداز کرتا ہے۔ ایسا شخص بھی ہمارے اکرام کا مستحق ہے۔ جتنی قدر و قیمت ہمارے دل میں قرآن حکیم کی ہوگی اتنی ہی زیادہ ہم ایسے حاملین قرآن کی تعظیم کریں گے۔ اسی طرح وہ صاحبِ اقتدار شخص یا حاکم بھی فضیلت رکھتا ہے جس کی حکمرانی عدل و انصاف کے لیے ہوتی ہے۔ ایسا امیر یا حاکم حقیقت میں مثالی شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی اطاعت ہی نہیں توقیر و تعظیم بھی ضروری ہے۔

اتحاد

〈۱〉 عَنْ يَحْيٰى بْنِ سَعِيْدٍ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍؓ حِيْنَ خَرَجَ مَعَهٗ اِلَى الْوَلِيْدِ قَالَ دَعَا النَّبِيُّ ﷺ الْاَنْصَارَ اِلٰى اَنْ يُّقْطِعَ لَهُمُ الْبَحْرَيْنِ فَقَالُوْا لَا اِلَّا اَنْ يُّقْطِعَ لِاِخْوَانِنَا مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ مِثْلَهَا قَالَ: اِمَّا لَا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى تَلْقَوْنِىْ فَاِنَّهٗ سَيُصِيْبُكُمْ بَعْدِىْ اُثْرَةٌ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت یحییٰ بن سعید نے حضرت انس بن مالکؓ سے جب وہ ان کے ساتھ ولید کے پاس جا رہے تھے یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ نے انصار کو بحرین کی جاگیران کے نام لکھنے کے لیے بلایا تو انصار نے عرض کیا کہ نہیں الا یہ کہ ہمارے بھائی مہاجرین کو بھی ایسی ہی جاگیر عطا فرمائیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اگر تمھیں منظور نہیں تو صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے (حوض کوثر پر) ملو۔ کیوں کہ میرے بعد تمھارے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔''

تشریح: انصار کو اپنے بھائی مہاجرین سے جو محبت تھی اور انھیں اپنے مہاجر بھائیوں کی جس درجہ فکر رہتی تھی اس کا اندازہ انصار کے اس بیان سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ انھیں یہ منظور نہیں ہوا کہ مہاجرین سے ہٹ کر ان کو کوئی جاگیر یا جائداد عطا کی جائے۔ ایسی قربانی اور ایثار کی مثالیں پیش کرنے سے قوموں کی تاریخ قاصر نظر آتی ہے۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ اے انصار، تمھارے اندر ایثار و قربانی کا جو وصف پایا جاتا ہے اس سے کسی حال میں بھی کنارہ کش نہ ہونا، قوم وملت کے اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے ہر طبقہ کے اندر جذبۂ ایثار پایا جائے۔ اگر ہر طبقے کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کم از کم اس طبقے کے اندر تو یہ وصف پایا جانا ہی چاہیے جسے رہنمائی کا منصب حاصل ہو اسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس کے بغیر امت کا اتحاد اور اس کی تنظیمی قوت باقی نہیں رہ سکتی۔

حضور ﷺ انصارؓ کو وصیت فرماتے ہیں کہ دنیا سے میرے رخصت ہونے کے بعد اس کا قوی امکان ہے کہ تمھارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے تو ایسے موقع پر تم شکستہ دل نہ ہونا، بلکہ صبر وضبط سے کام لینا۔ تمھیں نظر انداز کیا جائے تو اس کے خلاف تمھاری طرف سے کوئی

مظاہرہ (Agitation) نہیں ہونا چاہیے۔ جب آخرت میں حوض کوثر پر تم مجھ سے ملو گے تو دل میں کوئی ملال اور شکایت ہوگی بھی تو وہ دور ہو جائے گی۔ لَاعَیشَ اِلاَّ عَیشَ الْاٰخِرَۃِ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔ وہی تمہارے پیش نظر رہے۔

شورائیت

﴿۱﴾ عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِذَا کَانَ اُمَرَاؤُکُمْ خِیَارُکُمْ وَ اَغْنِیَاءُ کُمْ سُمَحَاءُ کُمْ وَ اُمُوْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ فَظَھَرَ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ بَطْنِھَا. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے قائد اور سربراہ وہ لوگ ہوں جو تم میں بہترین لوگ ہوں، اور تمہارے دولت مند لوگ فیاض ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے انجام پاتے ہوں تو اس وقت زمین کی پشت تمہارے لیے اس کے پیٹ سے بہتر ہوگی۔''

تشریح: ایک مثالی مملکت اسی کو کہیں گے جس میں امامت اور قیادت کے منصب پر ایسے لوگ فائز ہوں جو اپنے کردار، اور اخلاقی اور فکری خوبیوں کے اعتبار سے سب میں نمایاں ہوں۔ بہ صورت دیگر مملکت اور سلطنت کی بربادی اور تباہی یقینی ہے۔ مثالی معاشرہ کے لیے ضروری نہیں کہ اس معاشرہ میں ہر شخص دولت وثروت کا مالک ہو۔ مثالی (Ideal) معاشرہ میں دولت مند اور غریب ہر طرح کے لوگ پائے جا سکتے ہیں۔ مثالی معاشرہ کو جو چیز مثالی بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے خوش حال لوگ صرف اپنے حال میں مست نہیں رہتے کہ انھیں دوسروں کی فکر ہی نہ ہو۔ بلکہ انھیں غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی پورا خیال رہتا ہے۔ وہ فیاض ہوتے ہیں۔ دوسروں کی حاجت روائی سے انھیں روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کو وہ اپنی دولت وثروت کا حاصل سمجھتے ہیں۔

مثالی معاشرے میں برے اور جرائم پیشہ لوگ بھی پائے جا سکتے ہیں لیکن وہ آزاد دندناتے نہیں پھرتے۔ معاشرے میں غلبہ صالحیت اور نیکی کو حاصل ہوتا ہے۔ برائی بے قابو نہیں کنٹرول میں رہتی ہے۔

حکومت ہو یا کوئی اجتماعیت اس کے استحکام کے لیے اتحاد واتفاق اور فکری ہم آہنگی

ضروری ہے۔ استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اجتماعی امور میں جابرانہ انانیت کے بجائے شورائیت کی کارفرمائی ہو۔ معاملات اور اہم امور باہمی مشورے سے طے کیے جاتے ہوں۔ اس طرح مسائل کے تمام ہی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس طرح فیصلہ میں غلطی کے امکانات بہت ہی کم رہ جاتے ہیں۔ پھر جس فیصلہ کو جمہور کی تائید وتوثیق حاصل ہوتی ہے اس کی اہمیت سبھی کی نگاہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح معاشرہ میں بے اطمینانی اور کسی انتشار کے مواقع باقی نہیں رہتے۔ خود نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ آپؐ پیش آنے والے معاملات اور مہمات کے سلسلہ میں مومنین سے مشورہ کرلیا کریں۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:۱۵۹) معاشرہ میں اگر مثالی معاشرہ کی وہ ساری خوبیاں پائی جاتی ہوں جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے تو پھر زمین کی پشت اس کے پیٹ سے بہتر ہے۔ یعنی ایسے معاشرے اور ایسی مملکت میں زندگی بسر کرنی ہر پہلو سے مبارک ہے۔ بہ صورت دیگر زمین کی پشت کے مقابلے میں اس کا پیٹ یعنی ایسے معاشرے کی زندگی کے مقابلہ میں موت زیادہ بہتر ہوگی۔

نظمِ مملکت

بیعت

﴿۱﴾ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَ اَنْ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَ اَنْ نَقُوْمَ اَوْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ حَیْثُ مَا کُنَّا لاَ نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لاَئِمٍ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے خوشی اور ناخوشی ہر حال میں سمع وطاعت پر بیعت کی تھی اور اس بات پر کہ ہم خلافت کے معاملہ میں کسی حق دار شخص سے کوئی جھگڑا نہیں کریں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق کو قائم رکھیں گے یا حق ہی کہیں گے اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت سے ہم ڈریں گے نہیں۔

تشریح: راوی کو شبہ ہے کہ ''حق کو قائم رکھیں گے'' فرمایا: ''حق ہی کہیں گے'' فرمایا۔

کوئی بھی نظامِ مملکت سمع وطاعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے سمع وطاعت کی بیعت لی تھی کہ وہ ہر حال میں قائد کا حکم سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ قائد یا امیر کی نافرمانی سے اپنے کو دور رکھیں گے۔ حالات جیسے بھی ہوں خوشی کے یا ناخوشی کے جذبہ سمع وطاعت میں کوئی فرق نہیں آنے دیں گے۔ خلافت کی اہلیت کا حامل جو شخص بھی ہو اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے۔ اس کی خلافت کو بسر وچشم تسلیم کریں گے۔ جہاں اور جس حال میں ہوں گے قیامِ حق ہی ان کا اصل نصب العین ہوگا اور زبان پر حق بات ہی آئے گی۔

آخری چیز جس کا بیعت میں ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کے معاملے میں کسی ملامت گر کی

پروانہیں کریں گے۔ یعنی کسی کی ملامت کے خوف سے خدا کی اطاعت اور اس کے دین کی پیروی سے گریز کریں، ایسا نہیں ہوگا۔

اسلامی مملکت میں امیر یا خلیفہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وحدت کو ہر قسم کے انتشار سے بچانا اہلِ ایمان کا فرض ہوتا ہے۔ پیشِ نظر ہمیشہ حق کا قیام ہو۔ خلیفہ یا امیر سے بیعت محض حق کے قیام ہی کے لیے کرنی چاہیے۔ اس کی محرک کوئی مادی منفعت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز خدا بات کرنے کا روادار نہ ہوگا اور نہ ان کا تزکیہ فرمائے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب مقرر ہے۔ ان میں سے ایک ''وہ شخص ہے جو امام وقت سے صرف دنیا کے لیے بیعت کرتا ہے۔ اگر اس نے اس کے خیال کے مطابق اسے کچھ دے دیا تو اس نے اس کے ساتھ وفاداری کا رویہ اختیار کیا بہ صورتِ دیگر اس نے وفا سے ہاتھ کھینچ لیا (بخاری)۔ (وَرَجُلٌ بَايَعَ اِمَامًا لَا يُبَايِعُهٗ اِلاَّ لِلدُّنْيَا فَاِنْ اَعْطَاهُ مَا يُرِيْدُ وَ فٰى لَهٗ وَ اِلاَّ لَمْ يَفِ لَهٗ)

امیر کی اطاعت اور وفاداری کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ آدمی حق گوئی سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ کے رویہ کے بارے میں شبہ ہوا تو برسرِ منبر انھیں ٹوک دیا گیا اور انھوں نے اِسے برا نہیں مانا۔

حکومت کے حقوق وفرائض

﴿۱﴾ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ اَطَاعَنِىْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِىْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِىْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِىْ وَ اِنَّمَا الْاِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتِلُ مِنْ وَّرَائِهٖ وَ يُتَّقٰى بِهٖ فَاِنْ اَمَرَ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَعَدَلَ فَاِنَّ لَهٗ بِذٰلِكَ اَجْرًا وَ اِنْ قَالَ بِغَيْرِهٖ فَاِنَّ عَلَيْهِ مِنْهُ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس کسی نے اپنے امیر کی اطاعت کی اس نے درحقیقت میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے حقیقت میں میری نافرمانی کی۔ امام (سربراہ مملکت) کو سپر کی حیثیت حاصل

ہے جس کے پیچھے (جس کے اقتدار کے تحت) جنگ کی جاتی ہے اور جس کے ذریعہ سے حفاظت و عافیت حاصل کی جاتی ہے۔ پس اگر وہ (حاکم) اللہ سے ڈرتے ہوئے حکمرانی کرے اور عدل سے کام لے تو اس کے سبب سے بڑے اجر کا مستحق ہوگا اور اگر ایسا نہ کرے تو اس کا گناہ اس کی گردن پر ہوگا۔"

تشریح: یعنی امیر یا سربراہ مملکت کا یہ حق ہے کہ اس کا حکم سنا جائے اور اس کی اطاعت کو اپنے لیے فرض قرار دے لیا جائے۔ امیر کے بغیر کسی اجتماعی طاقت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور اجتماعی قوت کے بغیر کوئی بھی ملت یا قوم ہو اس کے وجود کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔ کوئی بھی لڑائی امام یا امیر کے بغیر نہیں لڑی جاسکتی۔ طاقت ور امیر جس کو عوام کی حمایت اور تائید حاصل ہوتی ہے درحقیقت ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کی علامت ہوتا ہے۔ سربراہِ مملکت کی اطاعت کس درجہ اہمیت رکھتی ہے اس کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ سربراہ کی اطاعت کو حضور ﷺ اپنی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دے رہے ہیں۔ اور یہ واضح الفاظ میں ظاہر فرما دیا کہ رسول کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ اسے کوئی ہلکا نہ جانے۔

امیر کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی مملکت میں ہمیشہ عدل وانصاف کو اپنے پیش نظر رکھے۔ ظلم اور بے انصافی کا روادار وہ کسی حال میں نہ ہو۔ اللہ کے ڈر اور اس کی گرفت کے خوف سے اس کا دل کبھی بھی خالی نہ ہو۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَةَ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "سمع وطاعت (یعنی امیر کے حکم کو سننا اور اس کی اطاعت کرنا) ہر حالت میں مرد مسلم پر فرض ہے۔ خواہ (حکم) پسند ہو یا ناپسند۔ جب تک کہ کسی معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب کسی معصیت (گناہ) کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ طاعت۔"

تشریح: یعنی امیر کے حکم کے سننے اور اس کو عمل میں لانے میں ہرگز قصور نہیں ہونا چاہیے۔

حاکم کا حکم پسند ہو یا ناپسند ہر حال میں اس کی اطاعت کرنی ہے۔ ایک مسلم شخص کا فرض یہی ہوتا ہے۔ البتہ امیر اگر معصیت کا حکم دینے لگے تو معصیت میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے: لَاطَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ ''یعنی معصیت میں اطاعت جائز نہیں۔ اطاعت تو صرف معروف (نیکی کے کاموں) میں روا ہے۔''

معصیت کے کاموں میں امیر کی اطاعت نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا جائے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے۔ جنگ تو آخری چارۂ کار ہے۔ اور اس کی کچھ اہم شرائط ہیں۔ ان شرطوں کو پورا کیے بغیر جنگ کرنی ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ یَاوِیْ اِلَیْهِ کُلُّ مَظْلُوْمٍ مِنْ عِبَادِهٖ فَاِذَا عَدَلَ کَانَ لَهُ الْاَجْرُ وَعَلَی الرَّعِیَّةِ الشُّکْرُ وَ اِذَا جَارَ کَانَ عَلَیْهِ الْاِصْرُ وَ عَلَی الرَّعِیَّةِ الصَّبْرُ. (بیہقی)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اقتدار درحقیقت زمین میں خدا کے سایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بندوں میں سے ہر مظلوم اس کی طرف پناہ حاصل کرتا ہے۔ جب صاحب اقتدار عدل و انصاف کرتا ہے تو وہ اجر کا مستحق ہوتا ہے اور رعیت پر شکر واجب ہوتا ہے، اور اس کے خلاف جب وہ ظلم و جور کرتا ہے تو وہ گناہ کا بوجھ اپنے اوپر لیتا ہے، رعیت پر اس وقت صبر لازم آتا ہے۔''

تشریح: جس طرح سایہ آدمی کو سورج کی گرمی اور تپش سے بچاتا ہے ٹھیک اسی طرح اسلامی اقتدار کی حیثیت اس سایہ کی ہے جو خدا تمہارے آرام اور سکون کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اس اقتدار کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی محافظت ہو۔ مظلوم کی فریاد سنی جائے اور اس کے ساتھ عدل و انصاف ہو اور ظالم کے ظلم و جور سے اس کو نجات دلائی جائے۔ جو اقتدار مظلوم کے پناہ گاہ نہ بن سکے اور جس کے سایہ میں خدا کے بندوں کو آرام اور چین حاصل نہ ہو اس کی خدا کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔ وہ تو لوگوں پر ایک مسلط عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے بندگانِ خدا کو جتنی جلد نجات ملے بہتر ہے۔

صاحبِ اقتدار شخص کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے دائرہ اقتدار میں عدل وقسط

قائم کرے اور رعایا پر کسی قسم کا ظلم روا نہ رکھے۔ اگر وہ اپنی یہ ذمہ داری پوری کرتا ہے تو وہ لازماً خدا کے یہاں اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اس صورت میں رعیت کا بھی فرض ہوتا ہے کہ اس کی قدر کرے۔ یہ احسان شناسی اس کے ایک زندہ قوم ہونے کی دلیل ہوگی۔

صاحبِ اقتدار اگر فرض ناشناس ہے۔ اور خدا کے بندوں پر ظلم و جور کو روا رکھتا ہے تو حقیقت میں خود اپنا برا کرتا ہے۔ وہ اپنے سر پر گناہ کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ خدا کی پکڑ سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں عوام کا فرض ہے کہ وہ نظم وضبط (Discipline) کو برقرار رکھیں اور صبر سے کام لیں۔ خدا یقیناً ظلم کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ ان کے لیے نجات کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گا۔

﴿۴﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ اِنْ عَلَی الْاَرْضِ مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَ اَنَا اَوْلَی النَّاسِ بِهٖ فَاَیُّکُمْ مَا تَرَکَ دِیْنَاراً اَوْ ضِیَاعاً فَاَنَا مَوْلَاهُ وَ اَیُّکُمْ تَرَکَ مَالاً فَاِلَی الْعُصْبَةِ مَنْ کَانَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، زمین پر جو کوئی بھی مومن شخص ہے سارے لوگوں میں اس سے سب سے قریب میں ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی قرض یا بال بچے چھوڑ جائے میں اس کا ولی ہوں (یعنی قرض ادا کرنا اور اس کے بچوں کی پرورش میرے ذمہ ہے) اور اس میں سے جو کوئی مال و دولت چھوڑ جائے تو وہ اس کے وارث کو ملے گا، جو بھی وارث ہو۔''

تشریح: ایک روایت میں آپؐ نے اپنے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے: اَنَا اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَّفْسِهٖ (ابوداؤد) ''مجھے ہر مومن شخص سے اس سے زیادہ تعلق ہے جتنا اسے اپنی ذات سے تعلق ونسبت حاصل ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ کسی کو بھی بے چارگی کی حالت میں نہ چھوڑے۔ اسلامی حکومت میں ہر ایک کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس کے مسائل صرف اس کے نہیں بلکہ وہ پوری ملت کے مسائل ہیں۔ اگر وہ قرض کی حالت میں مرتا ہے تو حکومت اس قرض کو ادا کرے گی۔ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے اور کمزور بچے چھوڑتا ہے جن کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تو حکومت ان کی سرپرستی کرے گی۔ اسلامی حکومت وہی ہے جس میں مرنے والے کو مرنے کے وقت یہ فکر دامن گیر نہ ہو کہ اس کے بعد اس کے بچوں کا کیا ہوگا۔

اگر مرنے والا اپنے پیچھے دولت اور جائداد چھوڑ کر جاتا ہے تو یہ دولت اور جائداد اس کے وارثوں کو ملے گی۔ حکومت کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ یہ ہے وہ عادلانہ نظامِ حکومت جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۵﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ فِيْ بَيْتِيْ هٰذَا: اَللّٰهُمَّ مَنْ وَّلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ وَمَنْ وَلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ فَارْفُقْ بِهٖ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے اس گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ’’اے اللہ جو کوئی شخص میری امت کا حاکم ہو اور وہ لوگوں پر سختی کرے، تو بھی اس پر سختی کر اور جو کوئی شخص میری امت کا حاکم ہو اور وہ لوگوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرے تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی کر۔‘‘

تشریح: معلوم ہوا کہ حکومت کو اپنی رعیت کے لیے سراپا رحمت ہونا چاہیے۔ سخت گیری اس کے لیے زیبا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عوام پر سختی کرنے والے حکمراں پر کس درجہ ناراض ہیں وہ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے۔

شہریت

﴿۱﴾ عَنْ تَمِیْمِ الدَّارِیِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَةُ ثَلاثًا قُلْنَا لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَ لِکِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ عَامَّتِهِمْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت تمیم داریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: ''دین نصح و خیر خواہی ہے۔'' ہم نے عرض کیا کہ کس کی؟ فرمایا: ''اللہ کی، کتاب کی، اس کے رسول کی، ائمہ مسلمین کی اور ان میں سب کی۔''

تشریح: یہ ایک نہایت جامع حدیث ہے۔ اس پر غور وفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ نصیحت کا لفظ عربی زبان میں کھوٹ، ملاوٹ اور خیانت کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ نصیحت العسل کہتے ہیں جب شہد کو موم سے بالکل صاف کر دیا جائے۔ نصیحت کا مفہوم ہے مخلصانہ خیر خواہی اور مخلصانہ وفاداری۔ اللہ کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے اور خدا کے مابین کوئی کھوٹ کا معاملہ روا نہ رکھے۔ وہ خدا کے صفات جلال و جمال کا اعتراف کرے۔ اس کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھے۔ اس کے امر ونواہی میں مستعدی دکھائے۔ کتاب اللہ کے ساتھ نصح و خیر خواہی یہ ہے کہ کتاب کے آداب کی پوری رعایت کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے۔ اس کے علوم کی اشاعت میں سرگرم ہوں۔ اس کے احکام پر عمل پیرا ہوں اور تمام عالم کو اس کی روشنی کی طرف دعوت دی جائے۔

رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس پر ایمان لائیں، اس کے اصحاب اور اس کے اہل بیت سے محبت رکھیں۔ ان کا ہمیشہ احترام کریں اور اس کے لائے ہوئے دین کی اقامت میں سرگرمی دکھائیں۔

ائمہ مسلمین کی نصح و خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ سمع و طاعت میں کوئی قصور سرزد نہ ہونے پائے۔ کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کریں جس سے حکومت کے استحکام کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ اُن میں علم کی اشاعت کی جائے۔ انھیں ایذا اور تکلیف سے بچائیں۔ ان کی عزت اور آبرو کو اپنی عزت اور آبرو سمجھیں، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کریں۔ ان کی خیر خواہی اور نصح کا اگر خیال رکھا جائے تو معاشرہ میں غیبت، چغلی، حسد اور کبر وغیرہ بیماریاں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتیں۔

نصح اور خیر خواہی انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اہم جز رہا ہے۔ حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ سبھی نے اس کا صاف اظہار کیا ہے کہ وہ قوم کے ناصح اور خیر خواہ ہیں، قوم پر عذاب نازل ہونے کے موقع پر حضرت صالحؑ قوم سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں: یَا قَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِن لاَّ تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ (اعراف:۷۹) ”اے میری قوم کے لوگو میں تو تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی لیکن تمہیں تو اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں آتے۔“

عذر کی وجہ سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض اعمال ساقط یا موخر ہوجائیں۔ مثلاً کوئی حج نہ کرسکے یا جہاد میں شریک نہ ہو لیکن نصح کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ قرآن میں آیا ہے: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلاَ عَلَی الْمَرْضٰی وَلاَ عَلَی الَّذِیْنَ لاَیَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (توبہ:۹۱) ”نہ تو کمزوروں کے لیے کوئی ہرج کی بات ہے اور نہ بیماروں کے لیے اور نہ ان لوگوں کے لیے جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کرتے رہیں۔ محسنین پر الزام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تو بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔“

〈۲〉 وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَهِ وَ عَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَ اَنْ لاَّ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلاَّ اَنْ تَرَوْا کُفْراً بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ فِیْهِ بُرْهَانٌ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لاَ نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لاَئِمٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس پر بیعت کی کہ سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی، خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی، اور اس حالت میں بھی کہ ہمارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جارہی ہو۔ اور اس پر کہ جو ذمہ دار صاحب اقتدار میں ہوں گے ان سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے الا یہ کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اس وقت اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہمارے پاس دلیل ہوگی۔ اور اس پر (ہم نے آپؐ سے بیعت یعنی معاہدہ کیا) کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلامی مملکت کے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ خدا کی نوازش کی قدر کریں۔ طوائف الملوکی، ہڑبونگ اور فساد اور بگاڑ کے مقابلے میں نظام حکومت ایک بڑی نعمت اور خدا کی عنایت ہے۔ اس لیے نظامِ مملکت کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھیں۔ سمع وطاعت کو اپنی اولین ذمہ داری تصور کریں۔ اشتعال کے مواقع آسکتے ہیں ایسے موقعوں پر ہرگز مشتعل نہ ہوں۔ حتی الامکان نظم وضبط کو برقرار رکھیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں۔ اگر کسی طبقہ کے لوگوں کے ساتھ کچھ ناانصافی بھی ہورہی ہو اور ان کے حقوق کو نظر انداز کیا جارہا ہو تو بھی بڑے اور عظیم مقصد کے پیش نظر اسے وہ خاطر میں نہ لائیں۔ اور کبھی بھی باغیانہ روش اختیار نہ کریں۔ الا یہ کہ باطل اور کفر سے ہی انھیں سابقہ پیش آجائے اور صلح ومصالحت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ لیکن اس کے لیے بھی کچھ ضوابط اور آداب ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے۔ یاد رہے، جس اقدام کا انجام محض خوں ریزی اور فتنہ وفساد ہو اس اقدام کی تائید نہیں کی جاسکتی۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اُمِّ الْحُصَيْنِ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنْ اُمِّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت اُمِ حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر کسی نکٹے اور کن کٹے غلام کو بھی تمہارا امیر (حاکم) بنادیا جائے اور وہ خدا کی کتاب کے مطابق تم پر حکمرانی کرے تو تم اس کا حکم سنو اور اس کی اطاعت کرو۔“

تشریح: یعنی کوئی بدہیئت اور بدصورت غلام ہی کیوں نہ تمہارا امیر ہو تمہارا فرض ہے کہ اس کی

اطاعت سے گریز نہ کرو۔ تم اس کی قبیح صورت کو نہیں اس کے منصب کو دیکھو اور اپنا فرض ادا کرو۔ حاکم کا بھی فرض ہے کہ وہ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت کرے۔ یعنی مملکت میں عدل وقسط کو قائم کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ کے نظم کو مستحکم کرے تا کہ حاجت مندوں کی حاجت روائی ہو سکے۔

﴿۴﴾ وَعَنِ النَّوَاسِ بْنِ سِمْعَانَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ. (شرح السنہ)

ترجمہ: حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”مخلوق کے کسی ایسے حکم کی اطاعت جائز نہیں جس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔“

تشریح: یہ ایک اہم حدیث ہے۔ اس میں اسلام کا ایک بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی کی اطاعت اور فرماں برداری اسی حد تک روا ہے جب تک اس سے خدا کی نافرمانی نہ ہوتی ہو۔ حاکم کے لیے ایسا حکم صادر کرنا درست نہیں جس پر عمل کرنا عین خدا کی نافرمانی ہو۔ انسان خالق نہیں، خدا کی مخلوق ومملوک اور مربوب ہے۔ کسی مخلوق کے مطالبہ اور حکم کو خالق کے مطالبہ اور حکم کے مقابلے میں فوقیت دینا خلاف عدل وانصاف ہی نہیں، خلافِ عقل ودانش بھی ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اُعِیْذُکَ بِاللّٰہِ مِنْ اِمَارَةِ السُّفَهَاءِ قَالَ وَمَا ذَاکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اُمَرَاءُ سَیَکُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ مَنْ دَخَلَ عَلَیْهِمْ فَصَدَّقَهُمْ بِکِذْبِهِمْ وَ اَعَانَهُمْ عَلٰی ظُلْمِهِمْ فَلَیْسُوْا مِنِّیْ وَ لَسْتُ مِنْهُمْ وَلَنْ یَّرِدُوْا عَلَیَّ الْحَوْضَ وَمَنْ لَّمْ یَدْخُلْ عَلَیْهِمْ وَلَمْ یُصَدِّقْهُمْ بِکِذْبِهِمْ وَلَمْ یُعِنْهُمْ عَلٰی ظُلْمِهِمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُمْ وَ اُولٰٓئِکَ یَرِدُوْنَ عَلَی الْحَوْضِ. (ترمذی، نسائی)

ترجمہ: حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہارے لیے سفیہ لوگوں کی امارت سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔“ عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ کیا ہے؟ (یعنی یہ امارت کب اور کیوں کر قائم ہوگی) آپؐ نے فرمایا: ”یہ امیر میرے بعد ہوں گے۔ جو شخص ان کے پاس جائے اور ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظالمانہ کارروائیوں میں ان کی معاونت کرے۔ تو ایسے لوگوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہ حوض

کوثر پر میرے پاس آئیں گے۔ اور جو شخص نہ تو ان (ایسے امراء) کے پاس جائے اور نہ ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور نہ ان کے ظالمانہ کاموں میں ان کی معاونت کرے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں۔ اور وہ حوض پر میرے پاس آئیں گے۔''

تشریح: اس حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے حضور ﷺ کے بعد امت میں ایسے امراء بھی ہوں گے جو عقل اور ذوق صحیح سے عاری ہوں گے۔ وہ پست ذہن کے ہوں گے۔ شرافت کے بجائے کمینگی کا عنصر ان کے یہاں غالب ہوگا۔ وہ لوگوں کے لیے درحقیقت بڑی آزمائش ہوں گے۔ بعض دنیا پرست قسم کے لوگ کچھ ذاتی مفاد کے لیے ان کے یہاں پہنچیں گے اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ ان کی غلط روی کو حق بجانب قرار دیں گے۔ ان کے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں اپنی ساری ذہانت صرف کر دیں گے۔ وہ ان کے ظالمانہ رویہ میں ان کے معاون بنیں گے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان سے میرا کوئی تعلق نہیں وہ میری تعلیم اور ہدایت سے بہت دور جا پڑے ہوں گے۔

اس کے برخلاف جو لوگ اس وقت یہ روش اختیار نہیں کریں گے۔ نہ تو وہ ایسے امراء کے پاس اپنی دنیا بنانے اور ان کا قرب حاصل کرنے کی غرض سے جائیں گے۔ اور نہ ان کے جھوٹ کو سچ کہیں گے۔ اور نہ ان کے ظلم میں ان کا ساتھ دیں گے۔ انھیں لوگوں کے بارے میں نبی ﷺ کہتے ہیں کہ وہ مجھ سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ میری لائی ہوئی تعلیم کی حرمت کا پاس ولحاظ رکھنے والے درحقیقت یہی لوگ ہوں گے۔ قیامت کے روز یہی لوگ مجھ سے ملیں گے اور میرے حوض کوثر سے سیراب ہو سکیں گے۔

(۲) وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلِ الْحَضْرَمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ ؓ قَالَ سَأَلَ سَلَمَةُ بْنُ يَزِيْدَ الْجُعْفِيُّ ؓ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَرَأَيْتَ اِنْ قَامَتْ عَلَيْنَا اُمَرَاءُ لَيَسْأَلُوْنَا حَقَّهُمْ وَ يَمْنَعُوْنَا حَقَّنَا فَمَا تَامُرُنَا، فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ سَاَلَهُ فَاَعْرَضَ عَنْهُ ثُمَّ سَأَلَهُ فِي الثَّانِيَةِ اَوْ فِي الثَّالِثَةِ فَجَذَبَهُ الْاَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ وَ قَالَ: اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوْا وَ عَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت علقمہ بن وائل حضرمی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ سلمہ بن یزید جعفی ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے نبی، اگر ہم پر ایسے امراء

مقرر ہوں جو اپنا حق ہم سے طلب کریں اور ہمارا حق ہمیں نہ دیں تو آپؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپؐ نے جواب نہ دیا۔ پھر دریافت کیا، پھر جواب نہ دیا۔ پھر دوسری یا تیسری بار دریافت کیا تو اشعث بن قیس نے سلمہ کو کھینچ لیا اور کہا کہ سنو اور اطاعت کرو۔ ان پر ان کے اعمال کا بار ہے اور تم پر تمہارے اعمال کا بوجھ ہے۔

تشریح: جہاں رعیت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ امراء کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھے، وہیں امراء کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ رعیت کے حقوق کے ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ لیکن ایسے امراء ہو سکتے ہیں جو اپنا حق تو طلب کریں لیکن رعیت کے سلسلے میں ان کی جو ذمہ داری ہوتی ہے اسے وہ یکسر فراموش کر جائیں۔ ظاہر ہے یہ ایک نہایت ہی افسوسناک صورتِ حال ہوگی۔ حضرت سلمہ بن یزید جعفیؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے ہیں کہ جب ایسی صورت پیش آ جائے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ یعنی کیا اس وقت اس کا جواز پیدا نہیں ہو جاتا ایسے امراء کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے اور ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال کے جواب میں خاموش رہے۔ بالآخر سائل صحابیؓ کو ایک دوسرے صحابی اشعث بن قیسؓ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مطلب یہ تھا کہ حضورؐ کی صحبت میں رہ کر دین کے مزاج اور اس کی فطرت کو سمجھنے سے اگر قاصر رہے تو سن لو۔ ایسی افسوس ناک صورتِ حال سے اگر دو چار ہونا پڑے پھر بھی تم پر سمع وطاعت لازم ہے۔ تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو، تمہیں اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ امراء اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں ان کی طرف سے خدا کے یہاں تمہیں کوئی جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام انتہائی امن پسند دین ہے۔ صلاح وخیر، ایثار و قربانی اور دور اندیشی کو اسلام جو اس قدر اہمیت دیتا ہے اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

﴿۷﴾ وَعَنْ اَبِیْ مَرْیَمَ الْاَزْدِیِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی مُعَاوِیَةَ فَقَالَ مَا اَنْعَمْنَا بِکَ اَبَا فُلَانٍ وَهِیَ کَلِمَةٌ تَقُوْلُهَا الْعَرَبُ فَقُلْتُ حَدِیْثًا سَمِعْتُهٗ اُخْبِرُکَ بِهٖ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ شَیْئًا مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَ فَقْرِهِمْ اِحْتَجَبَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ دُوْنَ حَاجَتِهٖ وَ خَلَّتِهٖ وَفَقْرِهٖ. قَالَ فَجَعَلَ رَجُلًا عَلٰی حَوَائِجِ النَّاسِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابومریم ازدی بیان کرتے ہیں کہ میں معاویہؓ کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا کہ تم خوب آئے ہمارے پاس اے فلاں کے باپ! (یہ اہل عرب کا محاورہ ہے)۔ میں نے کہا کہ میں نے ایک حدیث سنی ہے جس کی اطلاع آپ کو دے رہا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''جس کسی کو اللہ عزوجل مسلمانوں کے کسی کام پر مامور کرے۔ پھر وہ لوگوں کی حاجت روائی نہ کرے جب کہ وہ محتاج ہوں اور فقر کی حالت میں ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا نہ کرے گا اور نہ اس کے فقر کو دور فرمائے گا۔'' یہ سن کر حضرت معاویہؓ نے ایک شخص کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی حاجتوں پر نظر رکھے۔

تشریح: معلوم ہوا کہ حکام کا فرض ہے کہ وہ حاجت مندوں کی حاجت روائی کی طرف سے ہرگز غافل نہ ہوں۔ کسی بھی مملکت کی رعایا کا یہ حق ہے کہ حکومت اس کی ضروریات اور اس کی پریشانیوں کو دور کرنے کی فکر کرے۔ بہ صورتِ دیگر خدا کی ناراضی سے حکام بچ نہیں سکتے۔ خدا کو بھی اس کی کوئی پروانہ ہوگی کہ وہ کس حال میں ہیں اور وہ کس سختی سے دوچار ہیں۔ وہ انھیں ان کی مشکلات سے ہرگز نجات نہ دے گا۔

اہلِ ذِمہ یا غیر مسلموں کے حقوق

(۱) عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ قَتَلَ مُعَاھِداً فِیْ غَیْرِ کُنْھِہٖ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی نے بلاوجہ کسی معاہد کو قتل کر دیا خدا اس پر جنت حرام کر دے گا۔''

تشریح: اسلامی حکومت کا جس سے عہد و پیمان ہو، اسے معاہد کہتے ہیں۔ جو شخص اسلامی مملکت کے حدود (دارالاسلام) میں رہتا ہے۔ حکومت کے ضوابط کی پابندی کرتا ہے، جسے اصطلاحاً ذمی کہتے ہیں۔ اس کی حیثیت بھی معاہد کی ہے۔ اور معاہد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو گرچہ دارالاسلام میں نہیں رہتے لیکن انھوں نے اسلامی حکومت سے صلح کر رکھی ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے خلاف کسی کی معاونت نہیں کریں گے۔ اور نہ اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کریں گے۔

معاہد کے ساتھ جو عہد و پیمان ہوا ہو اس کا لحاظ ضروری ہے۔ اب اگر کوئی معاہد کو بلاوجہ

قتل کر دیتا ہے تو وہ خدا کے کرم کا نہیں غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَ اِنَّ رِيْحَهَا تُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ خَرِيْفاً ''جو شخص کسی معاہد کو قتل کرے گا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا جب کہ جنت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے۔ بعض روایتوں میں سو، بعض میں پانچ سو برس کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ درحقیقت ان اعداد سے تحدید مقصود نہیں ہے بلکہ مراد طول مسافت ہے۔ یہ فرق واختلاف اشخاص کے اعمال و درجات کے باہمی فرق کی وجہ سے بھی پایا جا سکتا ہے۔ جن کے درجے نہایت بلند ہوتے ہیں انھیں دور دراز کے فاصلوں سے بھی جنت کی خوشبو آنے لگتی ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عِدَّةٍ مِنْ اَبْنَاءِ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنْ اٰبَائِهِمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اَلاَ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِداً اَوْ اِنْتَقَصَهُ اَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهٖ وَاَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ فَاَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: صفوان بن سلیم رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کے چند بیٹوں سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپوں سے سنا کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اس (غیر مسلم) پر ظلم کیا جس سے معاہدہ ہو چکا ہے یا اس کے حقوق کو نقصان پہنچایا، یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالا یا بغیر اس کی دلی خوشی کے کوئی چیز اس سے لے لی، تو قیامت کے روز ایسے شخص کے خلاف احتجاج کروں گا۔''

تشریح: یہ حدیث نہایت واضح ہے۔ معلوم ہوا کہ معاہد ہو یا ذمی اس کے حقوق کی پاسداری لازم ہے۔ نہ تو اس کے حقوق میں کوئی کمی کی جا سکتی ہے اور نہ اس پر اس کی طاقت سے بڑھ کر اس پر کوئی بار ڈالا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مرضی اور خوشی کے بغیر اس کی کوئی چیز بھی نہیں لی جا سکتی۔

﴿۳﴾ وَعَنْ هِلَالٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ ثَقِيْفٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ جُهَيْنَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَعَلَّكُمْ تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا فَتَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ فَيَتَّقُوْنَكُمْ بِاَمْوَالِهِمْ دُوْنَ اَنْفُسِهِمْ وَ اَبْنَائِهِمْ. قَالَ سَعِيْدٌ فِيْ حَدِيْثِهٖ فَيُصَالِحُوْنَكُمْ عَلٰى صُلْحٍ ثُمَّ اتَّفَقَا فَلاَ تُصِيْبُوْا مِنْهُمْ شَيْئًا فَوْقَ ذٰلِكَ فَاِنَّهٗ لاَ يَصْلُحُ لَكُمْ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ہلال، ثقیف (قبیلہ) کے ایک شخص اور وہ جہینہ کے ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شاید تم ایک قوم سے لڑو گے۔ پھر تمھیں اس پر غلبہ حاصل ہوگا۔ پھر اس قوم کے لوگ اپنے مال کے ذریعہ سے خود کو اور اپنی اولاد کو تم سے بچالیں گے۔ (سعید کی روایت میں ہے) پھر وہ ایک متعین مال پر تم سے باقاعدہ صلح کرلیں گے تو طے شدہ مال سے زیادہ ہرگز ان سے نہ لینا کیوں کہ یہ تمہارے لیے جائز نہ ہوگا۔''

تشریح: اس حدیث میں ذمیوں کے حقوق کی پاسداری کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ وہ جزیہ اسی لیے تو دیتے ہیں کہ ان کی جان اور ان کے مال کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کے ساتھ کسی قسم کا ظلم روا نہ ہوگا۔ ان سے طے شدہ مال سے زائد وصول کرنے کی کوشش ہرگز درست نہیں ہے۔

درحقیقت غیر مسلم رعایا کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعہ سے اسلامی حکومت کے تحت آ گئے ہوں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو جنگ میں شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں۔ تیسری قسم ان غیر مسلمین کی ہے جو جنگ و صلح کے علاوہ کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں۔

جو غیر مسلم جنگ کے بغیر یا دورانِ جنگ اطاعت قبول کرلیں اور اسلامی حکومت سے کچھ شرائط طے کرلیں ایسی صورت میں اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان شرائط کا پورا لحاظ رکھے اور ان سے یک سرِ مو بھی تجاوز نہ کرے۔

جو لوگ آخر تک جنگ سے دست بردار نہ ہوئے ہوں اور مسلمانوں سے جنگ کرتے رہے ہوں یہاں تک کہ شکست فاش کے بعد ہی ہتھیار ڈالے ہوں۔ اس قسم کے مفتوح اور مغلوب لوگوں کی حیثیت ذمی کی ہوتی ہے۔ ذمیوں کو اسلام نے جو حقوق عطا کیے ہیں وہ نہایت فیاضانہ اور فراخ دلانہ ہے۔ ان سے ایک ٹیکس لیا جائے گا جسے جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ اس تحفظ کا معاوضہ ہوتا ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ معاوضہ بھی ذی استطاعت اور بالغ مردوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ یہ کوئی جرمانہ نہیں ہے۔ اگر حکومت کسی وقت ان کی حفاظت سے قاصر پائے گی تو جزیہ واپس کردیا جائے گا۔ اس کے برعکس زکوٰۃ ذی استطاعت مرد اور عورت دونوں ہی سے لی جاتی ہے اور اس کی شرح بھی جزیہ سے کہیں زیادہ ہے۔

ذِمی کی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرنی اسلامی حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ امیر یا

مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ ذمیوں کی املاک پر قبضہ کریں یا ان کو اپنا غلام بنائیں۔ وہ اپنی زمینوں کے مالک ہوں گے۔ اور ان کے بعد ان کی ملکیت ان کے وارثوں کی طرف منتقل ہوگی۔ انھیں اپنی املاک میں ہبہ، بیع اور رہن وغیرہ کے تمام ہی حقوق حاصل ہوں گے۔ اسلامی حکومت کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ انھیں ان کی اپنی املاک سے بے دخل کر سکے۔

جزیہ کی مقدار ذمی کی مالی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقرر کی جائے گی۔ غریبوں سے بہت کم لیا جائے گا۔ جن کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جن کا کام دوسروں کے تعاون اور بخشش سے چلتا ہو ان سے کوئی جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ جزیہ مقرر کرنے میں اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائے گا کہ جزیہ ادا کرنا ان کے لیے مشکل نہ ہو بلکہ بہ آسانی وہ اسے ادا کر سکیں۔

یہ جزیہ عورتوں، اندھوں، اپاہجوں، معذوروں اور ازکار رفتہ بوڑھوں پر نہیں لگایا جائے گا۔ اور نہ راہبوں پر معبدوں کے خدام بھی اس سے مستثنیٰ قرار پائیں گے۔ اسی طرح لونڈی اور غلام بھی جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ جزیہ اہل قتال ہی پر لگائیں گے۔ غیر اہل قتال پر جزیہ نہیں لگایا جائے گا۔

ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر سمجھی جائے گی۔ کوئی مسلمان اگر کسی ذمی کو قتل کر دیتا ہے تو اس کا قصاص لیا جائے گا۔ تعزیرات کا قانون بھی ذمی اور مسلمان دونوں کے لیے یکساں ہے۔ جرائم پر جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی سزا ذمی کو بھی دیں گے۔ دیوانی کے حقوق بھی برابر رہیں گے۔ جو تجارت کے طریقے ممنوع ہیں وہ ان کے لیے بھی ممنوع رہیں گے۔ البتہ شراب بنانے اور پینے کا حق انھیں حاصل ہوگا۔ وہ سور بھی پال سکتے ہیں۔ اموالِ تجارت پر مسلمان تاجروں کی طرح ان سے ٹیکس بھی لیا جائے گا۔ معاشی کاروبار اور تجارت، صنعت وحرفت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی اسی طرح کھلے ہوں گے جس طرح مسلمانوں کے لیے کھلے ہوں گے۔ معاشی میدان میں جدوجہد کا حق مساویانہ طور پر انھیں بھی حاصل ہوگا۔

ذمیوں کو اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ ان کی اپنی بستیوں میں اپنے مذہبی مراسم اعلان و اظہار کے ادا کرنے کی انھیں آزادی ہوگی۔ انھیں اپنی بستیوں میں معبد کی تعمیر کا پورا حق ہوگا۔ امصار مسلمین میں بھی جو ان کے قدیم معبد ہوں گے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

جزیہ اور خراج کی تحصیل کے سلسلے میں ذمیوں پر سختی اور تشدد کرنا جائز نہ ہوگا۔ ان کے

ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ جو ذمی محتاج ہو جائیں گے ان سے جزیہ لینا موقوف کر دیا جائے گا بلکہ اسلامی حکومت اپنے خزانے سے ان کے لیے وظیفے مقرر کرے گی۔

ذمیوں سے فوجی خدمت نہیں لی جائے گی۔ ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی۔

عقد ذمہ عارضی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے قائم ہوگا۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَلِيٍّؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ وَ يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ وَ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ اَلاَ لاَ يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ وَلاَ ذُوْ عَهْدٍ فِيْ عَهْدِهٖ. (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”قصاص اور دیت میں سب مسلمان برابر ہیں۔ اور مسلمانوں میں سے کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی سے کسی کو امان دے اور کوئی معاہدہ کرے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر کسی دور کے رہنے والے مسلمان نے کوئی معاہدہ کیا ہے تو اسے توڑا نہ جائے۔ اور تمام مسلمان غیروں کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خبردار، کسی کافر کے بدلے میں کسی مسلم کو قتل نہ کیا جائے اور نہ اُس (ذمی) کو مارا جائے جب تک وہ عہد و ضمان میں ہے۔“

تشریح: یعنی اس سلسلے میں اعلیٰ و ادنیٰ یا امیر و غریب یا عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اگر کسی باحیثیت آدمی نے کسی کم حیثیت کے آدمی کو قتل کیا ہے تو اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں ہے کہ باحیثیت شخص کے خوں بہا کی مقدار کے مقابلے میں کم تر حیثیت کے آدمی کے قصاص کی مقدار کم کر دی جائے۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی باحیثیت آدمی کم حیثیت والے شخص کو قتل کر دیتا تو اسے قصاص میں قتل نہیں کرتے تھے۔ اسلام نے اس فرق کو ختم کر دیا۔

ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی اگر کسی کو امان دیتا ہے تو اس کا احترام کیا جائے گا اور سارے ہی مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کا پاس و لحاظ رکھیں۔ یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ امان دینے والا کوئی بڑی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ اسی طرح دور کے رہنے والے مسلمان نے اگر کسی شخص کو امان دے رکھی ہو تو اس کا بھی پاس و لحاظ رکھا جائے گا۔

مسلمانوں میں باہم ایسا اتفاق و اتحاد ہونا چاہیے گویا ان کی حیثیت ایک ہاتھ کی ہے جس میں کسی تفرقہ یا عدم تعاون کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کسی بھائی نے اگر کسی کافر کو امان دے رکھی ہے تو وہ امان سب کی طرف سے متصوّر ہوگی۔

''کسی کافر کے بدلے میں کسی مسلم کو قتل نہ کیا جائے'' یہاں کافر سے مراد حربی کافر ہے۔ رہا ذمی کافر تو اسلامی قانون کی نگاہ میں اس کے خون کی قیمت وہی ہے جو ایک مسلمان کے خون کی قیمت ہوتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو ناحق قتل کر دیتا ہے تو قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا گرچہ وہ مسلمان ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔ قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالہ کر دیا جائے۔ قاتل کو سپرد کر دیا گیا اور وہ قصاص میں قتل کر دیا گیا۔

ذمی جب جزیہ ادا کرتا ہے اور اسلامی مملکت کا وفادار شہری بن کر رہ رہا ہے اور حکومت اسلامی نے اس کے جان و مال کی حفاظت کا عہد وضمان کر رکھا ہے تو اس کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ كُنَّا نَغْزُوْا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَنُصِيْبُ مِنْ آنِيَةِ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَسْقِيَتِهِمْ فَنَسْتَمْتِعُ بِهَا فَلَا يَعِيْبُ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کا سفر کرتے تھے اور ہمیں مشرکوں کے برتن ملتے تو ان سے پیتے اور ان کو اپنے کام میں لاتے تو آپؐ (نبی ﷺ) اسے عیب قرار نہ دیتے۔

تشریح: اہلِ کفر بھی انسان ہیں۔ اس لیے ان کے برتنوں اور دوسری چیزوں کے استعمال میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے۔ کفار کے چھونے سے کپڑے اور برتن وغیرہ ناپاک نہیں ہو جاتے کہ ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اسلام بے جا نفرت اور جاہلی تعصب کی حمایت نہیں کرتا۔

نظامِ عدالت

منصبِ قضا

〈۱〉 **عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنْ جُعِلَ قَاضِیًا بَیْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَیْرِ سِکِّیْنٍ.** (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کسی کو لوگوں کا قاضی بنایا گیا اُسے بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔''

تشریح: قضا کا منصب بڑی ہی ذمہ داری کا منصب ہے۔ جس شخص کے سپرد یہ منصب ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ بڑی آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے۔ چھری سے ذبح ہونے میں لمحہ بھر کی اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن منصب قضا کی ذمہ داری ایسی ہے کہ اس میں آدمی کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں اس سے کسی مقدمے کے فیصلہ میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کا انجام کتنا حسرت ناک ہوگا۔ چھری بہ ظاہر دکھائی نہیں دیتی لیکن اس شخص کو ذبح کیا ہوا ہی سمجھنا چاہیے جس کے سپرد قضا کا منصب دیا گیا ہو۔

〈۲〉 **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو وَ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَهَدَ وَ اَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ وَ اِذَا حَکَمَ فَاجْتَهَدَ وَ اَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ وَّاحِدٌ.** (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کسی حاکم نے فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں اجتہاد کیا (یعنی خوب غور

وفکر سے کام لیا) اور اس کا فیصلہ صحیح ہوا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر اس نے فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں اجتہاد کیا لیکن صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں چوک گیا تو اسے ایک اجر ملے گا۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عدالت کے سامنے اگر کوئی معاملہ یا قضیہ ایسا آ جاتا ہے جس کے سلسلے میں کتاب وسنت اور فقہ اسلامی میں کوئی واضح ہدایت نہیں ہے تو اس موقع پر اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس طرح کے مواقع پر تعلیمات اسلامی کی اسپرٹ اور اسلاف کے فیصلوں کے نظایر کی روشنی میں حاکم کو پوری طرح غور وفکر سے کام لینا چاہیے۔ اب اگر وہ غور وفکر کے بعد نہایت دیانت داری کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور اس کا دل مطمئن ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ مبنی برحق ہے تو وہ اپنے فیصلہ کو نافذ کر سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ اگر صحیح اور شریعت کے منشا کے عین مطابق ہوا تو اسے دوہرا اجر وثواب ملے گا۔ لیکن فیصلہ کرنے میں باوجود مجتہدانہ کوشش کے اس سے خطا ہوگئی اور وہ شریعت اسلامی کے منشاء تک پہنچنے سے قاصر رہا جب بھی وہ ایک اجر کا مستحق ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی حد تک غور وفکر کرنے میں اس نے کوئی کمی نہیں کی۔ اب اگر فیصلہ کرنے میں اس سے غلطی ہوتی ہے تو وہ معذور سمجھا جائے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے امور و معاملات جو اسلامی قانون کے اصل ماخذ میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہیں۔ ان میں قاضی یا جج کو اجتہاد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجتہد سے خطا بھی ممکن ہے۔ جہاں وہ صحیح حکم تک پہنچ سکتا ہے وہیں اس کا بھی امکان ہے کہ اس سے خطا ہو جائے اور وہ صحیح حکم تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ خدا کا فرماں بردار مانا جائے گا اور اجر وثواب کا مستحق قرار پائے گا۔ اس لیے کہ انسان اسی کا مکلّف ہے کہ وہ حق تک پہنچنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر وہ حق کو پا لیتا ہے اور صحیح حکم تک پہنچ جاتا ہے تو اسے وہ خدا کا فضل وکرم سمجھے اور اگر وہ صحیح حکم تک پہنچنے سے قاصر رہا تو وہ یقیناً معذور سمجھا جائے گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں تنگی اور سختی نہیں پائی جاتی۔ اسی لیے فقہی اختلاف کو شریعت کے کشادہ دامن ہونے پر محمول کیا گیا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس لیے اس میں ان خطاؤں پر بھی اجر ملتا ہے جن کے پیچھے تساہل، سرکشی یا جہل کارفرما نہ ہو۔

جب کسی چیز کا حکم دین کے اصل ماخذات میں واضح طور پر نہ ہوگا تو لازماً قیاس پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ عمل تحری قبلہ کی طرح ہے۔ جس طرح قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو اور نماز کا وقت ہو جائے

تو نماز ترک نہیں کریں گے بلکہ غور وفکر اور تحری کر کے اپنے گمان غالب کے مطابق قبلہ کی سمت مقرر کرلیں گے اور اس طرف منہ کر کے نماز ادا کرلیں گے۔ یہ نماز درست مانی جائے گی اگرچہ درحقیقت قبلہ اس طرف نہ ہو جدھر رخ کر کے نماز پڑھی گئی ہے۔ اسی طرح قیاس پر عمل کرنے والا دین ہی پر عمل کرنے والا سمجھا جائے گا اگرچہ قیاس میں اس سے خطا ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَنِ ابْتَغَى الْقَضَاءَ وَسَأَلَ وُكِّلَ اِلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اُكْرِهَ عَلَيْهِ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكًا يُسَدِّدُهٗ. (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص منصبِ قضا کا طالب ہوگا اور اسے درخواست کر کے حاصل کرے گا تو اس کو اس کے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا اور جس کسی کو اس کے لیے مجبور کیا گیا ہوگا تو خدا اس کے لیے ایک فرشتہ نازل کرے گا جو (اس کی رہ نمائی کرے گا اور) اسے ٹھیک ٹھیک چلائے گا۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ منصب قضاء کوئی طلب کرنے کی چیز نہیں ہے۔ جس کسی شخص کو اس منصب کی ذمہ داری کا پورا احساس ہوگا وہ ہرگز اس کی خواہش اور آرزو نہیں کرسکتا۔ ایسا شخص اگر اس منصب کے حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے۔ پھر بھی خدا کی خصوصی مدد سے وہ محروم ہی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں بالعموم آدمی کا اپنا نفس ہی اس کا رہبر ہوتا ہے، جو نفس کی رہ نمائی میں جی رہا ہو اس کی پوزیشن کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ ہر شخص بہ آسانی اسے محسوس کرسکتا ہے۔

اس کے برعکس وہ شخص ہے جس نے اس منصب کے لیے کوئی تمنا نہیں کی اور نہ وہ اس کے لیے کوشاں رہا۔ بلکہ اسے اس منصب کے لیے مجبور کیا گیا تو اس صورت میں خدا کی خاص مدد اس کے شاملِ حال ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک فرشتہ اس کی رہ نمائی کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے جو غیر محسوس طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے۔ پھر اس کا کوئی کام نفسانی خواہشات کے زیر اثر انجام نہیں پاتا۔ اس کے کیے ہوئے فیصلے صحیح اور صائب ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے غلط قسم کے محرکات کی کارفرمائی ہرگز نہیں ہوتی۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَلِيٍّؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اِذَا تَقَاضٰى اِلَيْكَ رَجُلَانِ فَلَا تَقْضِ لِلْاَوَّلِ حَتّٰى تَسْمَعَ كَلَامَ الْاٰخِرِ فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يَّتَبَيَّنَ لَكَ الْقَضَاءُ. (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب تمہارے پاس دو آدمی اپنا قضیہ لے کر آئیں تو تم پہلے کے حق میں کوئی فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے کی بات نہ سن لو۔ کیوں کہ اس سے (صحیح) فیصلہ کرنے میں تمھیں اچھی مدد ملے گی۔“

تشریح: یہ ہدایت نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس موقع پر دی ہے جب آپؐ نے انھیں قاضی بنا کر یمن بھیجنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ کسی مقدمے میں مدعا علیہ کو اس کا پورا موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی صفائی میں جو کچھ کہنا چاہتا ہو وہ کہہ سکے۔ مدعا علیہ کے بیان سے پہلے محض مدعی کے دعویٰ پر کوئی فیصلہ کرنا انصاف کے بالکل منافی ہے۔ دونوں فریق کی باتیں سامنے آ جانے سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی بھی ہوتی ہے۔

﴿۵﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِؓ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَیِ الْحَاكِمِ. (احمد، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مقدمہ کے دونوں ہی فریق حاکم کے سامنے بیٹھیں۔

تشریح: یعنی کسی فریق کے ساتھ خصوصی معاملہ نہ کرے۔ دونوں فریق کے ساتھ اس کا برتاؤ یکساں ہو۔ دونوں فریق کی نشستوں میں کوئی فرق و امتیاز نہ ہو۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی جائے۔ کوئی جج اگر کسی فریق کی خاص تکریم کرتا اور اس کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو اس جج سے اس کی امید کیسے کی جا سکے گی کہ اس کا فیصلہ بے لاگ اور جانب داری سے بالکل پاک ہوگا۔ اور وہ اپنے فیصلہ پر کسی تعلق اور رشتہ وغیرہ کو ہرگز اثر انداز ہونے نہ دے گا۔

﴿۶﴾ وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَايَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اِثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو بکرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”کوئی حاکم دو فریق کے درمیان ایسی حالت میں ہرگز فیصلہ نہ کرے جب کہ وہ غصے کی حالت میں ہو۔“

تشریح: غصہ کی حالت میں بالعموم آدمی اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ کسی مقدمہ میں سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کر کے مقدمے کا منصفانہ فیصلہ کر سکے۔ غیض و غضب کی طرح سخت بیماری یا

بھوک پیاس کی حالت میں بھی بلکہ موسم اگر نہایت سخت ہو تو اس صورت میں بھی فیصلہ صادر نہ کرے۔ کیوں کہ ان حالات میں اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ حواس پر قابو نہ ہو یا دماغ پورے طور پر حاضر نہ ہو اور فیصلہ کرنے میں کسی فریق کے ساتھ ظلم اور زیادتی ہو جائے۔

﴿۷﴾ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَ اِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ وَ لَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِيْ لَهٗ عَلٰى نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْهُ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِشَيْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِيْهِ فَلَا يَاْخُذَنَّهٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو، ممکن ہے تم میں کوئی شخص اپنے دلائل پیش کرنے میں دوسرے سے بڑھ کر زبان آور ہو اور میں اس کا بیان سن کر اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں۔ لہٰذا جس کسی کے حق میں کسی ایسی چیز کا فیصلہ کر دوں، جو حقیقت میں (اس کی نہیں بلکہ) اس کے بھائی کی ہو تو وہ اسے نہ لے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں درحقیقت مَیں اس کے حق میں (جہنم کی) آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں گا۔''

تشریح: مطلب یہ کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ کوئی عالم الغیب خدا نہیں ہوں۔ اس لیے اس کا امکان ہے کہ کسی فریق کے زورِ بیان اور طرزِ استدلال سے متاثر ہو کر میں کسی چیز کا فیصلہ اسی کے حق میں کر دوں اور وہ چیز اسے دلا دوں حالاں کہ حقیقت میں وہ چیز اس کی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں میرے دلانے سے وہ چیز اس کی نہیں ہو جائے گی۔ اگر وہ اس کو لیتا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس کے حق میں نارِ جہنم کا ایک ٹکڑا ہے کچھ اور نہیں ہے۔

﴿۸﴾ وَعَنِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالْيَمِيْنِ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدعیٰ علیہ کو قسم کا حکم دیا۔

تشریح: اگر کوئی شخص عدالت میں کسی کے خلاف دعویٰ دائر کرتا ہے تو قاضی محض اس کے دعویٰ پر فیصلہ نہیں کر دے گا۔ اسلامی قانون کے لحاظ سے اسے اپنے دعویٰ کے حق میں ثبوت اور شہادت

پیش کرنی ہوگی۔ اگر وہ ثبوت اور شہادت پیش نہ کرسکے تو مدعا علیہ سے کہا جائے گا وہ اگر اس دعویٰ کو غلط سمجھتا ہے تو حلف کے ساتھ یہ بیان دے کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ اگر وہ حلف کے ساتھ بیان دے دیتا ہے تو دعویٰ خارج کر دیا جائے گا اور فیصلہ مدعا علیہ کے حق میں ہوگا۔ اگر مدعا علیہ حلف سے انکار کرتا ہے تو پھر مدعی کے دعویٰ کو صحیح قرار دیا جائے گا اور فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔

﴿۹﴾ وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَوْ يُعْطَى النَّاسَ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰى نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَ اَمْوَالَهُمْ وَلٰكِنَّ الْيَمِيْنَ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر لوگوں کو محض ان کے دعویٰ پر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو لوگ دوسرے آدمیوں کے خلاف خون اور مال کے (جھوٹے) دعوے کرنے لگیں گے (لہٰذا مدعی کا دعویٰ بغیر شہادت کے معتبر نہیں) لیکن قسم لینا مدعا علیہ سے ضروری ہے۔''

تشریح: یعنی محض دعویٰ پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہونے لگے تو پھر کتنے لوگ جھوٹے دعوے کرنے لگ جائیں۔ اور یہ دعویٰ مال کا بھی ہوسکتا ہے اور خون کا بھی۔ اس لیے کوئی دعویٰ شہادت کے بغیر معتبر نہیں مانا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت بیہقی میں بھی صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ بیہقی کی روایت میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں، وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةَ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ یعنی ثبوت و شہادت پیش کرنا مدعی کے ذمے ہے۔ اور قسم وہ کھائے گا جو انکار کرے یعنی مدعا علیہ۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ بُرَيْدَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَ اِثْنَانِ فِي النَّارِ. فَاَمَّا الَّذِيْ فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ وَ رَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَ رَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ. (ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جنت میں اور دو طرح کے دوزخ میں جاتے ہیں۔ جنت میں جانے والا وہ شخص

ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا، اور جس نے حق کو جانا مگر اپنے فیصلہ میں ظلم کا روادار ہوا وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور جو شخص جہل کی وجہ سے حق کو پہچاننے سے قاصر رہا اور اس نے اسی حالت میں لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کیا وہ بھی دوزخ میں جائے گا۔"

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب کوئی جج مقدمہ کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ محض مقدمہ ہی کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ خود اپنے انجام کا بھی فیصلہ کر رہا ہوتا ہے خواہ اسے اس کا کوئی شعور واحساس نہ ہو۔ اگر وہ حق کو سمجھنے اور جاننے کی پوری کوشش کرتا ہے اور پھر حق کے مطابق وہ فیصلہ کرتا ہے تو اس کا ٹھکانا جنت ہے لیکن اگر وہ حق کو جانتے ہوئے فیصلہ اس کے خلاف کرتا ہے تو وہ دوزخ کو اپنا ٹھکانا بناتا ہے۔ اسی طرح وہ قاضی بھی اپنا گھر دوزخ کو بناتا ہے جس کے فیصلے حق کی روشنی میں نہیں بلکہ جہل میں ہوتے ہیں۔ وہ حق اور ناحق کو جانتا نہیں محض جذبات اور نفسانی عوامل کے تحت فیصلے کرتا ہے۔

اسی طرح بغیر علم کے فتویٰ دینا بھی جرم عظیم ہے چناں چہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: مَنْ اَفْتٰی بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُہٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاہُ (ابوداؤد) "جس کسی نے بغیر علم کے فتویٰ دیا اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔"

قسم

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِہٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰہُ لَہُ النَّارَ وَ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ فَقَالَ لَہٗ رَجُلٌ وَ اِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ: وَ اِنْ کَانَ قَضْبًا مِنْ اَرَاکٍ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابواُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلم شخص کا حق مارے تو خدا نے اس کے لیے دوزخ واجب کر دیا اور جنت اس پر حرام کر دی۔" ایک شخص نے آپؐ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا: "اگر چہ وہ پیلو کے درخت کا ایک ٹکڑا (مسواک) ہی کیوں نہ ہو۔"

تشریح: معلوم ہوا کہ جنت کی پاکیزہ فضا اس شخص کے لیے نہیں ہے جو دوسرے کا حق مارتا ہو اور اس کے لیے جھوٹی قسم کھانے میں بھی اسے باک نہ ہو۔ اس کے لیے دوزخ کی آگ ہی

موزوں ہے۔ حق مارنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس نے کسی کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہو۔ بلکہ کسی مسلم کو معمولی نقصان پہنچا کر بھی وہ جنت سے دست بردار ہو رہا ہوتا ہے۔ یوں تو کسی بھی شخص کو نقصان پہنچانا اور اس کا حق مارنا جائز نہیں ہے لیکن جو اس کا بھی خیال نہ رکھے کہ وہ جس کا حق مارنے جا رہا ہے وہ اپنا ہی مسلمان بھائی ہے تو اس کی خباثتِ ذہنی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں اور کسی خباثت کی جنت میں گنجائش نہیں ہو سکتی۔

حدیث میں مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ (جو کوئی کسی مسلم شخص کا حق مارے) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کا حق مارنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرہ میں یہ بات فرمائی گئی ہے وہ مدینہ کا اسلامی معاشرہ تھا۔ اس معاشرہ میں بالعموم مسلمانوں ہی کے باہمی مقدمات فیصلے کے لیے آتے تھے۔ ورنہ جھوٹی قسم کھا کر کسی غیر مسلم کا حق مارنا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح کسی مسلمان کا حق مارنا حرام ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنِ صَبْرٍ وَهُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ لَقِيَ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانٌ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَ ذٰلِکَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً اِلٰى آخِرَ الْاٰيَةِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص کسی چیز پر مقید ہو کر قسم کھائے اور وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو کہ اس کا مقصد اس حلف سے کسی مسلم شخص کا مال حاصل کرنا ہو گا۔ وہ قیامت کے روز اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ خدا اس پر غضب ناک ہو گا۔“ چناں چہ اس کی تصدیق میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلاً اُولٰٓئِکَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ (جو لوگ اللہ کے عہد و پیمان اور اپنی قسموں کا تھوڑی قیمت پر سودا کرتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ نہ تو ان سے ہم کلام ہو گا اور نہ قیامت کے دن وہ ان کی طرف دیکھے گا، اور نہ ہی انھیں عمدگی اور نکھار عطا فرمائے گا۔ ان کے لیے تو دردناک عذاب مقدر ہے۔ (آل عمران: ۷۷)

تشریح: یعنی ایسا بدکردار شخص اسی کا مستحق ہو گا کہ وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو اس کی تائید

قرآن کی اس آیت سے ہوتی ہے جو روایت میں نقل کی گئی ہے۔ ایسا شخص خدا کی رحمت سے دور ہوگا۔ اسے خدا سے شرف ہم کلامی حاصل نہ ہو سکے گا جو ایک بڑی نعمت ہے۔ وہ خدا کی نگاہِ کرم سے محروم رہے گا۔ دنیا میں اس نے جس کم ظرفی اور بے مروتی کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ سے وہ اس کا استحقاق کھو بیٹھا کہ اس کی تکریم ہو اور وہ خدا کی نوازشوں سے بہرہ مند ہو سکے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنِ ادَّعٰى مَا لَيْسَ لَهٗ فَلَيْسَ مِنَّا وَلْيَتَبَوَّءْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”جو شخص کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی نہ ہو وہ ہرگز ہم میں سے نہیں ہے۔ اور اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

تشریح: ”وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ یعنی اس کا تعلق ہرگز ہماری پاک باز جماعت سے نہیں ہے۔ جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے۔ اس کا اختتام جہنم پر ہوگا۔ اسے چاہیے کہ جس طرح وہ اس پر راضی ہو گیا کہ جھوٹا دعویٰ کر کے کسی کی چیز پر قبضہ کر لے جو اس کے لیے مطلق حرام تھی تو اب وہ اس پر بھی راضی ہو جائے کہ اس کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا۔

گواہی

﴿۱﴾ عَنْ خُزَيْمِ بْنِ فَاتِكٍ قَالَ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الصُّبْحِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَامَ قَائِماً فَقَالَ عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالْاِشْرَاكِ بِاللّٰهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَرَأَ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ. (ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد، ترمذی)

ترجمہ: حضرت خزیمؓ بن فاتک کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول اللہ ﷺ جب صبح کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا: ”جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر ٹھہرائی گئی ہے۔“ پھر آپؐ نے (بہ طور دلیل) یہ آیت تلاوت فرمائی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (بتوں کی گندگی سے بچو اور بچو جھوٹی بات سے اس طور سے کہ اللہ کی طرف کے ہو کر رہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ)۔ (الحج: ۳۰-۳۱)

تشریح: احمد اور ترمذی نے اسے ایمن بن خزیم سے روایت کیا ہے۔

جھوٹی گواہی دینے والا جس کردار کا مظاہرہ کرتا ہے وہی کردار اس مشرک کا بھی ہوتا ہے جو خدا کے ساتھ شرک کا روادار ہوتا ہے۔ مشرکانہ عقائد و اعمال کی بنیاد جھوٹ پر قائم ہوتی ہے۔ کیوں کہ خدا کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں وہ وحدہٗ لاشریک لہ ہے۔ اس کی ذات ہر قسم کے شرک سے بے نیاز ہے۔ ایک مشرک جب شرک اختیار کرتا ہے تو درحقیقت ایک بڑے جھوٹ اور ظلم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے۔ جھوٹا گواہ بھی اپنی گواہی میں جھوٹ اور ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ دونوں ہی کے کردار جھوٹ اور کذب پر راضی ہوتے ہیں۔ اسی لیے جھوٹی گواہی اور شرک باللہ کو مساوی قرار دیا۔

اس روایت میں قرآن کی جس آیت کو نقل کیا گیا ہے اس میں مشرکانہ عمل اور جھوٹے قول کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں گہری مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے اپنی بات کی تائید میں اس آیت کو پیش فرمایا ہے۔ شرک اگر ایک گھناؤنا عمل ہے تو جھوٹی گواہی بھی کسی گندگی سے کم نہیں ہے۔ ابن ماجہ کی روایت میں تلاوت آیت کا ذکر نہیں ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَلاَ اُخْبِرُکُمْ بِخَیْرِ الشُّھَدَاءِ الَّذِیْنَ یَأْتِیْ بِشَھَادَتِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّسْأَلَھَا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت زید بن خالدؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں تمھیں بہترین گواہوں کی خبر نہ دوں؟ بہترین گواہ وہ ہے جو دریافت کرنے سے پہلے گواہی دیدے۔“

تشریح: بغیر طلب کے جو شخص گواہی دیتا اور حق کو ظاہر کرتا ہے وہ درحقیقت اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اس کو اس کا پورا احساس ہے کہ حق کا اظہار حق سے باخبر شخص کی ایک بڑی ذمہ داری ہے جس کو نظرانداز کرنا کسی طرح روا نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے وہ اپنی گواہی کو اس پر موقوف نہیں رکھتا کہ اسے گواہی کے لیے طلب کیا جائے اور اس سے گواہی کے لیے درخواست کی جائے۔ ایسا گواہ جس کو اپنی ذمہ داری کا اس درجہ احساس ہو اس سے بہتر دوسرا گواہ کون ہوسکتا ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْہِ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گواہ مدعی کے ذمے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔''

تشریح: یعنی یہ مدعی کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے حق میں ثبوت فراہم کرے۔ مدعا علیہ اگر مدعی کے دعویٰ کو رد کر دیتا ہے اور اس کے دعویٰ کو غلط قرار دیتا ہے۔ اب اگر مدعی کے پاس اپنے دعویٰ کے حق میں کوئی ثبوت اور گواہ وغیرہ نہیں ہے اور مدعا علیہ اس کے دعویٰ کو رد کر رہا ہے تو مدعی اس سے یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ قسم کھائے کہ ہم نے اس کے خلاف جو دعویٰ کیا ہے وہ غلط ہے۔ اس موقع پر مدعا علیہ کو قسم کھا کر اپنے صادق ہونے کا اظہار عدالت کے سامنے کرنا چاہیے تاکہ وہ بے تامل مقدمہ خارج کر سکے۔

﴿۴﴾ وَعَنْ عَمْرِوؓ بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لَا تَجُوْزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا زَانٍ وَلَا زَانِیَةٍ وَلَا ذِیْ غِمْرٍ عَلٰی اَخِیْهِ وَ رَدَّ شَهَادَةَ الْقَانِعِ لِاَهْلِ الْبَیْتِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''نہ تو خیانت کرنے والے مرد کی گواہی درست ہے اور نہ خیانت کرنے والی کسی عورت کی۔ نہ زنا کرنے والے مرد کی اور نہ زنا کرنے والی عورت کی گواہی درست ہے، اور نہ دشمنی رکھنے والے کی گواہی درست ہے جو اس کے بھائی کے خلاف ہو جس سے اس کو دشمنی ہو۔'' نیز آپؐ نے اس شخص کی گواہی کو بھی رد کر دیا جو ایک گھر کی کفالت میں تھا اور اس نے اس گھر والوں کے حق میں گواہی دی تھی۔

تشریح: گواہ اگر عادل ہوں تو عدالت کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس حدیث میں جن لوگوں کی گواہی کو ناقابلِ قبول قرار دیا گیا ہے وہ یا تو وہ ہیں جو عدل کے معیار پر پورے نہیں اُترتے یا ان کی پوزیشن ایسی ہے کہ ان کے بے لوث اور غیر جانب دار ہونے کے بارے میں خدشہ پایا جاتا ہے۔

خائن سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے جرم خیانت بار بار سرزد ہو چکا ہو جس کی وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں وہ قابلِ اعتماد قرار نہیں دیے جا سکتے۔ بعض اہلِ علم نے خیانت سے مراد فسق لیا ہے یعنی جو کبائر (بڑے گناہوں) کے مرتکب ہوئے ہوں۔ یا صغائر پر جن کا اصرار رہا ہو۔ یا دینی

فرائض اور واجبات کی بجا آوری کی جن کو کوئی پروانہ ہو۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے دینی امور میں روگردانی اختیار کرنا خدا اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت ہی ہے۔ چناں چہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞ (انفال:۲۷) ''اے ایمان والو، جانتے بوجھتے اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرنا اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہونا۔''

اس حدیث میں خیانت کے بعد زنا کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ذکر حقیقت میں تخصیص کے بعد بہ طور تعمیم کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس شخص کی گواہی بھی معتبر نہیں جس پر تہمت کی حد جاری کی گئی ہو۔ یعنی اس نے کسی پاک دامن شخص پر زنا کی تہمت لگائی ہو اور اس کی سزا میں اس پر حد قذف جاری کی گئی ہو تو اس کی گواہی بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قذف کے علاوہ دوسرے حدود میں یہ رعایت ہے کہ جس شخص پر حد جاری کی گئی ہو وہ اگر توبہ کرلیتا ہے تو اس کی گواہی قبول کرلی جائے گی۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ رعایت تمام ہی حدود سے متعلق ہے۔ اگر کسی پر حد جاری کی گئی ہو تو توبہ کے بعد اس کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ یہ حد تہمت لگانے کے سلسلہ میں جاری ہوئی ہو یا کسی دوسرے گناہ مثلاً ارتکاب زنا کے جرم میں جاری کی گئی ہو۔

حدیث کے آخری حصے سے معلوم ہوا کہ جو لوگ باہم ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہو ان کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف معتبر نہ ہوگی خواہ وہ آپس میں نسبی بھائی ہوں یا دینی بھائی ہوں۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی گھر پر قانع ہو یعنی اس کی کفالت اس گھر سے متعلق ہو اس کی گواہی یا شہادت اس گھر والوں کے حق میں غیر معتبر قرار پائے گی۔ جس طرح بیٹے کی گواہی اپنے باپ کے حق میں یا باپ کی بیٹے کے حق میں اور بیوی کی شوہر کے حق میں اور شوہر کی گواہی بیوی کے حق میں قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔

سفارش

(۱) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاهْدٰی لَهٗ هَدِیَّةً عَلَیْهَا فَقَبِلَهَا فَقَدْ اَتٰی بَاباً عَظِیْمًا مِنْ اَبْوَابِ الرِّبَا. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو اُمامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص کسی کی سفارش

کرے اور وہ جس کی سفارش کی جارہی ہو اسے ہدیہ بھیجے اور وہ اسے قبول کرلے تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہوا۔''

تشریح: یہ ہدیہ اگرچہ رشوت کی تعریف میں آتا ہے لیکن حضور ﷺ اسے سود قرار دے رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ ہدیہ سفارش کرنے والے کو بلاعوض حاصل ہوتا ہے۔ راشی اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے اسے یہ ہدیہ دینے پر ٹھیک اسی طرح مجبور ہوتا ہے۔ جس طرح شخص مجبور قرض حاصل کرنے کے لیے سود کی رقم ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور سود خوار محض اس کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔

رشوت

〈۱〉 عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

تشریح: لعنت درحقیقت انتہائی ناراضی اور بیزاری کا اظہار ہے۔ جب لعنت خدا کی طرف سے کسی پر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اسے اپنی رحمتوں سے محروم کردینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اگر یہ لعنت خدا کے رسول یا فرشتوں کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب اس شخص سے انتہائی بیزاری اور اس کے قابلِ لعنت ہونے کا اظہار یا یہ بددعا ہوتی ہے کہ خدا اسے اپنی رحمت سے محروم کردے۔ سراپا رحمت ذات خدا کے رسول ﷺ کے لعنت فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ رشوت لینے کا جرم نہایت سنگین قسم کا جرم ہے۔ رشوت لینے والا رشوت لے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر انسانیت اور مروت نام کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ ایک انسان اگر انسانیت کے بلند مقام سے گرتا ہے اور اس عظمت کی اُسے کوئی پروانہیں ہوتی جو خدا نے اسے عطا کی تھی تو اس سے بڑھ کر ناشکرا دوسرا کون ہوگا۔ جس پر خدا کا رسول لعنت کرے اس کی بدبختی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

ترمذی نے اسے حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے اسے شعب الایمان میں حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا ہے۔ بیہقی کی روایت میں وَالرَّائِشُ

کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی وہ شخص جو رشوت دینے اور رشوت لینے والے کے درمیان واسطہ اور ذریعہ بنتا ہے۔ خدا کے رسول ﷺ نے اس پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک سنگین جرم ہے کہ کوئی رشوت دے کر حاکم کو عدل سے باز رکھے اور رشوت کے زور پر اس سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے جب کہ عدل وانصاف کی رو سے فیصلہ اس کے حق میں نہ ہو سکتا ہو۔

صلح

﴿۱﴾ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفِ نِ الْمُزَنِيِّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلصُّلْحُ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلَّا صُلْحاً حَرَّمَ حَلَالاً اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا وَّالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطاً حَرَّمَ حَلَالاً اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا. (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوف مزنیؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے لیکن ایسی صلح جائز نہیں ہے جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دینے کی موجب ہو۔ اور مسلمان اپنی شرائط پر قائم رہتے ہیں۔ البتہ اس شرط کی پابندی جائز نہیں جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے کی موجب ہو۔“

تشریح: گھریلو معاملات ہوں یا امور سیاسی و معاشی، تمام ہی امور میں صلح میں بھلائی ہے۔ صلح سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اس سے ذہنی تناؤ (Tension) رفع ہوتا ہے۔ باہمی تصادم اور ٹکراؤ سے نجات ملتی ہے۔ اس سے لوگوں میں باہم خوش گوار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر تعلقات پہلے سے بہتر ہیں تو ان کو اس سے مزید تقویت پہنچتی ہے۔ اس لیے قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء:۱۲۸) ”صلح بہر حال بہتر ہے۔“

اسلام درحقیقت امن پسند دین ہے۔ اس لیے صلح، ایثار، فیاضی اور بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ کی تعلیمات اسلام کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔

مسلمان اپنی شرطوں پر قائم رہتے ہیں یعنی مسلمان کا کردار یہ ہے کہ وہ صلح ہو یا جنگ یا دوسرے معاملات وہ جن شرطوں پر عہد و پیمان اور صلح کرتے ہیں ان کی پاسداری اور پابندی ان کے لیے ضروری ہے۔ البتہ اس شرط کی پابندی جائز نہ ہوگی جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر دینے کی موجب ہو۔ مثلاً کسی معاملہ میں کوئی اس شرط پر صلح کرے کہ وہ اپنی بیوی کی موجودگی میں اس

کی بہن سے بھی شادی کرلے گا تو اس شرط کی پاسداری جائز نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی پاسداری سے ایک ایسی چیز کو حلال قرار دینا لازم آتا ہے جو قطعاً حرام ہے۔ اسلامی شریعت میں یہ جائز نہیں ہے کہ دو بہنوں کو نکاح میں ایک ساتھ جمع کرلیا جائے۔ اسی طرح یہ شرط بھی درست نہیں ہے کہ کوئی صلح کے لیے اس شرط کو قبول کرلے کہ وہ اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کرے گا۔ کیوں کہ وہ ایک حلال اور جائز چیز کو اپنے لیے حرام قرار دے رہا ہے۔

قانون سازِی اور اِجتہاد

﴿۱﴾ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ وَ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَؓ قَالاَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ وَ اَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اِنْ حَکَمَ فَاجْتَھَدَ وَاَخْطَأَ فَلَہٗ اَجْرٌ وَاحِدٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب کوئی حاکم حکم وفیصلہ دینے لگے تو اجتہاد کرے۔ اب اگر اس کا فیصلہ صحیح ہوگا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر وہ حکم وفیصلہ دینے کو ہو اور اجتہاد کرے لیکن صحیح حکم تک پہنچنے میں اس سے خطا ہوگئی تو اسے ایک اجر ملے گا۔“

تشریح: اسلام میں قانون سازی کی اصل بنیاد قرآن اور نبی ﷺ کی سنت مبارکہ ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن وسنت کی تعلیمات سے بے نیاز ہو کر کوئی بھی قانون سازی نہیں کی جاسکتی۔ قانون سازی کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب پیش آمدہ کسی حل طلب مسئلہ کے بارے میں کتاب وسنت میں واضح اور صریح حکم موجود نہ ہو۔ ورنہ قرآن وسنت کے احکام ہی اصل اسلامی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن اور احادیث نبوی میں یوں تو ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں، اس کے باوجود کوئی قضیہ یا معاملہ ایسا پیش آسکتا ہے جس کے متعلق کتاب وسنت میں واضح حکم نہ پایا جاتا ہو۔ ایسی صورت میں اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اہلِ علم مجتہد ایسی حالت میں کتاب وسنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے تعامل اور شریعت کے مزاج اور اس کی روح وغیرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے پوری طرح غور وفکر اور تدبر کر کے نئے قضیے یا مسئلہ کے سلسلے میں شریعت کا حکم یا قانون معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے اس اجتہاد میں پورے

اخلاص اور دیانت داری سے کام لیتے ہیں۔ وہ جس فیصلہ پر پہنچتے ہیں وہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مجتہد بھی ایک انسان ہی ہوتا ہے۔ باوجود ساری کوشش اور غور وفکر کے غلطی کا امکان بہر حال رہتا ہے۔ مجتہد اپنے علم اور اپنی سوجھ بوجھ ہی کی حد تک مکلّف ہے۔ اگر اس سے غلطی بھی ہوتی ہے تو اس صورت میں بھی وہ ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے کہ اس نے اپنی حد تک شریعت کا منشا جاننے کے لیے غور وفکر میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اگر اس کا فیصلہ کتاب وسنت کے منشا کے مطابق ہوا تو اسے دو اجر ملیں گے۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَوْمَ الْاَحْزَابِ لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدٌ الْعَصْرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَةَ فَاَدْرَکَ بَعْضُهُمُ الْعَصْرَ فِی الطَّرِیْقِ فَقَالَ لَا نُصَلِّیْ حَتّٰی نَاتِیَهَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ نُصَلِّیْ لَمْ یُرِدْ مِنَّا ذٰلِکَ ذُکِرَ لِلنَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ یُعَنِّفْ وَاحِداً مِّنْهُمْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جنگ خندق کے روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(تم میں سے) ہر ایک نماز عصر بنی قریظہ پہنچ کر پڑھے۔'' مگر نماز عصر کا وقت راستہ ہی میں آ گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تو وہیں پہنچ کر نماز ادا کریں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہم تو پڑھ لیتے ہیں کیوں کہ حضوؐر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم نماز قضا کر دیں جب اس واقعہ کا ذکر نبی ﷺ سے کیا گیا تو آپؐ نے ان میں سے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

تشریح: یہ روایت اس بات کی ایک واضح مثال اور نظیر ہے کہ اجتہادی معاملات میں نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود اختلاف ہوسکتا ہے۔ اور اس قسم کا اختلاف روا ہی نہیں، امت کے لیے رحمت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت میں تنگی کے بجائے بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ ہر صاحب علم وفہم اپنے فہم کے مطابق احکام پر عمل پیرا ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے اختلاف وہ نہیں ہیں جن کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے اور اسے ایک سنگین قسم کا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کے اختلافات تو علمی وفکری ارتقا کی جان ہیں۔ ان کے ذریعہ سے حیات میں روح باقی رہتی ہے۔ اور یہ اس بات کا بین ثبوت ہوتے ہیں کہ سوسائٹی عقل وفکر رکھنے والے افراد سے خالی نہیں ہے بلکہ سوسائٹی میں ایسے افراد موجود ہیں جو غور وفکر، تحقیق وتجسس اور فہم وتفقہ سے کام لیتے ہیں۔ جو

اصول میں متفق رہ کر ایک طرف اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہیں اور دوسری طرف صحیح حدود کے اندر رہ کر تحقیق واجتہاد سے کام لے کر ترقی اور علم وارتقا کے راستے کو وا رکھتے ہیں۔ اس کے بغیر سوسائٹی کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ کسی بھی جزوی مسئلہ کی تحقیق میں دو عالموں کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے۔ دونوں ہی اپنے اپنے دلائل پیش کر کے تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں۔ پھر یہ بات رائے عام پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ جس کو چاہیں قبول کریں یا دونوں کو جائز رکھیں۔ مسئلہ اگر عدالتی ہے تو آخری عدالت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس کو چاہے قبول کرے۔ مسئلہ اگر اجتماعی نوعیت کا ہے تو یہ نظامِ جماعت کا کام ہے کہ جس کو چاہے اختیار کرے یا دونوں ہی کو روا رکھے۔ اس طرح کے اختلافات سے نہ تو کوئی دین سے خارج قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اسے ضال ومضل کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس مسئلہ کو اور اس میں اپنی رائے کو مدار دین نہیں قرار دیتا اور نہ اسے قبول نہ کرنے والوں کو خارج از اسلام سمجھتا ہے۔

دین میں جو اختلاف لائقِ مذمت ہے وہ یہ ہے کہ کوئی دین کی اصل بینادوں ہی میں اختلاف کرنے لگ جائے یا ایسے مسائل کو جن کو خدا اور اس کے رسولؐ نے دین کے بنیادی مسائل قرار نہیں دیے ہیں وہ ان کو اور ان میں اپنی رایوں کو دین کے بنیادی اور اصولی مسائل قرار دے اور اپنے حامیوں کو لے کر ایک گروہ کھڑا کرے اور ان لوگوں کو جو اس کے گروہ یا اس کے اس جتھے میں شامل نہ ہوں ان کے دین وایمان سے بے بہرہ اور جہنمی ہونے کا اعلان کرنے لگ جائے۔ اس قسم کا اختلاف اور فرقہ بندی وہ سنگین جرم ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔ اس کی قرآن میں جگہ جگہ مذمت کی گئی ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَجُلاً اَتَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وُلِدَ لِیْ غُلَامٌ اَسْوَدُ فَقَالَ: هَلْ لَّکَ مِنْ اِبِلٍ؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: مَا اَلْوَانُهَا؟ قَالَ: حُمْرٌ قَالَ: هَلْ فِیْهَا مِنْ اَوْرَقَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَاَنّٰی ذٰلِکَ؟ قَالَ: لَعَلَّهٗ نَزَعَهٗ عِرْقٌ. قَالَ: فَلَعَلَّ اِبْنَکَ هٰذَا نَزَعَهٗ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ، میرے یہاں ایک کالا لڑکا پیدا ہوا ہے (جسے میں اپنا نہیں سمجھتا)۔ آپؐ نے فرمایا: ”تمہارے پاس اونٹ ہیں؟“ اس نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ”ان کا

رنگ کیسا ہے؟ اس نے کہا کہ سرخ ہے۔ آپؐ نے پوچھا: ''ان میں کوئی سفید مائل بہ سیاہی بھی ہے؟'' اس نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہاں سے آیا؟'' اس نے کہا کہ شاید کسی رَگ نے اسے کھینچا ہو۔ آپ نے فرمایا: ''اسی طرح ممکن ہے تیرے بیٹے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔''

تشریح: اس لیے تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم اس بچے کو اپنا بچہ تسلیم کرنے سے انکار کرو۔ انسانوں میں رنگ کی تبدیلی کو حیوانات میں رنگ کی تبدیلی پر قیاس فرمایا۔ معلوم ہوا کہ قیاس وفکر کو بھی دین میں اہمیت حاصل ہے۔ قیاس وفکر کے بغیر اجتہاد ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کے بغیر پیش آنے والے نئے مسائل میں منشائے شریعت کو جاننا ممکن نہیں ہوتا۔

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: اَتٰی رَجُلٌ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: اِنَّ اُخْتِیْ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ وَ اِنَّهَا مَاتَتْ. فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: لَوْ کَانَ عَلَیْهَا دَیْنٌ اَکُنْتَ قَاضِیَهٗ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَاقْضِ دَیْنَ اللّٰهِ، فَهُوَ اَحَقُّ بِالْقَضَاءِ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ مرگئی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتے؟'' اس نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو پھر اللہ کا قرض بھی ادا کرو، کیوں کہ اس کا ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔''

تشریح: اس سے پہلے جو حدیث گزری ہے اس میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کی رنگ کی تبدیلی کو حیوانوں کے رنگ کی تبدیلی پر قیاس فرمایا۔ اس حدیث میں آپؐ اللہ کے قرض کو ادا کرنے کو انسانوں کے قرض پر قیاس کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ جب کسی انسان کے قرض کو ادا کرنا ضروری ہے تو اللہ کے قرض اور اس کے مطالبہ کو ادا کرنا بہ طریق اولیٰ ضروری ہوگا۔ اسی کو قیاس کہتے ہیں۔ ان حدیثوں سے قیاس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے۔ چند ایک کے علاوہ تمام ہی فقہاء جب ضرورت ہو قیاس کے جواز پر متفق ہیں۔ جمہور صحابہؓ اور تابعین سے قیاس منقول بھی ہے۔ جس قیاس ورائے کی مذمت کی گئی ہے وہ درحقیقت فاسد قیاس ورائے ہے۔ جس کی کوئی بنیاد اور اصل نہ ہو، محض خواہش نفس جس کا اصل محرک ہو۔

ضرورت و مصلحت کا لحاظ

(۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَوْلَا حَدَاثَةُ عَهْدِ قَوْمِكِ بِالْكُفْرِ لَنَقَضْتُ الْبَيْتَ وَلَجَعَلْتُهَا عَلٰى اَسَاسِ اِبْرَاهِيْمَ فَاِنَّ قُرَيْشاً حِيْنَ بَنَتِ الْبَيْتَ اِسْتَقْصَرَتْ وَ لَجَعَلْتُ لَهَا خَلْفًا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر تمہاری قوم کا زمانۂ کفر ابھی جلد ہی نہ گزرا ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ کر ابراہیمؑ کی بنیاد پر اس کی تعمیر کرتا۔ کیوں کہ قریش نے جب کعبہ کی تعمیر کی تو اسے چھوٹا کر دیا۔ میں اس میں ایک دروازہ پیچھے کی طرف بھی رکھتا۔“

تشریح: حطیم کا قطعہ بھی کعبہ ہی کا حصہ تھا جس کو چھوڑ کر قریش نے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حطیم چھ ذراع کعبہ کی جانب بیت اللہ میں بلا اختلاف داخل ہے۔ اس سے زائد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ قریش کو ایمان لائے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کعبہ کو توڑ کر اس کی تعمیر کرنے کو وہ پسند نہ کریں اور کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس لیے اس خواہش کے باوجود کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کی اصل اساس پر ہو اور کعبہ کا جو حصہ کعبہ میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے اسے نئی تعمیر میں بیت اللہ میں شامل کر لیا جائے۔ آپ نے کعبہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسے جوں کا توں رہنے دیا۔ حضور ﷺ کے اس طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کسی امر کو ضرورت اور مصلحت کے تحت ترک یا مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ بہ شرطے کہ اس سے اصل دین کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو۔ چوں کہ حطیم کعبہ ہی کا حصہ ہے اس لیے کعبہ کا طواف حطیم کے اندر سے نہیں بلکہ اس کے باہر سے کیا جائے گا۔

(۲) وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ بِتَاخِيْرِ الْعِشَاءِ وَبِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری اُمت زیادہ مشقت میں پڑ جائے گی تو میں لوگوں کو حکم دیتا کہ وہ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھیں اور ہر نماز کے لیے مسواک کیا کریں۔“

تشریح: یعنی مجھے اس کا ڈر ہے کہ میری امت کے لوگ سخت دشواری میں پڑ جائیں گے اور ان پر بہت گراں گزرے گا۔ اگر یہ ڈر اور اندیشہ نہ ہوتا تو میں لازم کر دیتا کہ لوگ عشاء کی نماز تاخیر سے ادا کریں اور ہر نماز کے وقت وضو میں مسواک کرنے کو بھی لازم کر دیتا۔ اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھی جائے۔ اور ہر نماز کے وقت وضو میں مسواک بھی کی جائے۔

دین میں سختی نہیں پائی جاتی۔ حضورؐ کا ارشاد ہے: اَلدِّیْنُ یُسْرٌ (دین آسان ہے)۔ اسی لیے سفیان ثوریؒ نے کہا ہے کہ "فقیہ وہ ہے جو آسانیاں بہم پہنچائے۔ سخت فتویٰ دینا نہایت آسان بات ہے۔" فقہاء کے یہاں کلیہ ہے المشقة تجلب التیسر "مشقت آسانی کی طالب ہوتی ہے۔" امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اذا ضاق الامر تسع "جب کسی معاملے میں تنگی پیدا ہو جائے تو اس میں وسعت دی جاتی ہے۔" دین کا مزاج آسانی پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں صاف الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرہ:۱۸۵) "اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، وہ تمہارے ساتھ سختی و دشواری نہیں چاہتا۔"

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے: لاَ یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَهَا (البقرہ:۲۸۶) "اللہ کسی جان پر بس اس کی طاقت و وسعت کے مطابق ذمہ داری کا بوجھ ڈالتا ہے۔"

مردار، سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کا کھانا اسلام میں حرام ہے۔ لیکن اضطرار یا انتہائی مجبوری کی حالت میں کھا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ حد سے تجاوز نہ کرے۔ (البقرہ:۱۷۳)

بیمار یا مسافر کو اس کی اجازت ہے کہ وہ بیماری یا سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھے، جتنے روزے رکھنے سے رہ جائیں ان کو بعد میں پورا کر لے۔ مسافرت میں قصر نماز کی سہولت بھی دی گئی ہے۔ ۴ رکعتوں کی جگہ دو ہی رکعت پڑھے۔ جنگ اگر چھڑ جائے تو نماز کو ملتوی بھی کر سکتے ہیں۔ غزوہ خندق میں نبی ﷺ اور صحابہؓ کی مسلسل چار وقت کی نماز قضا ہوگئی جو بعد میں ادا کی گئی۔

کوئی مریض اگر کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔ اور اگر بیٹھنے کی بھی سکت نہیں تو پہلو پر لیٹے لیٹے ہی نماز پڑھے (بخاری، عن عمران بن حصینؓ)۔ اسی طرح اگر سردی زیادہ ہو

یا تیز ہو یا تیز بارش ہو رہی ہو تو موذن حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ کے بجائے صَلُّوْا فِیْ رِحَالِکُمْ (اپنے گھروں میں نماز پڑھ لو) پکار دے (رواہ السنہ عن ابن عمرؓ)۔ حکم ہے کہ نماز اتنی طویل نہ کرے کہ مقتدی اکتا جائیں (مسلم، بخاری، ابوداؤد، نسائی۔ عن جابرؓ)۔ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمزور اور بیمار مقتدیوں کا لحاظ رکھے (رواہ السنہ۔ عن ابی ہریرۃؓ)۔ اگر نماز میں عورتیں بھی شریک ہیں اور وہ اپنے بچوں کو گھر چھوڑ کر آئی ہوں تو ان کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں اختصار سے کام لیا جائے۔
(بخاری، مسلم، ترمذی، عن انسؓ)

دین میں جذبات کی بھی پوری رعایت پائی جاتی ہے۔ چناں چہ اگر منفرد نماز پڑھ رہے ہوں اور قرآن کی کسی آیت میں روحانی کیف پیدا ہو رہا ہو تو اس کی اجازت ہے کہ جب تک دل چاہے اسے دُہرا سکتے ہیں (نسائی، عن ابی ذرؓ)۔

اُمراء کے اندر فسق و فجور کے مشاہدے کے بعد بھی ان کے خلاف خروج کرنے سے روکا گیا ہے۔ کیوں کہ قوی اندیشہ ہے کہ اس سے فتنہ رونما ہوگا اور خوں ریزی ہوگی۔ اسی طرح دشمن کی سرزمین میں کسی پر حد جاری نہیں کریں گے کہ مبادا وہ وسوسہ شیطانی سے مغلوب ہو جائے اور دشمنوں سے جا ملے۔ عام حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا حد کو ٹالا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ نے استحسان، امام مالکؒ نے مصالح مرسلہ، امام غزالیؒ نے استصلاح اور بعض شوافع اور حنابلہ نے استصحاب الاحوال کی جو اصطلاحیں ایجاد کی ہیں ان سبھی کے اندر تقریباً ایک ہی روح کام کر رہی ہے کہ تشریع کے وقت انفع الناس اور مصلحت و عدل اور یسر و حکمت کو ترجیح حاصل ہوگی۔

جدید اور زندگی کے گوناگوں مسائل میں راہِ توسع اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور توسع مزاجِ شریعت کے عین مطابق ہے لیکن اس سلسلے میں قدم بہت کم آگے بڑھایا گیا ہے۔ فروعی مسائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول گم ہو گئے۔ روح و معانی پر نگاہ قائم نہ رہ سکی۔ نظر ظواہر پر مرکوز ہو کر رہ گئی اور مختلف فرقے اور پھر فرقوں کے اندر فرقے پیدا ہو گئے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ بُرَیْدَۃَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: نَھَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَۃِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْھَا وَ نَھَیْتُکُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْاَضَاحِیْ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَاَمْسِکُوْا مَا بَدَأَ لَکُمْ وَ نَھَیْتُکُمْ عَنِ النَّبِیْذِ اِلَّا فِیْ سِقَآءٍ فَاشْرَبُوْا فِی الْاَسْقِیَۃِ کُلِّھَا وَلَا تَشْرَبُوْا

مُسْكِرًا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا، اب ان کی زیارت کرو، اور میں نے تمھیں تین روز کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے روکا تھا، اب رکھو قربانی کا گوشت جب تک رکھ سکو نیز منع کیا تھا تمھیں نبیذ سے مگر مشک کے اندر کی نبیذ سے منع نہیں کیا تھا، اب تم جس برتن میں چاہو پیو، لیکن نشہ لانے والی چیز ہرگز نہ پیو۔“

تشریح: ابتدا میں نبی ﷺ نے لوگوں کو قبروں پر جانے سے روکا تھا۔ زمانۂ جاہلیت کو گزرے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں قبروں پر جا کر لوگ کوئی جاہلانہ حرکت نہ کرنے لگیں۔ لیکن جب آپؐ نے دیکھا کہ اسلام نے دلوں میں رسوخ حاصل کر لیا ہے اور لوگ اسلام کے مزاج آشنا ہو گئے ہیں تو آپؐ نے اس کی اجازت دیدی کہ لوگ قبروں پر جا سکتے ہیں۔ زیارتِ قبور سے دنیا کی ناپائیداری کا احساس اُبھرتا ہے، اپنی موت یاد آتی ہے۔ اور جو لوگ دنیا سے جا چکے ہیں اُن کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے قبروں کی زیارت ایک مستحب فعل ہے۔

عورتوں کے لیے نبی ﷺ کے روضے کے علاوہ دوسری قبروں پر جانا درست نہیں۔ گرچہ بعض حضرات ان کے لیے بھی قبروں پر جانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کو دولت اور معیشت کی فراوانی حاصل نہیں تھی۔ اکثر لوگ تنگ دست تھے۔ ہر شخص کو قربانی کرنے کی استطاعت حاصل نہ تھی۔ اس لیے نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ قربانی کرنے والے قربانی کا گوشت تین روز سے زیادہ رکھ کر نہ کھائیں بلکہ اسے اپنے نادار بھائیوں میں تقسیم کر دیا کریں۔ مگر جب حالات بدل گئے اور اسبابِ معیشت میں وسعت پیدا ہوئی اور لوگ بالعموم دوسروں کی قربانی کے گوشت کے حاجت مند نہیں رہے تو پھر آپؐ نے اس کی اجازت دیدی کہ قربانی کا گوشت جتنے روز تک چاہیں رکھ کر کھا سکتے ہیں۔

نبیذ ایک قسم کا مشروب ہے۔ کھجور یا انگور کو پانی میں ڈال کر رکھ دیتے تھے۔ چند روز تک پانی میں رہنے سے ایک ذائقہ دار مشروب تیار ہو جاتا تھا۔ اس کا پینا اس وقت تک حلال ہے جب تک کہ اس میں نشہ نہ آ جائے۔ نبی ﷺ نے ابتدا میں حکم دیا تھا کہ نبیذ کو مشک میں رکھا جائے۔ کیوں کہ مشک پتلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس میں رکھی ہوئی نبیذ جلد ہی گرم ہو کر نشہ آور نہیں

ہو جاتی۔ جب لوگ شراب کی حرمت سے اچھی طرح واقف ہو گئے بلکہ شراب سے انھیں نفرت ہو گئی تو اس کا اندیشہ باقی نہیں رہا کہ لوگ پھر نشہ کی طرف مائل ہو سکتے ہیں تو ان کو اس کی اجازت دے دی گئی کہ وہ جس برتن میں چاہیں نبیذ رکھ سکتے ہیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام کے احکام میں کوئی بھی حکم برائے حکم نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت و مصلحت پائی جاتی ہے۔ خواہ ہماری نگاہ اس حکمت و مصلحت تک نہ پہنچ سکے۔

مباحات

(۱) عَنْ اَبِیْ ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِیِّؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی فَرَضَ فَرَائِضَ فَلاَ تُضَیِّعُوْھَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلاَ تَعْتَدُوْھَا وَ حَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلاَ تَنْتَھِکُوْھَا وَ سَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ رَحْمَةً لَّکُمْ غَیْرَ نِسْیَانٍ فَلاَ تَبْحَثُوْا عَنْھَا. (الدار قطنی)

ترجمہ: حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”بے شک خدا نے تم پر فرائض کو عائد کیا ہے۔ پس اس کو ضائع نہ کرو۔ اور اس نے حدود مقرر کیا ہے تو حدود سے تجاوز نہ کرو۔ اس نے بہت سی چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، تو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اور اس نے بہت سی چیزوں کے بارے میں تم پر رحمت کی غرض سے بغیر بھول اور نسیان کے سکوت فرمایا ہے تو تم ان میں کرید نہ کرو۔“

تشریح: ابو ثعلبہ الخشنی کے اصل نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے جرہم بن ثابت، بعض نے جرثوم بن ثابت اور بعض نے عمر بن جرثوم لکھا ہے۔ یہ اپنی کنیت ابو ثعلبہ سے مشہور ہیں۔ قبیلہ قضاعہ کی ایک شاخ خشن سے ان کا تعلق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلہ کی طرف تبلیغ کی غرض سے بھیجا تھا۔ ان کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ان کا قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ آخر میں انھوں نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

اس حدیث میں کئی احکام بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے کہ فرائض کے پورے طور پر پابند رہو۔ فرائض کے ادا کرنے میں ان کے آداب و شرائط کا پورا لحاظ رکھو۔ اس سلسلے میں ریا اور نام و نمود کی خواہش سے تمہارے قلوب پاک ہوں۔

قصاص وغیرہ جو بھی حدود مقرر فرماتے ہیں ان میں کوئی کمی اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔

حرام چیزوں سے تمھیں قطعاً دور رہنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کی غفلت کو روا نہیں رکھنا ہے۔

اس حدیث میں یہ کہا گیا کہ اس نے بہت سی چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے تو یہ سکوت یا خاموشی رحمت ہے۔ اس میں امت کے لیے بڑی کشادگی ہے۔ یہ سکوت کسی بھول چوک یا نسیان کی وجہ سے نہیں ہے۔ خدا کے یہاں بھول چوک اور نسیان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ علیم وخبیر ہے۔ اس کی ذات ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ اس نے قصداً اور دانستہ طور پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔ اس لیے جن چیزوں کے بارے میں اس نے خاموشی اختیار کی ہے لوگوں کو چاہیے کہ ان کے متعلق بلاضرورت بحث مباحثہ میں نہ پڑیں۔

اسناد کے پہلو سے اس روایت میں کچھ محدثین نے کلام کیا ہے لیکن اپنے معنی ومفہوم کے لحاظ سے یہ حدیث شریعت کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

﴿۲﴾ وَعَنْ قَبِيصَةَ بْنِ هَلْبٍ عَنْ اَبِيهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَ سَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ مِنَ الطَّعَامِ طَعَامًا اَتَحَرَّجُ مِنْهُ. فَقَالَ: لاَ يَتَخَلَّجَنَّ فِيْ نَفْسِكَ شَيْءٌ ضَارَعَتْ فِيهِ النَّصْرَانِيَّةُ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت قبیصہ بن ہلب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپؐ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کھانے کی چیزوں میں سے کوئی ایسی چیز ہے جس سے میں پرہیز کروں؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''تمہارے دل میں کسی شبہ کا گزر نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے کو نصرانیت (رہبانیت) کے قریب اور اس کے مشابہ کرو۔''

تشریح: حلال سے زیادہ حرام چیزوں کے جاننے کی فکر و دلچسپی کو کسی صحت مند ذہن کی علامت نہیں کہا جا سکتا۔ خدا نے جن چیزوں کی حرمت کی تصریح کر دی ہے ان کے سوا ساری طیب اور مفید چیزوں کو خدا نے اپنے بندوں کے لیے حلال کر دیا ہے۔ پاک اور طیب چیزوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ان طیب چیزوں سے عدم دلچسپی یا ان کو اپنے لیے حرام قرار دے لینا خدا کی نعمت کی ناقدری ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاوجہ ہر چیز میں شک وشبہ کرنا اور خدا کی نعمتوں کو برتنے کے بجائے زیادہ دلچسپی اس میں دکھانا کہ کون سی چیز ممنوع اور لائق پرہیز ہوسکتی ہے۔

اسلام کے مزاج سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مزاج رہبانیت کا ہے جس کو اس روایت میں نصرانیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رہبانی فکر کو نصرانیت نے کافی اہمیت دی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ذہنی اور نفسیاتی بیماری ہے۔ صحت مند زندگی گزارنے کے لیے اس مرض کا علاج نہایت ضروری ہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: اَرَادَ النَّبِیُّ ﷺ اَنْ یَّکْتُبَ اِلَی الرُّوْمِ فَقَالُوْا اَنَّھُمْ لَا یَقْرَؤُنَ کِتَابًا اِلَّا مَخْتُوْماً فَاتَّخَذَ خَاتِمًا مِّنْ فِضَّۃٍ فَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی بَیَاضِہٖ فِیْ یَدِہٖ وَ نَقَشَ فِیْہِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی ﷺ نے روم کے حکمراں کو خط لکھنا چاہا تو آپؐ سے کہا گیا کہ وہ لوگ خط کو نہیں پڑھتے جب تک کہ اس پر مہر نہ ہو۔ لہٰذا آپؐ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی۔ گویا میں اب بھی اس کی چمک آپؐ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس میں آپؐ نے محمد رسول اللہ کندہ کرایا تھا۔

تشریح: آپؐ کو جب معلوم ہوا کہ خط پر بھیجنے والے کی مہر اگر نہیں لگی ہے تو حکمراں اسے لائق اعتبار نہیں سمجھتے، تو آپؐ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی اور اس پر اپنے نام اور منصب کہ آپ خدا کے رسول ہیں دونوں کندہ کرائے۔ اور نامۂ مبارک پر اپنی مہر ثبت کر کے اسے روم کے حکمراں قیصر کے پاس روانہ فرمایا۔ اصل میں مباحات اور جواز کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ جس چیز کی ممانعت شریعت نے صریح طور پر نہیں کی ہے اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جس کام کے بغیر کوئی بڑا نقصان ہو رہا ہو وہ کام تو صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔

حق تنقید

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ اَوْ اَبِیْ سَعِیْدٍؓ شَکَّ الْاَعْمَشُ قَالَ: لَمَّا کَانَ یَوْمُ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ اَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَۃٌ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَذِنْتَ لَنَا فَنَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا فَاَکَلْنَا وَادَّھَنَّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِفْعَلُوْا قَالَ: فَجَاءَ عُمَرُ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنْ فَعَلْتَ قَلَّ الظَّھْرُ وَلٰکِنْ ادْعُھُمْ بِفَضْلِ اَزْوَادِھِمْ ثُمَّ ادْعُ اللّٰہَ لَھُمْ عَلَیْھِمْ بِالْبَرَکَۃِ لَعَلَّ اللّٰہَ اَنْ یَّجْعَلَ فِیْ ذٰلِکَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ یا حضرت ابوسعیدؓ (حضرت اعمش کو شک ہے) سے روایت ہے کہ جب غزوۂ تبوک کا وقت آیا تو لوگ سخت بھوک سے دوچار ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، کاش آپؐ ہمیں اجازت دیتے تو ہم اپنے اونٹوں کو جن پر پانی لاتے ہیں ذبح کر ڈالتے۔ پھر ہم کھاتے اور تروتازگی حاصل کرتے۔ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ''اچھا ذبح کرو۔'' راوی کہتے ہیں کہ اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر ایسا کیجئے گا تو سواریوں کی کمی واقع ہوجائے گی۔ البتہ سب لوگوں کو بلا بھیجئے کہ وہ اپنا بچا ہوا توشہ لے کر آئیں۔ پھر خدا سے دعا کیجیے کہ توشے میں برکت دے۔ شاید اللہ اس میں کوئی راستہ نکال دے۔

تشریح: روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عمرؓ کی تجویز پر عمل بھی کیا۔ جو کچھ لوگوں کے پاس بچا ہوا تھا وہ لے کر آئے۔ ایک دسترخوان پر سب اکٹھا ہوئے۔ پھر آپؐ نے دعا فرمائی۔ اور پھر سب نے سیر ہو کر کھایا۔ کچھ بچ بھی گیا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے کہ اگر کسی کو سربراہ کے کسی فیصلہ پر اطمینان نہ ہو تو وہ اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرسکتا ہے۔ حاکم کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے برا نہ مانے بلکہ اگر اختلاف کرنے والے کا اختلاف معقول ہو تو وہ اپنے فیصلہ کو بدل دے۔

اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ بھی تفصیل سے صحیح مسلم میں بیان ہوا ہے۔ ایک بار نبی ﷺ کے پاس حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ موجود تھے۔ نبی ﷺ اُٹھے اور باہر تشریف لے گئے۔ آپؐ کی واپسی میں دیر ہوئی تو حضرت ابوہریرہؓ کو تشویش ہوئی، انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں دشمن آپ کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ وہ آپؐ کی تلاش میں نکلے۔ بالآخر بنی نجار کے باغ میں وہ آپؐ سے ملے۔ حضورؐ نے انھیں اپنی دونوں جوتیاں نشانی کے طور پر دیں اور کہا کہ جاؤ ایسا جو شخص اس باغ کے پیچھے ملے جو اس کی گواہی دیتا ہو کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ اس پر دل سے یقین بھی رکھتا ہو تو اسے جنت کی خوش خبری دے دو۔ اتفاق سے سب سے پہلے جو شخص ملا وہ حضرت عمرؓ تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی جوتیاں ہیں۔ آپؐ نے ان کو دے کر مجھے بھیجا ہے کہ میں جس سے ملوں، اگر وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی گواہی دل کے اطمینان کے ساتھ دیتا ہو تو میں اسے جنت کی خوش خبری دے دوں۔ حضرت عمرؓ نے انھیں مارا اور کہا کہ رسول اللہ کے پاس لوٹ جاؤ۔ حضرت عمرؓ بھی ان کے پیچھے حضورؐ کی

خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ، آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپؐ نے ابوہریرہ کو اپنی جوتیاں دے کر بھیجا تھا کہ وہ اس شخص کو جو لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پر دل سے یقین رکھتا ہو اسے جنت کی خوش خبری دیدیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، ایسا نہ کیجیے کیوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں گے، آپ انھیں عمل کرنے دیں۔ آپ نے فرمایا: ”اچھا، انھیں عمل کرنے دو۔“

اس روایت سے معلوم ہوا کہ قائد کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے سامنے اپنے اختلاف کو مدلل شکل میں رکھا جاسکتا ہے۔ قائد کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے۔ ممکن ہے مسئلہ کے بعض پہلو اس کی نگاہ سے اوجھل رہے ہوں اس طرح اگر قائد ضرورت محسوس کرے گا تو اپنے فیصلہ یا حکم میں تبدیلی کرسکتا ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے مشورہ پر آپؐ نے اپنے حکم کو واپس لے لیا کہ کہیں واقعی لوگ بشارت پا کر کلمہ طیبہ پر یقین اور ایمان ہی کو اپنے لیے کافی نہ سمجھ لیں اور زندگی میں عمل کی جو اہمیت ہے وہ ان کی نظر میں باقی نہ رہے۔

حق تنسیخ

(۱) عَنْ اَبِی الْعَلَاءِ بْنِ الشِّخِّیرِ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَنْسَخُ حَدِیْثُہٗ بَعْضُہٗ بَعْضًا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوالعلا بن شخیر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک حدیث کو دوسری حدیث سے منسوخ کردیتے تھے۔

تشریح: شرعی احکام میں ارتقا پایا جاتا ہے۔ بعض احکام میں تبدیلیوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بعض شرعی احکام میں ارتقاء کا اصول بھی کارفرما رہا ہے۔ مثلاً ابتدا میں نماز کی حالت میں اس کی رخصت تھی کہ نمازی لوگوں کے سلام کا جواب دے دیا کرتے تھے۔ پھر اس سے روک دیا گیا کہ نماز ایک اعلیٰ قسم کی مصروفیت ہے۔ اس میں بندہ خدا کی جناب میں حاضر ہوتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس لیے نماز میں خدا کے سوا کسی دوسرے سے گفتگو روا نہیں ہے۔

بہت سی ایسی احادیث ہیں، سند کے لحاظ سے جن کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں کیا

جاسکتا۔ لیکن پھر نبی ﷺ نے اگر اسے اپنے قول یا عمل سے منسوخ کردیا ہو تو پھر اس کے ذریعہ سے کسی مسئلہ میں احتجاج کرنا درست نہ ہوگا۔ دین میں جن کو تفقہ حاصل ہے انھوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اسلامی شریعت کے پچھلی شریعتوں کے ناسخ ہونے کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اسلامی شریعت پچھلی شریعتوں کی ارتقائی شکل ہے۔ ان کی مخالفت نہیں ہے۔

ناسخ ومنسوخ احادیث کے متعلق ائمہ نے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے۔ صحابہ کرامؓ بھی ناسخ ومنسوخ احادیث کی طرف سے غافل نہ تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے نزدیک ناسخ ومنسوخ احادیث سے بے خبری ہلاکت کے مترادف ہے۔ نسخ کے سلسلہ میں جو علمی بحثیں کی گئی ہیں ان کو دیکھنے سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے متقدمین کا فکر کس درجہ سائنٹفک رہا ہے۔ انھوں نے نسخ کے مسائل پر ہر پہلو سے گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں امام حافظ ابو بکر محمد بن موسیٰ الحازمی الصمدانی (متوفی ۵۸۴ھ) کی کتاب الاعتبار فی الناسخ والمنسوخ من الآثار کا مطالعہ مفید رہے گا۔

اچھی چیزوں کا باقی رکھنا

〈۱〉 عَنْ اَبِیْ سَلْمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ وَ سُلَیْمٰنَ بْنِ یَسَارٍ عَنْ رَّجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَقَرَّ الْقَسَامَةَ عَلٰی مَاکَانَتْ عَلَیْهِ فِی الْجَاهِلِیَّةِ وَ قَضٰی بِهَا بَیْنَ نَاسٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ فِیْ قَتِیْلٍ اِدَّعَوْهُ عَلٰی یَهُوْدِ خَیْبَرَ.
(مسلم، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن اور سلیمان بن یسار سے روایت کرتے ہیں اور وہ نبی ﷺ کے ایک صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قسامت کو اسی طرح باقی رکھا جیسے وہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھی۔ اسی کے تحت انصار کے کچھ لوگوں کے درمیان ایک مقتول کے سلسلہ میں فیصلہ فرمایا، جس کے قتل کا انھوں نے یہود خیبر پر دعویٰ کیا تھا۔

تشریح: قسامت کا طریقہ ایام جاہلیت میں رائج رہا ہے۔ اسلام نے اسے مفید سمجھتے ہوئے ختم نہیں کیا بلکہ اسے باقی رکھا یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اگر کوئی چیز مفید اور لوگوں کے لیے کارآمد ہو اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو تو اسلام اُسے ختم کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ لوگوں کی بھلائی

کے پیش نظر وہ اسے باقی رکھے گا۔ اس کی ایک واضح مثال قسامت ہے۔ قسامت کے علاوہ اور بھی بعض دوسری چیزوں کو اسلام نے باقی رکھا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کے لیے کوئی شخص کوئی مفید اور بھلائی کی چیز ایجاد کرتا ہے۔ تو اگر اس میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو شرعاً حرام ہے تو اسے اختیار کرنے اور اس سے مستفید ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسے اختیار کرنے میں اسلام ہرگز کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔

اس حدیث میں قسامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ قسامت، قسم یا سوگند کھانے کے معنی میں آتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں قسامت سے مراد یہ ہے کہ کسی آبادی یا محلّہ یا اس سے قریب کسی کا قتل ہو جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ قاتل کون ہے؟ اگر قاتل کا سراغ نہ لگ سکے تو اس آبادی یا محلّہ کے باشندوں سے جہاں قتل ہوا ہے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک یہ قسم کھائے گا کہ بہ خدا میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ اور نہ قاتل کے بارے میں مجھے کوئی علم ہے۔ قسم نہ کھانے کی صورت میں ان پر دیت لازم ہوگی۔ ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے۔ اس کی بنیاد یہ مشہور حدیث ہے: اَلْبَیِّنَۃُ عَلَی الْمُدَّعِیِّ وَالْیَمِیْنُ عَلٰی مَنْ اَنْکَرَ (گواہ مدعی کے ذمہ اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے)۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جس آبادی یا محلّہ یا جس آبادی یا محلّہ کے قریب لاش پائی گئی ہو اگر اس کے باشندوں اور مقتول کے درمیان دشمنی رہی ہو یا ایسی کوئی علامت پائی جائے جس سے یہ ظن غالب ہو کہ اسے اس آبادی یا محلّہ کے لوگوں نے قتل کیا ہے تو مقتول کے وارثوں سے قسم لی جائے گی کہ اسے اس آبادی یا محلّہ کے لوگوں نے قتل کیا ہے۔ اگر مقتول کے ورثاء قسم کھانے سے انکار کریں تو پھر ان لوگوں سے قسم لی جائے گی جن پر قتل کرنے کا شبہ ہے۔ قسامت میں دِیت واجب ہوتی ہے، قصاص واجب نہیں ہوتا۔ لیکن امام مالکؒ کے نزدیک اگر دعویٰ قتلِ عمد کا ہو تو حکم قصاص نافذ کرنا چاہیے۔

سزائیں

شرعی سزاؤں کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ سزائیں جن کو اللہ نے متعین فرمایا ہے لیکن ان کا اجراء بندوں پر چھوڑ دیا ہے۔ شریعت نے اسے کفارہ کا نام دیا ہے۔ مثلاً قسم کی خلاف ورزی، بلا عذر رمضان میں روزہ چھوڑ دینا۔

(۲) دوسری قسم کی سزائیں وہ ہیں جو کتاب اور سنت رسولؐ سے ثابت اور متعین ہیں اور انھیں جاری کرنے کا اختیار حکومت کو دیا گیا ہے۔ اس طرح کی سزا کو ''حد'' کہتے ہیں۔ جیسے چوری اور زنا کی سزائیں۔

(۳) تیسری قسم کی سزائیں وہ ہیں جو کتاب وسنت میں متعین نہیں لیکن انھیں جرائم قرار دیا ہے جن کی یہ سزائیں ہیں۔ اس قسم کی سزاؤں کے تعین کے مسئلہ کو حکومت کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ موقع و محل، حالات اور ضرورت کے پیش نظر خود سزا متعین کرے۔ اس قسم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔

'حد' میں تصرف کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ البتہ تعزیر میں حاکم وقت موقع و محل کو دیکھتے ہوئے سزا میں تخفیف یا اضافہ یا تبدیلی کر سکتا ہے۔ بلکہ مصلحت کا تقاضا ہو تو وہ قابلِ تعزیر مجرم کو معاف بھی کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ قصاص کا بھی ہے۔ قصاص کا مفہوم ہے سزا میں قاتل کی جان لینا۔ یعنی کسی نے اگر کسی شخص کو ناحق قتل کیا ہے تو اسے مقتول کے بدلے میں قتل کرنا۔ قَصَّ،

قصص کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے جانا۔ چوں کہ مقتول کا ولی قاتل کا پیچھا کرتا ہے تاکہ اسے مقتول کے بدلہ میں قتل کرائے۔ اس لیے قاتل کی جان لینے کو قصاص کہتے ہیں۔ قصاصات کے معنی مساوات یعنی برابری کے بھی ہوتے ہیں۔ قصاص میں چوں کہ قاتل کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتے ہیں جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا تھا، اس لیے اس میں مساوات کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

قصاص خدا کی طرف سے متعین سزا ہے لیکن مقتول کے ورثہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اسے معاف کر دیں۔ اس لیے قصاص کا شمار ''حد'' میں نہیں کیا جاتا۔ کچھ فقہاء اسے حد اور تعزیر دونوں نام دیتے ہیں۔

﴿۱﴾ عَنْ اَبِیْ صِرْمَةَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ: مَنْ ضَارَّ ضَرَّ اللّٰهُ بِهٖ وَمَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوصرمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی کو ضرر پہنچائے گا تو اللہ اسے ضرر پہنچائے گا اور جو کسی سے دشمنی کرے گا تو اللہ بھی اس سے دشمنی کرے گا۔''

تشریح: شریعت میں مجرم کو سزا دینے کا قانون بھی ہے۔ اور یہ قانون اس لیے ہے کہ شریعت کی نگاہ میں کوئی بھی مجرمانہ حرکت مثلاً کسی کو نقصان اور کسی قسم کا ضرر پہنچانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو ضرر پہنچاتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اسے اس کی اس مجرمانہ حرکت کی سزا مل کر رہے گی۔ خدا بلاوجہ یوں ہی کسی کو سزا نہیں دیتا۔ اگر کوئی شخص کسی سے ناحق دشمنی رکھتا ہے تو وہ راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔ اس کی یہ دشمنی اور عداوت ضابطۂ حیات اور قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے جس کے تحت خود اس کو یہ وجود و زندگی حاصل ہے۔ اس کی یہ دشمنی درحقیقت شخص خاص سے دشمنی نہیں بلکہ اس کے خالق سے دشمنی ہے۔ ایسے شخص کی حیثیت خدا کی نگاہ میں دشمنِ حق کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

﴿۲﴾ وَعَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ مَااسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ كَانَ لَهٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهٗ فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ یَّخْطِئَ فِی الْعَفْوِ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یَّخْطِئَ فِی الْعُقُوْبَةِ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ''جہاں تک تم سے ممکن ہو

مسلمانوں سے شرعی حدود کے نفاذ کو ٹالتے رہو۔ اگر کچھ بھی گنجائش نظر آئے تو ملزم کا راستہ چھوڑ دو، کیوں کہ امیر کا ملزم کو چھوڑ دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔"

تشریح: اس حدیث میں حاکم کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ اس کے پاس اگر کوئی قضیہ آئے تو وہ ملزم کو سزا دینے میں جلدی نہ کرے۔ جہاں تک ممکن ہو وہ مسلمان کو حد سے بچانے کی کوشش کرے۔ معاملہ میں اگر کوئی شبہ کا موقع نکلتا ہو تو اس کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیے۔ کیوں کہ حاکم کے غلط فیصلہ سے اگر ملزم بری ہو جاتا ہے اور اسے سزا نہیں ملتی تو یہ غلطی اس غلطی سے بہتر ہے کہ حاکم اپنے غلط فیصلے سے کسی بے قصور کو سزا دیدے۔ اس لیے اگر ثبوت میں ذرا بھی شبہ رہ جائے تو ملزم کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو بلا مقدمہ چلائے نظر بند رکھنا اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا عدل کے منافی ہے۔ اسلامی شریعت کی اصل دلچسپی کسی کو سزا دینے میں نہیں ہے۔ سزا کا فیصلہ تو بس اس وقت کیا جائے جب کہ ملزم کو سزا سے بچانے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: تَعَافُوا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِىْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ. (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو العاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم آپس میں حدود کو معاف کر دیا کرو، اگر واقعہ مجھ تک پہنچ جائے گا تو حد جاری کرنا واجب ہو جائے گا۔"

تشریح: یعنی کسی سے کوئی گناہ یا جرم سرزد ہو جاتا ہے تو بہتر یہی ہے اور شریعت کی نگاہ میں یہی پسندیدہ بات ہے کہ اس سے درگزر کیا جائے۔ یہ قضیہ حاکم کے پاس نہ لے جایا جائے۔ لیکن قضیہ اگر حاکم کے پاس پہنچ جاتا ہے تو حاکم کے لیے یہ جائز نہ ہوگا کہ اسے معاف کر دے۔ کیوں کہ وہ احکام شریعت کے نفاذ کرنے پر مامور ہے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِقَامَةُ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ

مِّنْ مَّطَرِ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً فِیْ بِلَادِ اللّٰهِ. (ابن ماجہ، ونسائی عن ابی ہریرہؓ)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حدود اللہ میں سے کسی حد کا جاری کرنا خدا کے سرزمینوں میں چالیس رات تک بارش برسنے سے بہتر ہے۔''

تشریح: حد کو جاری کرنے اور سزاؤں کو نافذ کرنے سے گناہ اور معاصی کا ارتکاب آسان نہیں رہتا۔ پھر نہ لوگ آسانی سے چوری کر سکتے ہیں اور نہ کسی کی جان لینا ان کے لیے آسان رہتا ہے۔ زنا اور فواحش کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے زمین ہر قسم کے فتنہ وفساد سے پاک ہو جاتی ہے۔ پھر لوگوں کے حقوق کے ادا کرنے کی راہ ہموار ہوتی جاتی ہے۔ یہ امن و سکون اور اطمینان پانی کی بارش کی برکتوں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جب زمین میں لوگ بگاڑ نہیں پھیلاتے اور حاکم حدود کو جاری کرنے میں غفلت سے کام نہیں لیتا اور معاشرہ میں گناہ اور معاصی میں مبتلا ہونے کے مواقع کم سے کم میسر آتے ہیں تو مخلوق خدا امن اور اطمینان کی فضا میں حلال رزق کی تلاش میں کوشاں ہوتی ہے اور خدا کی مدد اسے حاصل ہوتی ہے۔ جب لوگ خدا کی اطاعت کی طرف راغب ہوتے ہیں اور اس کی خوشنودی اور اس کی رضا کو دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں تو آسمان سے برکتوں کا نزول شروع ہوتا ہے۔ خدا اپنی مخلوق کو قحط اور مختلف وباؤں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

〈۵〉 وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: مَا رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رُفِعَ اِلَیْهِ شَیْءٌ فِیْهِ قِصَاصٌ اِلَّا اَمَرَ فِیْهِ بِالْعَفْوِ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب بھی کوئی مقدمہ آپؐ کے پاس ایسا آتا جس میں قصاص لازم ہوتا تو آپؐ عفو سے کام لینے کی ترغیب دیتے۔

تشریح: یعنی آپؐ کی کوشش ہوتی کہ لوگ عفو ودرگزر سے کام لیں اور ایک دوسرے کو معاف کر دیں تاکہ قصاص کی نوبت نہ آئے۔

〈۶〉 وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ عَلَی الْمُقْتَتِلِیْنَ اَنْ یَنْحَجِزُوْا الْاَوَّلَ فَالْاَوَّلَ وَ اِنْ كَانَتِ امْرَأَةٌ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑنے والوں پر لازم ہے کہ باز رہیں۔ پہلے جو زیادہ قریب ہے وہ معاف کرے پھر جو اس کے بعد ہے اگرچہ وہ عورت ہو۔''

تشریح: یعنی جہاں تک ممکن ہو درگزر کا رویہ اختیار کریں تاکہ دشمنی اور عداوت کی آگ نہ بھڑکنے پائے۔ حتی الامکان قصاص نہ لیں'' حدیث میں لفظ یَنْحَجِزُوْا آیا ہے۔ امام ابوداؤد کے نزدیک اس کے معنی ہیں'' قصاص سے رک جائیں۔''

عورت کو بھی اگر وہ مقتول کی وارث ہے یہ حق حاصل ہے کہ وہ قصاص معاف کردے۔

﴿۷﴾ وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَؓ بْنِ نِیَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ کَانَ یَقُوْلُ لاَ یُجْلَدُ فَوْقَ عَشْرِ جَلْدَاتٍ اِلاَّ فِیْ حَدٍّ مِنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ تَعَالٰی. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو بردہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ''دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارا جائے سوائے ان حدوں کے جو اللہ نے مقرر فرمائی ہیں۔''

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ بہ طور تعزیر کسی کو دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارا جائے۔ لیکن علماء نے اس حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اس میں اقوال مختلف ہیں کہ بہ طور تعزیر کتنے کوڑوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ۳۹ کوڑوں سے زیادہ نہ مارا جائے۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ۷۵ کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کم سے کم تین کوڑے مارے جائیں۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ تعزیر میں کوڑوں کی تعداد حد میں مارے جانے والے کوڑوں کی تعداد تک نہ پہنچنے پائے۔ لیکن سختی اور شدت اس سے بڑھ کر ہوسکتی ہے۔

﴿۸﴾ وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّ یَهُوْدِیًّا قَتَلَ جَارِیَةً عَلٰی اَوْضَاحٍ لَّهَا فَقَتَلَهَا بِحَجَرٍ قَالَ فَجِیْءَ بِهَا اِلَی النَّبِیِّ ﷺ وَ بِهَا رَمَقٌ فَقَالَ لَهَا اَقَتَلَکِ فُلاَنٌ فَاَشَارَتْ بِرَأْسِهَا اَنْ لاَ ثُمَّ قَالَ لَهَا الثَّانِیَةُ فَاَشَارَتْ بِرَأْسِهَا اَنْ لاَّ ثُمَّ سَأَلَهَا الثَّالِثَةَ فَقَالَتْ نَعَمْ وَ اَشَارَتْ بِرَأْسِهَا فَقَتَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَیْنَ حَجَرَیْنِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے چند چاندی کے ٹکڑوں

کے لیے ایک لڑکی کو مارا، اس نے اسے پتھر سے مارا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لائی گئی۔ ابھی اس میں کچھ جان باقی تھی۔ آپؐ نے پوچھا تجھے فلاں نے قتل کیا ہے؟ اس نے سر سے اشارہ کیا کہ نہیں۔ پھر دوبارہ فرمایا کہ تجھے فلاں نے مارا ہے؟ اس نے سر سے اشارہ کیا کہ نہیں۔ آپؐ نے تیسری بار پوچھا تو اس نے کہا کہ ہاں۔ اور اپنے سر سے اشارہ کیا۔ آپؐ نے اس یہودی کو بلوایا۔ (اس نے اقرار کیا) تب آپؐ نے اسے دو پتھروں سے کچل کر قتل کرا دیا۔

تشریح: شریعت میں قتل کی سزا قتل ہے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر دیتی ہے تو مقتول مرد کے بدلے میں اس عورت کو قتل کریں گے۔ اسی طرح مقتول اگر عورت ہے اور اس کا قاتل مرد ہے تو اس مرد قاتل کو قتل کیا جائے گا۔

﴿۹﴾ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ قَالَ: قَاتَلَ يَعْلَى بْنُ مُنْيَةَ اَوْ اِبْنُ اُمَيَّةَ رَجُلاً فَعَضَّ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهٗ فَانْتَزَعَ يَدَهٗ مِنْ فَمِهٖ فَنَزَعَ ثَنِيَّتَهٗ وَقَالَ ابْنُ مَثْنَيٍّ ثَنِيَّتَيْهِ فَاخْتَصَمَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اَيَعَضُّ اَحَدُكُمْ كَمَا يَعَضُّ الْفَحْلُ لَا دِيَةَ لَهٗ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ یعلی بن منیہ یا یعلی بن امیہ ایک شخص سے لڑ پڑے۔ پھر ایک نے دوسرے کے ہاتھ کو دانت سے دبایا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو اس کے منہ سے اس کے دانت نکل آئے۔ پھر دونوں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم میں سے ایک اس طرح کاٹتا ہے جیسے اونٹ کاٹتا ہے۔ دیت نہیں ملے گی۔''

تشریح: یعنی جس کے دانت نکل گئے تھے وہ دیت کا طالب ہوا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے دیت نہیں دلائی کیوں کہ دوسرے شخص نے اپنے ہاتھ کو اس سے بچانے کے لیے کھینچا تھا۔ اب اگر جھٹکے میں دوسرے کا دانت باہر ٹوٹ کر نکل آیا تو اس میں ہاتھ کھینچنے والے کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔ حفاظت خود اختیاری کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ اب اگر اس حق کے حصول میں دوسرے کا کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو اس نقصان کا تاوان لازم نہیں آتا۔

﴿۱۰﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ امْرَأَتَيْنِ مِنْ هُذَيْلٍ رَمَتْ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى فَطَرَحَتْ جَنِيْنَهَا فَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْهَا بِغُرَّةٍ عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہذیل کی دو عورتوں میں سے ایک نے دوسرے کو پتھر پھینک کر مارا جس سے اس کے پیٹ کا بچہ گر گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام یا لونڈی تاوان دینے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

تشریح: یہ قتل عمد کی قسم سے نہ تھا بلکہ شبہ عمد کی قسم سے تھا۔ اس لیے اسے دیت کا موجب قرار دیا گیا۔ قصاص کا موجب قرار نہیں دیا۔

﴿۱۱﴾ وَعَنْ عَلِيٍّؓ اَنَّ يَهُوْدِيَّةً كَانَتْ تَشْتِمُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَتَقَعُ فِيْهِ فَخَنَقَهَا رَجُلٌ حَتّٰى مَاتَتْ فَاَبْطَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم دَمَهَا. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہتی اور آپؐ کی ہجو کرتی تھی۔ اس پر ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹا یہاں تک کہ وہ مرگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون کو لغو قرار دیا۔

تشریح: یعنی اس کا بدلہ بہ معنی قصاص یا دیت لینے کا حکم نہیں فرمایا۔

﴿۱۲﴾ وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَضٰى اَنَّ مَنْ قَتَلَ خَطَأً فَدِيَتُهٗ مِائَةٌ مِّنَ الْاِبِلِ ثَلٰثُوْنَ بِنْتُ مَخَاضٍ وَ ثَلٰثُوْنَ بِنْتُ لَبُوْنٍ وَ ثَلَاثُوْنَ حِقَّةً وَ عَشَرَةُ بَنِىْ لَبُوْنٍ ذَكَرٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور اس نے دادا سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خطا کی دیت میں فیصلہ فرمایا سو اونٹ پر تیس اونٹنی ایک سال عمر کی اور تیس اونٹیاں دو برس کی عمر والی اور تین اونٹنیاں تین برس کی جو چوتھے برس میں لگی ہوں اور دس اونٹ نر دو دو برس کے جو تیسرے میں لگے ہوں۔

تشریح: قتل کے سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ ارتکاب قتل میں یا تو عمد کا دخل ہوگا یا شبہ عمد کا یا محض خطا کا۔ قتل عمد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو جان بوجھ کر قتل کے ارادے سے کسی شخص کو لوہے کے ہتھیار، لاٹھی یا پتھر سے مارے یا اسے اوپر سے پھینک دے، غرق آب کردے، آگ میں جلائے۔ زہر دیدے یا اس کا گلا گھونٹ دے۔ اور وہ مرجائے یا اس کے اعضاء تلف کردے یا اس کے جسم کے کسی حصے پر زخم لگائے۔ اس میں قصاص لازم ہے۔ قرآن میں ہے: وَ کَتَبْنَا عَلَيْهِمْ

فِيهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدۃ:۴۵) ''اور ہم نے اس میں ان کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان جان کے برابر ہے، آنکھ آنکھ کے برابر ہے، ناک ناک کے برابر، کان کان کے برابر ہے، دانت دانت کے برابر، اور سب زخموں کا اسی طرح برابر کا بدلہ ہے۔''

قتل شبہ عمد کا مفہوم یہ ہے کہ مجرم نے کسی کو صرف سزا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ قتل کرنا یا زخم پہنچانا اس کا مقصود نہ تھا لیکن اتفاق سے وہ مر گیا۔ اس میں قصاص نہیں دیت ہے۔

قتل خطاء میں ارادہ اور قصد شامل نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص تیر اندازی یا شکار کر رہا ہے غلطی سے یا نشانہ کے خطا کر جانے کی وجہ سے کسی کا قتل ہو جائے یا کوئی زخمی ہو جائے۔ اس میں دیت خفیف ہے جب کہ شبہ عمد میں دیت مغلظہ یعنی بھاری دیت ہے۔

ابو داؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں دیت (کے اونٹوں) کی قیمت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی۔ اور اہل الکتاب (یعنی ذمی یا معاہد) کی دیت مسلمانوں سے نصف تھی۔ اسی پر عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں فرمایا کہ مقرر اونٹوں کی قیمت زیادہ ہوگئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے دیت ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم مقرر کر دی لیکن بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضور ﷺ نے قتل کی دیت ۱۲ ہزار درہم بتائی ہے۔ (نسائی، ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

﴿۱۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قَتَلَ مُتَعَمِّدًا دُفِعَ اِلٰى اَوْلِيَاءِ الْمَقْتُوْلِ فَاِنْ شَاءُوْا قَتَلُوْا وَ اِنْ شَاءُوْا اَخَذُوا الدِّيَةَ وَهِيَ ثَلٰثُوْنَ حِقَّةً وَ ثَلٰثُوْنَ جِذْعَةً وَ اَرْبَعُوْنَ خَلِفَةً وَمَا صَالَحُوْا عَلَيْهِ فَهُوَ لَهُمْ. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جو شخص کسی کو قصداً قتل کر دے تو اسے مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اب خواہ وہ چاہیں تو اس کو قتل کر دیں یا چاہیں تو خوں بہا لے لیں۔ اور قتل کا خوں بہا سو اونٹنیاں ہیں جن میں تیس اونٹنیاں وہ ہوں گی جو چوتھے سال میں داخل ہوں اور تیس وہ جو پانچویں سال

میں داخل ہوں اور چالیس اونٹنیاں حاملہ ہوں اور اس کے علاوہ جس چیز پر صلح ہو جائے وہ اس کے حق دار ہوں گے۔“

تشریح: قصاص کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ قاتل عاقل و بالغ ہو۔ اگر وہ نابالغ ہے یا مجنوں ہے تو چوں کہ وہ مکلّف نہیں ہے اس لیے قصاص لازم نہ ہوگا۔ کیوں کہ حضور ﷺ نے نابالغ، مجنوں اور سوئے ہوئے شخص کو مرفوع القلم قرار دیا ہے۔ (ابن ماجہ)

قصاص کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ قاتل اور مقتول دین، حریت یا غلامی میں مساوی ہوں۔ کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کریں گے اور نہ غلام کے بدلہ میں آزاد قتل کیا جائے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ (احمد، ترمذی وھو حسن) ”کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔“ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی مسلمان کو حربی کافر کے قصاص میں تو قتل نہیں کریں گے لیکن ذمی کے قصاص میں قتل کریں گے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کافر حربی ہو یا ذمی اس کے قصاص میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ مقتول اگر غلام ہے تو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ آزاد کو غلام کے بدلے میں قتل نہیں کریں گے۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے: لَا يُقْتَلُ حُرٌّ بِعَبْدٍ (بیہقی، سندہٗ حسن) ”غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل نہ کیا جائے۔“

قصاص کے لیے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ قاتل مقتول کا والد یا ماں یا دادا دادی نہ ہو۔ کیوں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: لَا يُقْتَلُ وَالِدٌ بِوَلَدِهٖ (احمد، ترمذی) ”والد کو اس کی اولاد کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے۔“

اگر مقتول کے ورثا خوں بہا (دیت) لینے پر راضی ہو جاتے ہیں تو قاتل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر خون کے مستحقین اس پر متفق ہیں کہ قصاص لیا جائے۔ لیکن ان میں سے ایک نے قاتل کو معاف کر دیا تو قصاص نہیں لیں گے۔

جس کسی نے کسی کو عمداً قتل کیا ہے تو دیت اس کے مال میں سے دلائیں گے۔ اور اگر قتل ”شبہ عمد“ ہے یا ”قتل خطا“ تو دیت عاقلہ پر ہے۔ ”قتل خطا“ پر نبی ﷺ نے قتل کرنے والی کی عاقلہ پر دیت کا فیصلہ فرمایا ہے۔ عاقلہ اس جماعت کو کہیں گے جس کے افراد اس کی طرف سے دیت ادا کریں گے۔ اس میں اس کے باپ دادا، بھائی، بھتیجے اور چچا اور چچا زاد بھائی شامل ہیں۔ ہر ایک

اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرے گا۔ تین سال کی مدت میں دیت کی قسطیں ادا کرنی ہوں گی۔ ہر سال دیت کا ایک تہائی ادا کریں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک ہی بار میں پوری دیت ادا کردی جائے۔

﴿۱۴﴾ وَعَنْ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَکَافَأُ دِمَاءُ هُمْ وَ يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ وَ يَرُدُّ عَلَيْهِمْ اَقْصَاهُمْ وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ اَلاَ لاَيُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ وَلاَ ذُوْ عَهْدٍ فِىْ عَهْدِهٖ. (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت علیؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ’’قصاص اور دیت میں سب مسلمان برابر ہیں۔ اور ایک ادنیٰ مسلمان بھی امان دے سکتا ہے۔ اور دور والا مسلم بھی حق رکھتا ہے۔ اور تمام مسلمان اپنے غیر کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔ خبردار، کسی کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔ اور نہ معاہد کو جب تک کہ وہ عہد وضمان میں ہے۔‘‘

تشریح: ’’سب مسلمان برابر ہیں‘‘ مطلب یہ ہے کہ قصاص اور خوں بہا لینے دینے میں سب مسلمان مساوی ہیں۔ اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ، عالم اور غیر عالم، امیر اور مفلس یا مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کیا جائے گا کہ بڑے مرتبہ والے شخص کو چھوٹے درجہ کے شخص کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔ اور نہ کم حیثیت کے شخص کے خوں بہا کی مقدار اس لیے کم کی جائے گی کہ وہ بڑی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔

مسلمانوں میں سے کوئی فرد خواہ وہ غلام ہو یا وہ عورت ہی کیوں نہ ہو اگر وہ کسی کافر کو امان دیدے تو سارے ہی مسلمان اس کا پاس ولحاظ رکھیں گے۔

﴿۱۵﴾ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ قُتِلَ فِىْ عِمِّيَّةٍ فِىْ رَمْيٍ يَكُوْنُ بَيْنَهُمْ بِالْحِجَارَةِ اَوْ جَلْدٍ بِالسِّيَاطِ اَوْ ضَرْبٍ بِعَصًا فَهُوَ خَطَاءٌ وَ عَقْلُهٗ عَقْلُ الْخَطَاءِ وَ مَنْ قَتَلَ عَمْدًا فَهُوَ قَوَدٌ وَمَنْ حَالَ دُوْنَهٗ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ غَضَبُهٗ لاَ يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلاَ عَدْلٌ. (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص لوگوں کے درمیان پتھراؤ یا کوڑوں اور لاٹھیوں کی اندھادھند مار میں مارا جائے (اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے)

تو اس کو قتل خطا میں شمار کریں گے۔ اور اس کا خوں بہا قتل خطا کا خوں بہا ہے۔ اور جو شخص قصداً مارا گیا تو اس کا قتل قصاص کو واجب کرتا ہے۔ اور جو شخص قصاص لینے میں حائل و مزاحم ہو اس پر خدا کی لعنت اور اس کا غضب ہے۔ نہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور نہ فدیہ قبول ہوگا۔"

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اگر دو مخالف گروہ باہم لڑ رہے ہیں اور دونوں ہی طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے۔ ایک شخص ایسی جگہ گھر جاتا ہے اور اچانک اسے پتھر لگتا ہے اور اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو یہ قتل خطا میں شمار ہوگا۔ اس میں قصاص کے بجائے دیت واجب ہوگی۔ اور دیت بھی وہ جو قتل خطا میں واجب ہوتی ہے۔

〈۱۶〉 وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْاَصَابِعُ سَوَاءٌ وَالْاَسْنَانُ سَوَاءٌ اَلثَّنِيَّةُ وَالضِّرْسُ سَوَاءٌ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ سَوَاءٌ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "(دیت کے لحاظ سے) تمام انگلیاں برابر ہیں۔ اور دانت دانت برابر ہیں اور آگے کے دانت اور داڑھیں برابر ہیں۔ نیز (انگوٹھے اور چھنگلیاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) یہ اور یہ برابر ہیں۔"

تشریح: قتل کی دیت ایک سو اونٹ یا ایک ہزار مثقال سونا یا بارہ ہزار درہم چاندی ہوگی یا دو سو گائے یا دو ہزار بھیڑ بکریاں۔ اور اگر قتل "شبہ عمد" ہے تو دیت مغلظہ ہوگی۔ یعنی سو اونٹ جن میں چالیس حاملہ اونٹنیاں بھی ہوں گی۔ "قتل خطا" ہے تو اس کی دیت مغلظہ نہیں بلکہ دیت نسخ ہے یعنی ایک سو اونٹ ان میں سے چالیس پانچ سے نویں سال تک کی حاملہ اونٹنیاں شامل ہوں گی۔

اس حدیث میں اعضاء کی دیت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناک اگر پوری کٹ گئی ہو تو دیت پوری دینی ہوگی اسی طرح زبان اور ہونٹوں، خصیتین اور آلہ تناسل میں پوری دیت ہے۔ پیٹھ اور دونوں آنکھوں میں بھی دیت پوری ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ، ایک پاؤں، ایک ہونٹ اور ایک خصیہ میں دیت نصف ہے۔ ایک انگلی کے کٹنے میں دس اونٹ دیت ہے۔ ترمذی میں ہے: دِيَةُ اَصَابِعِ الْيَدَيْنِ اَوِ الرِّجْلَيْنِ سَوَاءٌ عَشْرٌ مِّنَ الْاِبِلِ لِكُلِّ اِصْبَعٍ (ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے۔ ہر انگلی کے لیے دس اونٹ)۔ ہر دانت کی دیت پانچ اونٹ ہیں وَفِي السِّنِّ خُمُسٌ مِّنَ الْاِبِلِ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی،

اسنادہٗ حسن)۔ ہڈی ظاہر ہو جانے والے زخموں کی دیت پانچ اونٹ ہیں (ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔ ہڈی توڑنے والے زخم میں نبی ﷺ نے دیت دس اونٹ واجب کیے ہیں۔ دیگر تفصیلات کے لیے احادیث اور فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

〈۱۷〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ”جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔“

〈۱۸〉 وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَ مَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَهْلِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ. (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے، جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے، جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔“

تشریح: معلوم ہوا کہ دین و ایمان ہی کی حفاظت کے لیے لڑنا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر اپنی جان یا اپنے مال یا اہل وعیال کو خطرہ درپیش ہو تو اور اس سلسلے میں بھی دشمن سے مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ اس مقابلے میں اگر کوئی شخص مارا جاتا ہے تو خدا کے یہاں اس کا شمار شہیدوں میں ہوگا۔

〈۱۹〉 وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ النَّارَ لَا يُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کسی کو آگ کا عذاب دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے۔“

تشریح: یعنی سزا کے طور پر کسی کو آگ میں جلانا جائز نہیں ہے۔ آگ کا عذاب دینے کا حق صرف خدا کو پہنچتا ہے۔ وہی اہلِ کفر اور اپنے باغی اور سرکش بندوں کو جہنم میں آگ کا عذاب دے گا۔

﴿۲۰﴾ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَحُثُّنَا عَلَى الصَّدَقَةِ وَ يَنْهَانَا عَنِ الْمُثْلَةِ. (ابوداؤد، نسائی)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صدقہ (دینے) کی ہمیں ترغیب دیتے تھے اور مثلہ سے ہمیں روکتے تھے۔

تشریح: یعنی صدقہ کی ترغیب کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ اس سے روکتے تھے کہ دشمن کا مثلہ کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ مارے گئے دشمن کی ناک یا کان وغیرہ اعضا کاٹ کر اس کا چہرہ بگاڑنا جائز نہیں ہے۔ یہ ایک انسانیت سوز اور ناز یبا حرکت ہے جو کسی مہذب قوم کو زیب نہیں دیتی۔

﴿۲۱﴾ وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَيُّمَا رَجُلٌ خَرَجَ يُفَرِّقُ بَيْنَ اُمَّتِيْ فَاضْرِبُوْا عُنُقَهُ. (نسائی)

ترجمہ: حضرت اُسامہ بن شریکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص امام وقت کے خلاف خروج کرے تاکہ اس طرح وہ میری امت میں تفرقہ ڈالے تو اس کی گردن اڑادو۔''

تشریح: امام یا امیر وقت حقیقت میں امت کے اتحاد اور اجتماعیت کا بنیادی محور ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے خلاف خروج کرنا امت میں تفرقہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ امام اور امیر اگر اسلامی تعلیمات کے تقاضے پورے کرتا ہے اور سارے مسلمان اس کی سربراہی اور قیادت میں متحد رہتے ہیں تو وہ مخالف اور اسلام دشمن طاقتوں کا بہ آسانی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح اسلام کی شان و شوکت ان کے ذریعہ سے قائم رہتی ہے۔ اب اگر کوئی ناحق خروج اختیار کرتا ہے تو حقیقت میں وہ سب سے پہلے امت کے اتحاد و اتفاق کو نقصان پہنچاتا اور امن وسلامتی کے بجائے فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی باغیانہ اور سرکشی کی راہ اختیار کرتا ہے اور کوشش کے باوجود وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتا اور اس کو راہ پر لانے کی ساری ہی کوشش رائگاں جاتی ہیں تو پھر اس کی گردن ماردی جائے گی۔ اس لیے کہ اس کا وجود اب شرِ محض ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے زندہ رہنے کے لیے جواز کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

﴿۲۲﴾ وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ اَبَا الْقَاسِمِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ قَذَفَ مَمْلُوْكَهُ

وَهُوَ بَرِئٌ مِّمَّا قَالَ؛ جُلِدَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ كَمَا قَالَ. (بخاری، مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو القاسم (نبی کریمؐ) ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائے اور وہ اس سے پاک ہو جو بات اس کے بارے میں کہی گئی تو قیامت کے روز اس شخص کو کوڑے لگائے جائیں گے الا یہ کہ وہ غلام ایسا ہی ہو جیسا کہ کہا گیا۔''

تشریح: کسی پر زنا کا الزام دینا قذف کہلاتا ہے۔ کبائر یعنی بڑے گناہوں میں سے ہے کہ کسی کو بغیر ثبوت کے زنا یا بدکاری کا الزام لگایا جائے، قرآن میں ہے: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (النور: ۴) ''جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لائیں، تو انھیں اسّی کوڑے مارو اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ وہی ہیں جو مبتلائے فسق ہیں۔''

اس آیت سے ثابت ہے کہ حد قذف اسّی کوڑے ہیں۔ مسلمانوں کی عزت اور ان کے ناموس کی محافظت ضروری ہے۔ معاشرہ میں بے حیائی کو فروغ حاصل نہ ہو۔ مسلم معاشرہ ہر قسم کے فواحش سے پاک ہو۔ اس لیے زنا کے الزام کو نہایت سخت بات قرار دی گئی تا کہ کوئی قذف کو معمولی بات نہ سمجھے اور بغیر ثبوت اور گواہوں کے ہرگز کسی کو زنا سے متہم نہ کریں۔

قرآن نے زنا کو بے حیائی اور بری روش قرار دیا ہے۔ اور زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو دُرّے مارنے کا حکم دیا ہے (النور: ۲)۔ اسلامی معاشرہ کی پاکیزگی کی حفاظت اور مسلمانوں کے نفوس وارواح کی طہارت اور ان کی تکریم اسلامی قوانین کے عین مقاصد میں سے ہے۔ اس کے علاوہ نسب کے اختلاط سے بچانے کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ زنا کو ایک سنگین جرم قرار دیا جائے۔

غلام اور لونڈی اگر زنا کے مرتکب ہوتے ہیں تو انھیں بھی کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ لیکن انھیں صرف پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ چناں چہ قرآن میں ہے: فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (النساء: ۲۴)۔ ''جو سزا آزاد عورتوں کے لیے ہے اس کی آدھی ان کے لیے ہوگی''۔ معاشرہ میں آزاد خواتین اور مردوں کو جو خاندانی اور معاشرتی محافظت اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں وہ لونڈی اور غلام کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے خدا نے ان کی سزا

آزاد کے مقابلے میں نصف رکھی ہے۔

﴿۲۳﴾ وَعَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ اسْتُكْرِهَتِ امْرَأَةٌ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فَدَرَأَ عَنْهَا الْحَدَّ وَ اَقَامَهُ عَلَى الَّذِیْ اَصَابَهَا وَلَمْ يَذْكُرْ اَنَّهُ جَعَلَ لَهَا مَهْرًا. (ترمذی)

ترجمہ: حضرت وائلؓ بن حجر سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں ایک عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی (یعنی اس کے ساتھ جبراً زنا کیا گیا) تو آپؐ نے اس عورت کو حد سے برأت دیدی لیکن اس زنا کرنے والے شخص پر حد جاری کی۔ راوی نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ آپ نے اسے مہر بھی دلوایا۔

تشریح: عورت کے ساتھ چوں کہ جبر کیا گیا تھا اس لیے اسے سزا سے بری کر دیا گیا۔ اور زانی پر حد جاری کی گئی۔ مہر کا ذکر نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس صورت میں مہر واجب نہیں۔ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہو اسے مہر ملنی چاہیے۔ اس حدیث میں لفظ ''مہر'' سے مراد ''عُقر'' ہے۔ زنا بالجبر کی صورت میں جو رقم عورت کو دلائی جاتی ہے اسے عقر کہتے ہیں۔ عقر کی مقدار عورت کے مہر مثل کے برابر قرار دیتے ہیں۔

﴿۲۴﴾ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْاَنْصَارِیِّ اَنَّ رَجُلاً مِّنْ اَسْلَمَ اَتَی رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَحَدَّثَهُ اَنَّهُ قَدْ زَنٰی فَشَهِدَ عَلٰی نَفْسِهٖ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ فَاَمَرَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَرُجِمَ وَ كَانَ قَدْ اُحْصِنَ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور اس نے بیان کیا کہ اس نے زنا کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر چار شہادتیں دیں۔ (چار بار اپنے گناہ کا اعتراف کیا) اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ چناں چہ وہ سنگسار کر دیا گیا۔ وہ شخص شادی شدہ تھا۔

﴿۲۵﴾ عَنْ خَالِدٍ عَنِ الشَّيْبَانِیِّ قَالَ: سَأَلْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ اَوْفٰی: هَلْ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: نَعَمْ. قُلْتُ: قَبْلَ سُوْرَةِ النُّوْرِ اَمْ بَعْدُ؟ قَالَ: لَا اَدْرِیْ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت خالد حضرت شیبانی سے روایت کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن اوفیٰ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے رجم کی سزا دی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں۔

میں نے پوچھا کہ سورۂ نور کے نازل ہونے سے پہلے یا اس کے بعد؟ انھوں نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔

تشریح: جمہور کے نزدیک سورۂ نور کی آیت میں کوڑے کی جو سزا بیان ہوئی ہے وہ دراصل غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا ہے۔ یہ سزا بعد احصان یعنی شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کے ارتکاب کی سزا نہیں ہے جو اسلامی قانون کی نگاہ میں سخت ترین جرم ہے۔ سورہ نور کی آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ دراصل اس وعدے کے تحت بیان ہوا ہے جو وعدہ سورۃ النساء کی آیت ۱۵ میں کیا گیا تھا۔ یعنی غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکابِ زنا کی سزا کا تعین۔ رہا یہ سوال کہ شادی شدہ لوگوں کے ارتکابِ زنا کی سزا اسلام میں کیا ہے؟ تو اس کا علم قرآن سے نہیں حدیث سے حاصل ہوتا ہے کہ زنا بعد احصان کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ نبی ﷺ نے خود یہ سزا نافذ کی ہے اور خلفائے راشدین نے بھی اسے قانونی سزا قرار دیا ہے۔

بعض اہل علم کے نزدیک رجم کی سزا کی قانونی بنیاد خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں ہے: اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدۃ: ۳۳) ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، ان کا صلہ بس یہی ہے کہ بری طرح قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انھیں ملک سے نکال دیا جائے۔“

فساد فی الارض کا مطلب ہے امن ونظم کو درہم برہم کرنا۔ اس میں قتل، ڈکیتی، اغوا اور زنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس نوعیت کے سنگین جرائم سے نمٹنے کے لیے حکومت مجرموں کو عبرت ناک اور سبق آموز سزا دینے کی مجاز ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی تقتیل کے مفہوم میں شامل ہے۔

بعض علماء کے نزدیک رجم کی حیثیت حد کی نہیں بلکہ تعزیر کی ہے۔ ان کے نزدیک ہر قسم کے زنا کی حد تو وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ البتہ مملکت اسلامی ارتکابِ زنا پر رجم کی سزا بطور تعزیر دے سکتی ہے۔

〈۲۶〉 وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِیْجٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: لاَ قَطْعَ فِیْ ثَمَرٍ وَلاَ کَثَرٍ

(مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت رافعؓ بن خدیج نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”درخت پر

لگے ہوئے پھلوں اور کھجور کے سفید گابھے کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔“

تشریح: چوری گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن میں ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (المائدۃ:۳۸) ”اور چور مرد اور چور عورت جو بھی ہو ان کی کمائی کے بدلے میں اللہ کی طرف سے ایک عبرت ناک سزا کے طور پر ان دونوں کے ہاتھ کاٹو۔ اللہ غالب، نہایت حکمت والا ہے۔“

حضور ﷺ فرماتے ہیں: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ سَرِقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ یَدَهَا (مسلم) ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“

غیر محفوظ مال اٹھانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ جس مال کی قیمت چوتھائی دینار سے کم ہو اس میں بھی قطع ید نہیں ہے۔ درخت کے پھل اور کھجور کے خرما میں بھی قطع ید نہیں ہے۔ اگر کھانے کے علاوہ کوئی اپنے ساتھ لے جاتا ہے تو پھل کی دوگنی قیمت اس سے وصول کریں گے۔ اور تادیب کے طور پر اسے مارا بھی جائے گا۔ چناں چہ حدیث میں: مَنْ اَخَذَ بِفَمِهٖ وَلَمْ یَتَّخِذْ خُبْنَةً فَلَیْسَ عَلَیْهِ شَیْءٌ وَمَا احْتَمَلَ فَعَلَیْهِ ثَمَنُهٗ مَرَّتَیْنِ وَ ضَرْبَ نَكَالٍ وَمَنْ اَخَذَ مِنْ اَجْرَانِهٖ فَفِیْهِ الْقَطْعُ اِذَا بَلَغَ مَا یُؤْخَذُ مِنْ ذَالِكَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ (احمد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی) ”جو شخص پھل کھالیتا ہے اور اٹھا کر نہیں لے جاتا تو اس پر کچھ نہیں اور جو ساتھ لے جائے اسے دگنی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اور عبرت کے طور پر اسے ضرب لگائیں گے۔ اور جو پھل کو حفاظت گاہ سے اٹھاتا ہے اس میں قطع ہے اگر اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے مساوی ہو۔“

احناف نے ڈھال کی قیمت دس درہم متعین کی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ قطع ید کی سزا اسی پر نافذ کی جائے گی جس نے کم از کم دس درہم کے بہ قدر مال کی چوری کی ہو۔ بخاری، مسلم کی ایک روایت میں ڈھال کی قیمت تین درہم بتائی گئی ہے۔ اس کے بارے میں احناف کا کہنا یہ ہے کہ دراصل حضرت ابن عمرؓ کا قیاس ہے۔ بعض دوسری روایتوں میں ڈھال کی قیمت کا ذکر دس درہم کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگر صاحبِ مال معاملہ حاکم کے پاس لے جانے سے پہلے چور کو معاف کر دیتا ہے تو پھر اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن حاکم کے پاس معاملہ پیش

ہو جانے کے بعد کوئی سفارش مفید نہیں ہوسکتی۔

〈۲۷〉 **وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اُتِیَ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَقَالَ اِضْرِبُوْا.** (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اسے مارو۔''

تشریح: شراب کم ہو یا زیادہ اس کا پینا حرام ہے۔ اسلامی شریعت کی نگاہ میں دین ہی کی نہیں عقل و تمیز، جسم اور مال ہر ایک کی قدر و قیمت ہے۔ شراب کی حرمت سے ان سب کی حفاظت ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ○ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ○ (المائدۃ:۹۰،۹۱)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے تو گندے شیطانی کام ہیں۔ پس تم ان سے پرہیز کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت پیدا کردے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم باز نہ آجاؤ گے۔''

معلوم ہوا کہ شراب اور جوے وغیرہ سے دین اور دنیا دونوں کا نقصان ہے۔ نماز اور یادِ خدا کی لذّتوں سے بھی انسان محروم ہو جاتا ہے اور اس سے معاشرتی خرابیاں الگ رونما ہو کر رہتی ہیں۔

شراب کی حد کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ شراب پینے والا مسلمان، عاقل، بالغ اور بااختیار ہو۔ وہ بیمار بھی نہ ہو۔ سزا کے نفاذ کے وقت موسم سخت نہ ہو بلکہ معتدل ہو۔ کوڑے اس طرح مارے جائیں کہ جسم کے مختلف حصوں پر چوٹ آئے۔ بدن کے کسی ایک ہی حصے پر کوڑے نہ ماریں۔ جو نشہ حد کو واجب کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی زمین و آسمان کے درمیان امتیاز نہ کرسکے۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نشہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی ہذیان اور واہی تباہی بکنے لگ جائے۔ احناف کا فتویٰ اسی پر ہے۔

〈۲۸〉 **وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا ضَرَبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتَّقِ الْوَجْهَ.** (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص (کسی مجرم کو سزاءً) مارے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کے منہ کو بچائے۔''

تشریح: چہرہ بہت ہی نازک عضو ہوتا ہے۔ اس لیے چہرے پر مارنے سے روکا جارہا ہے۔ چہرے پر ضرب لگانے سے چہرہ زخمی ہوسکتا ہے اور اس کا زیادہ امکان ہے کہ وہ بدنما ہوجائے۔ پھر تو یہ ایک طرح سے مثلہ کرنا ہوا جو کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ آدمی کا احترام حتی الامکان ضروری ہوتا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آدمی کی شخصیت کا آئینہ دار آدمی کا چہرہ ہی ہوتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اس لیے اگر کسی کو مارنا ہو تو اس کے منہ پر نہ مارو۔ انسان کسی عظیم ہستی کے رُخ کا عکس محض ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

﴿۲۹﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لاَ تُقَامُ الْحُدُوْدُ فِی الْمَسَاجِدِ وَلاَ یُقَادُ بِالْوَلَدِ الْوَالِدِ. (ترمذی، دارمی)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجدوں میں حدود جاری نہ کیے جائیں اور نہ اولاد کے (قتل کے) بدلے میں باپ کو قتل کیا جائے۔''

تشریح: یعنی مساجد نماز اور ذکر وغیرہ کے لیے ہیں مسجدوں میں نہ تو کسی کو کوئی سزا دی جائے اور نہ بہ طور قصاص کسی کو قتل کیا جائے۔

ماں باپ اگر اپنی اولاد کو قتل کردیں تو بہ طور قصاص ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مذہب یہی ہے۔ اس سلسلہ میں امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو تلوار سے قتل کیا ہے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا لیکن اگر باپ نے بیٹے کو ذبح کیا ہے تو اس صورت میں بہ طور قصاص باپ کو قتل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اس سلسلہ میں ماں کا حکم بھی وہی ہے جو باپ کا ہے۔ نیز دادا، دادی اور نانی بھی والدین کے حکم میں آتے ہیں۔

اپنی ہی اولاد کو قتل کرنا ایک طرح سے خود اپنے آپ کو قتل کرنا ہے۔ اولاد کو قتل کرکے آدمی خود اپنے ہی کو عظیم نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ نقصان خود ایک بڑی سزا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے دیت یا مالی معاوضہ لے لیں گے۔ اسے قتل نہیں کریں گے۔

باب سوم:

اِظہارِ دین

اِظہارِ دین

اسلام ایک کامل دین ہے، جسے انسانیت کی رہ نمائی کے لیے خالقِ کائنات نے مشروع فرمایا ہے۔ یہ دین چوں کہ کامل ہے، اس لیے یہ انسان کی پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ زندگی کے کسی شعبے میں بھی وہ انسانوں کو ہدایت اور رہ نمائی سے محروم نہیں کرتا۔ فکر ونظر کا مسئلہ ہو یا عبادت اور پرستش کا یا انسان کے معاشی وسیاسی مسائل ہوں یا عدل اجتماعی کا، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری صحیح رہ نمائی کرتا ہے۔ اسلام حقیقت میں دین کے کامل مفہوم ومعنی میں دین ہے۔ اسے ہم محض پوجا پاٹ کا دین نہیں کہہ سکتے۔ وہ اپنا معاشرتی نظام بھی رکھتا ہے اور معاشی وسیاسی نظام بھی رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی ایک کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تمام ہی شعبے باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام خدا کی کامل اطاعت وبندگی کا نام ہے۔ یہ اطاعت اور بندگی زندگی کے ہر معاملے میں مطلوب ہے۔ ہم اس شخص کو خدا کا فرماں بردار نہیں کہہ سکتے جو خدا پر ایمان تو رکھتا ہے، اس کے آگے اپنا سر بھی جھکاتا ہے، لیکن زندگی کے معاملات میں خواہ وہ لین دین اور تجارت کا معاملہ ہو یا رہن سہن اور ایک دوسرے کے حقوق کے معاملات ہوں، یا نظام حکمرانی کے مسائل ہوں۔ وہ ان سارے امور میں اپنے کو آزاد سمجھتا ہے۔ اسے ہرگز خدا کا وفادار اور اطاعت گزار بندہ نہیں کہا جا سکتا۔ خدا کا اطاعت گزار بندہ تو وہی ہوگا جو زندگی کے ہر میدان میں اور زندگی کے جملہ امور میں خدا کے احکام کا پابند ہو۔ خدا نے چوں کہ زندگی کے جملہ امور میں وحی کے ذریعے سے ہماری رہ نمائی کی ہے۔ اس لیے زندگی کے کسی شعبے میں اگر انسان اس کی نافرمانی کرتا ہے تو خدا کے یہاں اس کا شمار اس کے نافرمانوں اور باغی اور سرکش بندوں میں ہوگا۔

خدا نے اپنا دین یوں ہی بے مقصد نہیں نازل فرمایا ہے۔ اس نے تو اسے اس لیے نازل کیا ہے کہ لوگ اس پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو امن وسلامتی سے بھر دیں۔ کہیں بھی کسی شعبہ میں ظلم و ستم کو روا نہ رکھیں۔ وہ خدا کے عادلانہ نظام کا پاس ولحاظ رکھنا اپنا اوّلین فرض قرار دیں۔

قرآن خدا کے دین کامل ہی کا ترجمان ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں نہ صرف یہ کہ اس کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ انسان کو اپنے خالق یا ربِ کائنات کا عرفان حاصل ہو اور وہ صحیح معنی میں خداشناس ہو سکے بلکہ انسان کے عمل کی دنیا کے لیے بھی قرآن ایک رہ نما کتاب ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ طریق حیات کیا ہے؟ عدل وانصاف کسے کہتے ہیں؟ وہ کون سی روش ہے جو خدا کی نگاہ میں بے راہ روی، سرکشی اور سراسر ظلم وفساد ہے۔ خدا کو فتنہ وفساد، بگاڑ اور ظالمانہ روِش ہرگز پسند نہیں۔ وہ خود عادل ہے۔ عدل وانصاف کو پسند کرتا ہے۔ ظلم وستم اسے ہرگز گوارا نہیں۔

وہ انسان کو اخلاق و کردار اور روحانیت کی بلندی پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس بلندی پر جس سے بڑھ کر ہم کسی بلندی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے قلوب کو ہر قسم کی کثافتوں اور آلائشوں سے پاک اور بہترین جذبات واحساسات سے مزین دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا خود فیاض ہے، وہ نہیں چاہتا کہ انسان فیاضی کو اپنا شعار نہ بنائے۔ خدا کے اسماء وصفات جن کا ذکر قرآن میں تفصیل سے کیا گیا ہے، انسانی زندگی کے لیے آئینہ ہیں۔ خدا اپنی صفات کا عکس انسان کی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے اور خدا کے درمیان مطابقت پیدا کرنا اور اس مطابقت کو قائم رکھنا ہی بہترین اور خوش تر طرزِ حیات ہے۔ جس میں خیر بھی ہے۔ اور حسن و جمال بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اور اعتبار و بقا بھی اسی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سکون اور قرار جان ودل کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ ایک اصل آفاقی اصول (Universal settled order) کی تلاش میں دنیا کے بڑے بڑے عارف ومفکر سرگرداں رہے ہیں۔ خواہ انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ بھارت کے رِشیوں نے اسے رِتم ऋतम से موسوم کیا۔ چین کے لاؤتسے نے اس کو تاؤ کہا۔ کبھی یہاں خدا کے اور اپنے درمیان مماثلت (Similarity) پیدا کرنے کی بات کہی گئی، لیکن صحیح اور ہر قسم کی افراط وتفریط سے پاک نظریہ، نظریہ مطابقت ہے۔ یعنی اپنے اور خدا کے درمیان ایسی مطابقت رکھنی جس میں کسی قسم کی مزاحمت، ٹکراؤ اور تصادم کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ بندوں کی زندگی منشائے خداوندی کے سانچے میں بالکل ڈھل جائے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (الاعراف: ۲۰۳)

''کہہ دو: میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے، یہ تمہارے رب کی طرف سے بصیرتوں کا مجموعہ ہے اور ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ قرآن صرف علم وفکر کے مسائل ہی میں تمہارے لیے رہ نما نہیں ہے، بلکہ وہ ہدایت یعنی طریقِ عمل کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس کا حاصل اور انجام سراپا رحمت ہے۔

پھر قرآن اپنے پیرووں کو جس منصب پر دیکھنا چاہتا ہے، وہ یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ.

(النساء: ۱۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے مضبوطی سے انصاف پر جمے رہو۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرۃ: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیانی امت بنائی ہے تا کہ تم سارے انسانوں پر حق کی گواہی قائم کرنے والے بنو، اور رسول تم پر گواہی قائم کرنے والا ہو۔''

سارے انسانوں کو حق سے باخبر کرنا قرآن کے پیرووں کی منصبی ذمہ داری ہے۔ قرآن کی حیثیت هُدًى لِّلنَّاسِ (ساری انسانیت کے لیے رہ نما) کی ہے۔ اسے کسی ایک خطے یا کسی خاص قوم کی چیز سمجھنا غلط ہے۔ وہ سارے عالم پر زندگی کے راز کھولنا چاہتا ہے۔ وہ سارے عالم کو آگاہ راز اور باخبر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان جان لے کہ اس کی تقدیر کیا ہے؟ اس کا مقام اور اس کی اصل منزل کیا ہے؟ وہ جان لے کہ حیات جاوداں جس کی آرزو ہر ایک دل میں رکھی گئی ہے، کیوں کر حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے لیے عظیم ہلاکت اور خسران کس چیز میں

ہے اور اس کی فلاح اور کامیابی کا اصل مفہوم کیا ہوتا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ حق اور عدل کے پاس اگر قوت اور اقتدار نہیں تو اہل ستم کبھی بھی حق کے چراغ کو روشن نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی کوشش یہی ہوگی کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ چراغ جلنے نہ پائے اور اگر کہیں جلنے لگا ہو تو اسے جس طرح بھی ممکن ہو بجھا دیا جائے۔ پھر عدل اور حق کے پاس اگر اقتدار اور قوت نہیں تو صحیح معنی میں وہ انسانیت کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ دنیا میں طاقت اور اقتدار کا اگر کوئی مستحق ہوسکتا ہے تو وہ حق اور عادلانہ نظام ہی ہوسکتا ہے۔ اقتدار اگر کسی کے ہاتھ سونپا جاسکتا ہے تو وہ وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو جاہلیت کے بجائے علم اور ظلم وطغیان کے بجائے حق اور عدل وانصاف کے علمبردار ہوں۔ ظالم اور سرکش لوگ جو ظلم وستم اور فساد برپا کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں جانتے۔ جو انسانیت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں اور جو عام حیوانات کی سطح سے بھی نیچے گرے ہوئے ہیں۔ جلب منفعت اور مادہ پرستی، اور عیش کوشی کو جو زندگی کی معراج سمجھتے ہیں، جن کے دل اتنے تنگ ہیں کہ وہ خود اپنے اقربا کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرسکتے، وہ انسانیت کے رہ نما اور خادم کیسے ہوسکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اگر اقتدار اور طاقت ہے تو دنیا کبھی بھی امن وسلامتی کا گہوارہ نہیں بن سکتی۔ کیا خود عصر حاضر اس کی شہادت کے لیے کافی نہیں ہے۔

دین حق اپنے مزاج اور فطرت کے لحاظ سے مغلوب نہیں غالب رہنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اظہار اور غلبہ اگر اس کی فطرت نہ ہو تو وہ دین حق ہی نہیں ہے۔ آپ خود سوچیے کہ وہ نغمہ ہی کیا ہے جو ترنم ریزی سے بیزار ہو، جسے یہ خوف لاحق ہو کہ کہیں کوئی کان اُسے سن نہ لے اور کہیں کوئی شخص اسے پاکر نغمہ سنج نہ ہوجائے۔ وہ قانون درحقیقت قانون ہی نہیں ہے جو اپنا نفاذ نہ چاہتا ہو۔ ٹھیک اسی طرح وہ شخص انسانیت نواز نہیں ہوسکتا جو آفاقی فکر ونظر کا حامل نہ ہو۔ انسانیت کا تعلق کسی خاص خطہ اور سرزمین سے نہیں ہے۔ اور نہ انسانیت کسی مخصوص قوم، قبیلہ یا نسل کا نام ہے۔ انسانیت کا تعلق کسی خاص زبان کے بولنے والوں سے ہے اور نہ انسانیت گورے کا نام ہے اور نہ کالے کا نام ہے۔ جب تک ہمارے فکر میں وسعت نہ آجائے اور وہ آفاقی نہ ہوجائے زمین سے ظلم، بے انصافی اور فتنہ وفساد کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔

اسلام چوں کہ خدا کا نازل کردہ ایک ایسا دین ہے جو ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے۔ جو آفاقیت کا حامل ہے جس کی تعلیم عدل وانصاف ہے، تنگ نظری نہیں۔ جو ایثار اور قربانی کو پسند

کرتا ہے، خودغرضی، خود پرستی، انانیت، غرور واستکبار کو پسند نہیں کرتا۔ خدا پرستی کے سوا وہ کسی قسم کی بھی پرستش کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اندھی وطن پرستی اور قوم پرستی نے دنیا کو جس ظلم و جبر اور دہشت نا کی سے بھر دیا ہے اس سے کون بے خبر ہو سکتا ہے۔ اس لیے صحیح اور عادلانہ نظامِ فکر و عمل وہی ہو سکتا ہے جو ہر قسم کی تنگ خیالی، اوہام پرستی اور جاہلانہ روش سے ہمیں بچا سکے۔ جو ہمیں ایک ایسی فضا میں سانس لینا سکھا سکے جہاں جاہلی عصبیت نہ ہو، تنگ نظری اور جبر و ظلم نہ ہو، جہاں آزادی پر ڈاکے نہ ڈالے جاتے ہوں۔ جہاں کسی کے بھی ساتھ ظلم روا نہ ہو۔ جہاں ترقی کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوں۔ جہاں ہر ایک شخص کو سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے کی آزادی حاصل ہو۔ جہاں آدمی اس کے لیے آزاد ہو کہ اگر وہ بے یقین اور الحاد کی زندگی سے تائب ہو کر مومنانہ اور خدا پرستانہ زندگی بسر کرنی چاہتا ہو تو اس کی راہ میں کوئی رُکاوٹ کھڑی کرنے والا نہ ہو اور خود اس کی بلند نظری اور پاکیزہ نگاہی سے فیضیاب ہونے میں لوگوں کے لیے کوئی مشکل اور رُکاوٹ نہ ہو۔ کسی کی فطری آزادی کو سلب کرنے کی جرأت کوئی نہ کر سکے۔ لوگ سچائی کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ کوئی شخص بھی اپنے حق پسندانہ فیصلے کی وجہ سے ستایا نہ جا سکے۔ اپنی ذات کی حد تک تو آدمی آزاد ہو کہ اگر وہ دوزخ میں جانا چاہتا ہو تو دوزخ میں جانے کی اس کی آزادی بھی نہ چھینی جائے۔ لیکن جبراً کسی کو دوزخ کی طرف لے جانے کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہ ہو۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اظہارِ دین یا دینِ حق کا غلبہ کیوں ضروری ہے۔ اور اسے حکمراں دیکھنے کی خواہش کا جواز کیا ہے۔ یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اظہارِ دین یا دین کو غالب کرنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ جسے ظلم و ستم کہا جا سکے یا جو عدل کے خلاف ہو۔ جب حق خود امن و سلامتی کا داعی ہے تو وہ کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کر سکتا جو خود اس کی اپنی فطرت اور مزاج کے خلاف ہو۔ اظہارِ دین کا فطری اور صحیح طریقِ کار دعوت و تبلیغ ہے۔ لوگوں کے غلط اور جاہلیت پر مبنی افکار و نظریات کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی اور انھیں بتایا جائے گا کہ خدا کے پسندیدہ بندے کیسے ہوتے ہیں؟ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ وہ کس قدر بہی خواہ ہوتے ہیں؟ ایسے لوگوں کی زندگیاں ہی حقیقی حسن و جمال کی آئینہ دار ہو سکتی ہیں۔ اور آخرت کی لازوال اور سرور انگیز حیات کے وہی مستحق ہوں گے۔ خدا کی نافرمانی کا انجام کبھی بہتر نہیں ہو سکتا۔ وہ درحقیقت خدا کے نافرمانوں کا ٹھکانہ ہے

جس کو جہنم یا دوزخ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حق کا پیغام جن کے دلوں میں اتر جائے گا، ان کی زندگی بدل جائے گی۔ وہ خود حق کے داعی بن کر جینا پسند کریں گے تاکہ وہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام پہنچانے کی سعادت سے بہرہ مند ہوسکیں۔ پھر ایسے حق پرست لوگ یہ کبھی پسند نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی سرزمین پر حق کے بجائے باطل کا غلبہ دیکھیں۔ ان کا معاشرہ بالکل بدل جائے گا۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہوگا جہاں اندھیرا اٹھ نہیں سکتا۔ یہ معاشرہ زندگی کے پورے نظام کو خود بدل کر اسے دینِ حق کے مطابق ترتیب دے گا۔ یہ معاشرہ کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہوسکتا کہ زندگی کے کسی شعبے میں خدا کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہو اور خدا کے احکام کی خلاف ورزی کو روا رکھا گیا ہو۔

انسانوں کی فلاح اور بھلائی کے لیے کوشاں رہنا، اور دین کے لیے سرگرمی دکھانا، یہ دو باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں ایک ہیں۔ انسان کی کامیابی خدا کے بھیجے ہوئے دین ہی سے وابستہ ہے۔ اور اس کی ناکامی اور اصل خسران خدا کے دین سے بے گانگی میں ہے۔ دین کی اشاعت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسانوں کو فکری و عملی انتشار اور دنیوی اور اُخروی ہلاکت سے بچا لیا جائے۔ حقیقی کامیابی ان کے حصے میں آئے۔ اور زندگی کے حقیقی حسن و کمال اور کیف سے وہ آشنا ہوسکیں۔ اگر خدا کی زمین میں یہ کوشش جاری ہے تو سمجھئے کہ خدا کا دین زندہ اور قائم ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کی ایک جماعت اس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے گی یہاں تک کہ قیامت برپا ہوجائے گی۔ قتال کی نوبت آئے گی تو وہ جماعت اس سے گریز نہ کرے گی۔ برائی اور ظلم و فساد کو مٹا دینے کی طاقت اگر حاصل ہے تو اس نیک مقصد کے لیے طاقت کا استعمال غلط نہ ہوگا۔ قرآن میں ہے: وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء:۷۵) ’’تمھیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے راستے میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہ لڑو، جو کہتے ہیں کہ ہمارے رب تو ہمیں اس بستی سے جس کے لوگ ظالم ہیں نکال لے، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے تو کوئی حمایتی مقرر کر، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے تو کوئی مددگار بنا۔‘‘

ہر قتال اور جنگ کو ناروا نہیں کہا جاسکتا۔ جو لڑائی ظلم کو فروغ دینے کے لیے نہیں بلکہ ظلم کو مٹانے کے لیے ہو، اور جو اس لیے ہو کہ حق کی راہ کی رُکاوٹیں دور کردی جائیں تاکہ خدا کی

اطاعت اور اس کی بندگی کی راہ پر چلنا لوگوں کے لیے آسان ہو سکے اور کوئی شخص اس لیے نہ ستایا جائے کہ وہ خدا کی بغاوت سے دور رہ کر خدا کی رضا کی طلب میں زندگی گزارنا چاہتا ہے اور وہ اپنے دل میں بندگانِ خدا کے جذبۂ خیر خواہی کے سوا اور کوئی جذبہ نہیں رکھتا۔

اظہارِ دین

(۱) عَنْ اَبِیْ مَالِکٍ یَعْنِی الْاَشْعَرِیَّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللّٰہَ اَجَارَکُمْ مِنْ ثَلَاثِ خِلَالٍ اَنْ لَّا یَدْعُوْ عَلَیْکُمْ نَبِیُّکُمْ فَتَھْلَکُوْا جَمِیْعًا وَّ اَنْ لَّا یَظْھَرَ اَھْلُ الْبَاطِلِ عَلٰی اَھْلِ الْحَقِّ وَ اَنْ لَّا تَجْتَمِعُوْا عَلٰی ضَلَالَۃٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: ”بے شک اللہ نے تمھیں تین آفتوں سے بچا رکھا ہے: یہ کہ تمہارا نبی تم پر بددعا نہیں کرے گا کہ تم سب ہلاک ہو کر رہ جاؤ اور یہ کہ اہلِ باطل کبھی اہلِ حق پر غالب نہ ہوں گے اور یہ کہ ایسا نہ ہو گا کہ تم سب گمراہ ہو جاؤ۔“

تشریح: دینِ حق کو خدا نے اس غرض سے نازل فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اہلِ عالم پر اتمامِ حجت ہو سکے۔ دنیا یہ کہنے میں حق بہ جانب نہ ہو کہ خدا نے انسانوں کو پیدا کر کے انھیں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ انسان باشعور ہی نہیں ہے بلکہ اسے شعور کی اعلیٰ سطح پر رکھا گیا ہے۔ اسے شعورِ ذات (Self Consciousness) حاصل ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تخلیقِ کائنات اور مقصدِ تخلیق کے بارے میں اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات اُٹھتے ہیں جو اپنا جواب چاہتے ہیں۔ یہ سوالات ایسے ہیں جو عام حیوانات کے ذہن میں نہیں پیدا ہوتے۔ عام حیوانات کی حیثیت زندہ مشین کی ہوتی ہے۔ تصور و تخیل کے نازک ترین حس ان میں نہیں پائی جاتی۔ وہ جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ نہ وہ فرد کا کوئی تصور رکھتے ہیں اور نہ انھیں کسی خالق یا حقیقی ذات کی کوئی تلاش ہے جس کا شکر یہ وہ ادا کر سکیں اور جس کی طلب و محبت ان کی زندگی کو زمینی اور مادی سطح سے اوپر اٹھا کر انھیں رفعت اور حقیقی بلندی عطا کر سکے۔

عام حیوانات کی طرح انسان کو محض جبلی ہدایت کافی نہیں ہے۔ انسان کو شعور کی سطح پر واضح ہدایت اور رہ نمائی کی ضرورت ہے۔ دنیا میں انسان کی جسمانی اور مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے جو اہتمام پایا جاتا ہے، وہ غیر معمولی ہے۔ پھر اس کی فکری و عملی زندگی کے لیے رہ نمائی کا

اہتمام کیوں نہ ہوتا۔ جس سے اس زندگی کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اسے اپنے ان سارے ہی سوالات کے جوابات اطمینان بخش طریقے سے مل جاتے ہیں جو زندگی اور تخلیق کائنات کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے خدا شعور کی سطح پر انسانوں کی رہ نمائی کرتا رہا ہے۔ اس رہ نمائی کے لیے اس نے نبیوں کو بھیجا اور ان پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ شعور کی سطح پر انسان کی ہدایت کا سامان ہو اور اسے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا پورا موقع حاصل ہو۔ پھر بہ رضا و رغبت وہ چاہے تو اس رہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے تو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ اس میں اس کے ظرف اور قدر شناسی کا امتحان بھی ہے۔

پیش نظر حدیث میں دی گئی تینوں ہی خبریں بنیادی طور پر اہم ہیں۔ ان تینوں میں سے اگر ایک غلط ہو تو پھر اہل عالم پر حق کی حجت کی کوئی سبیل نہ ہوگی۔ دین حق کے نمایندے ہی اگر سب کے سب ہلاک ہو جائیں، یا سب کے سب ہلاک تو نہ ہوں لیکن دین حق سے وہ بے گانہ ہو جائیں یا خود دین حق کسی مرحلے میں دینِ باطل کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو جائے۔ نہ اس کے پاس باطل کے مقابلے میں استدلال کی قوت باقی رہے اور نہ فطرتِ انسانی کو مطمئن کرنے کی اس میں سکت رہ جائے اور نہ وہ اپنے پیرووں کو سربلندی و سرفرازی کی راہ دکھا سکے تو اس حالت میں دنیائے انسانیت کے بھٹکنے اور راہِ راست سے دور جا پڑنے کو جرمِ عظیم کہنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے حدیث میں دی گئی بشارت بہت بامعنی ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اہل حق کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر کوئی قوم قادر نہ ہو سکے گی۔ حق کا چراغ ہمیشہ روشن رہے گا۔ یہ لوگوں کا اپنا قصور ہوگا کہ روشنی کے باوجود وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہنے کو اپنے لیے پسند کریں اور انجام کار خسران و عذاب ان کی تقدیر بن جائے۔ ہاں تو حق کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا۔ یہ روشنی کبھی بجھ نہیں سکتی۔ مستفیض ہونے والے اس روشنی سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں حق گم ہو کر رہ جائے۔ یہی اصل مفہوم ہے اس کے قائم رہنے کا کہ اس کے لیے ایک گروہ ہمیشہ رہتی دنیا تک سرگرم اور کوشاں رہے گا۔

〈۲〉 وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَلَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، ان کا

مخالف انھیں ضرر نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آ جائے گا۔“

تشریح: یہ وہی خوش خبری ہے جو اس سے پہلے کی حدیث میں بھی دی گئی ہے۔ یعنی ساری امت مسلمہ گمراہ ہو جائے اور وہ اپنے فرائضِ منصبی کو فراموش کر دے، ایسا نہیں ہوگا۔ ایک گروہ لازماً ہر میدان میں حق کی نمایندگی کرتا رہے گا۔ اس گروہ کی مخالفت بھی ہوگی، لیکن کوئی مخالفت اس گروہ کو اس کے اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے سے باز نہ رکھ سکے گی۔ یہاں تک کہ دنیا کے خاتمہ کا وقت آ جائے گا۔

﴿۳﴾ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَنْ يُّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِماً يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عَصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”یہ دین برابر قائم رہے گا۔ اس پر مسلمانوں کی ایک جماعت لڑتی رہے گی۔ یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔“

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے قائم رہنے اور اس کے قائم کرنے کا اصل مفہوم کیا ہوتا ہے۔ دین کے قائم کرنے سے مراد دین کا پاس ولحاظ اور ہر حال میں اس کے احکام کی پیروی ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے دین حق ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ایک گروہ ہمیشہ حق کی نمایندگی کے لیے موجود ہوگا۔ اور وہ دین کی حفاظت اور اس کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رہے گا۔ اس کے لیے اگر اسے میدان جنگ میں اُترنا پڑا تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ اس کی جان اور اس کا مال سب کچھ دین حق کی بقا کے لیے وقف ہوگا۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ اسلام میں قیادت وامامت اور اقتدار وحکومت کے مابین بعد نہیں پایا جاتا لیکن قیادت وامامت اقتدار کی محتاج ہرگز نہیں ہے کہ اقتدار کے بغیر قیادت و امامت کا فریضہ انجام ہی نہیں دیا جاسکتا۔ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا نے ساری دنیا کے انسانوں کا امام قرار دیا ہے حالاں کہ اقتدار وسلطنت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔

جہاد

﴿۱﴾ عَنْ اَبِيْ مُوسٰیؓ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الرَّجُلِ يُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَ

یُقَاتِلُ حَمِیَّةً وَ یُقَاتِلُ رِیَآءً اَیُّ ذٰلِکَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا جو بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے یا قوم یا کنبہ کی حمیت میں لڑتا ہے یا نام ونمود کے لیے لڑتا ہے۔ کس قتال کو خدا کی راہ میں شمار کریں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اس لیے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، وہ خدا کی راہ میں ہے۔''

تشریح: صحیح بخاری میں ہے: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانَہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قال: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ ''ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لیے لڑتا ہے، کوئی ناموری کے مقصد سے جہاد کرتا ہے اور کوئی ہے جو اپنا مرتبہ ومقام دکھانے کی غرض سے لڑتا ہے تو حقیقت میں مجاہد فی سبیل اللہ کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: 'جو اس لیے لڑے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ وہی حقیقت میں مجاہد فی سبیل اللہ ہے'۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو لڑائی اس لیے لڑی جائے کہ خدا کا بول بالا ہو، حق و صداقت اور خدا کا دین پامال نہ ہو بلکہ اسے غلبہ نصیب ہو تو اس لڑائی کو جہاد فی سبیل اللہ کہیں گے۔ یوں جنگیں اور لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان لڑائیوں کے مختلف محرکات ہوتے ہیں، ہر لڑائی یا جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ کا لقب نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: سَتُفْتَحُ عَلَیْکُمْ اَرْضُوْنَ یَکْفِیْکُمُ اللّٰہُ فَلَا یَعْجِزُ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّلْھُوَ بِاَسْھُمِہٖ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جلد ہی کئی ملک تمہارے ہاتھوں فتح ہوں گے، اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ تم میں سے کوئی اپنے تیر کا کھیل ترک نہ کرے (یعنی اسے تیر اندازی کی مشق برابر کرتے رہنا چاہیے)۔''

تشریح: یعنی اپنی بقا اور قیام کے لیے قوت اور طاقت کا حصول ضروری ہے۔ اور اس کے لیے جنگی ٹریننگ اور تربیت برابر ہوتی رہنی چاہیے۔ زمانے نے جو آلات حرب ایجاد کیے ہوں ان کی طرف سے بے اعتنائی درست نہیں ہے۔ لیکن اصل بھروسہ خدا کی ذات پر کرنا چاہیے۔ اس

حدیث میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ زمانے کی آنکھوں نے دیکھا کہ کس طرح نہایت تیزی سے جلد ہی اسلام دنیا کے بڑے حصے پر چھا گیا اور قیصر و کسریٰ کی مملکتیں تک زیر نگیں ہو کر رہیں۔

﴿۳﴾ وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ اَحَدٍ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ اَنْ يَّرْجِعَ اِلَى الدُّنْيَا وَ اِنَّ لَهٗ مَا عَلَى الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ غَيْرَ الشَّهِيْدِ فَاِنَّهٗ يَتَمَنّٰى اَنْ يَّرْجِعَ فَيُقْتَلَ عَشَرَ مَرَّاتٍ لَمَّا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص بھی جنت میں داخل ہوگا وہ پھر دنیا میں آنے کو پسند نہ کرے گا، اگرچہ اسے زمین کی ساری چیزیں مل رہی ہوں۔ البتہ شہید کی بات اور ہے کیوں کہ وہ (دنیا میں) پھر آنے کی اور دس بار (خدا کی راہ میں) قتل ہونے کی تمنا کرے گا، کیوں کہ وہ شہادت کی کرامت اور اس کے مرتبہ کو دیکھ رہا ہوگا۔''

تشریح: اصل میں موجودہ دنیا میں کشش اور جاذبیت ہمیں اپنی طرف سب سے زیادہ اس لیے بھی کھینچتی ہے کہ ہم آگے آنے والی زندگی کے حسن و جمال سے نا آشنا ہیں۔ خدا کے پاس جو سامانِ دلکشی و راحت ہے اسے دیکھنے کے بعد اس فتنہ بھری دنیا کی طرف کون رخ کرنا چاہے گا۔ لیکن ان شہیدوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ جنھیں خدا کی راہ میں اپنی جانیں نثار کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وہ چاہیں گے کہ کاش دنیا میں بار بار جانے اور خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کی سعادت حاصل ہوتی۔ اس لیے کہ اُن پر یہ راز کھل چکا ہوگا کہ انسان کے مرتبہ و مقام کو سب سے زیادہ بلند کرنے والی اور اس کے وقار اور وزن کو بڑھانے والی چیز خدا کی راہ میں قربان ہو جانے سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

﴿۴﴾ وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّؓ قَالَ: قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فَقَدْ غَزَا وَمَنْ خَلَفَ غَازِيًا فِيْ اَهْلِهٖ فَقَدْ غَزَا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی غازی کا سامان کر دیا اس نے بھی جہاد کیا۔ اور جس نے کسی غازی کے گھر والوں کی خبر گیری کی اس نے بھی جہاد کیا۔''

تشریح: یعنی مجاہد فی سبیل اللہ کے ساتھ تعاون کرنے والا بھی جہاد میں شریک سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ اس عظیم کام میں بالواسطہ وہ بھی شریک ہے۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کے اجر و ثواب سے وہ محروم نہیں رہ سکتا۔

﴿۵﴾ وَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: تَكَفَّلَ اللّٰهُ لِمَنْ جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِهٖ لَا یُخْرِجُهٗ اِلَّا الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِهٖ وَ تَصْدِیْقُ كَلِمَاتِهٖ بِاَنْ یُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ اَوْ یَرْجِعَهٗ اِلٰی مَسْكَنِهِ الَّذِیْ خَرَجَ مِنْهُ مَعَ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَةٍ. (بخاری)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ نے ذمہ لے لیا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا اور جس کو جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ کی باتوں کی تصدیق کے علاوہ کسی اور چیز نے گھر سے نہیں نکالا تو اللہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا، یا اسے اس کے مسکن کی طرف جہاں سے وہ نکلا تھا اجر و ثواب اور مالِ غنیمت کے ساتھ واپس پہنچائے گا۔‘‘

تشریح: یعنی اگر کوئی شخص گھر سے محض جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے اور خدا کی باتوں اور اس کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے گھر سے نکلتا ہے۔ نام و نمود یا اس طرح کی دوسری کوئی غرض اس کے پیش نظر نہیں ہوتی تو خدا اس کی ضمانت لیتا ہے کہ اگر وہ جنگ میں شہید ہو گیا تو اسے جنت میں جگہ عنایت کرے گا یا پھر وہ فتح یاب ہو کر مالِ غنیمت کے ساتھ اپنے گھر لوٹے گا۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ کامیاب ہے۔ ناکامی اس کے حصے میں ہرگز نہیں آسکتی۔ ایک حدیث میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ (بخاری و مسلم) ’’جان لو جنت تلواروں کے سایے کے نیچے ہے۔‘‘ یعنی خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے بندہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

﴿۶﴾ وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَغَدْوَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا. (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ’’خدا کے راستے میں صبح یا شام کو چلنا دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔‘‘

تشریح: معلوم ہوا کہ خدا کی راہ میں نکلنا غیر معمولی عمل ہے۔ خواہ یہ نکلنا صبح کو ہو یا شام کو۔ بس شرط یہ ہے کہ یہ نکلنا خدا کی راہ میں ہو، یعنی جہاد کے لیے ہو یا خدا کے دین کی اشاعت، اس کے

فروغ اور غلبہ کی کوشش میں یہ دوڑ دھوپ ہورہی ہو۔ خدا کی راہ میں نکلنا ایسا حسین، دلآویز اور خدا کی نگاہ میں پسندیدہ عمل ہے کہ دنیا اور دنیا میں جو نعمتیں بھی موجود ہیں وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہیں۔

﴿۷﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَغْفِرُ اللّٰهُ لِلشَّهِيْدِ كُلَّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ. (مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ شہید کا ہر گناہ بخش دے گا سوائے قرض کے۔“

تشریح: خدا کی راہ میں اپنی جانیں نثار کرنا یقین و ایمان کا ایسا مظاہرہ اور جذبۂ وفاداری کا ایسا اظہار ہے کہ اس کی وجہ سے خدا اپنے بندے کی ساری خطاؤں کو معاف فرمادیتا ہے۔ زندگی میں جو بھی کوتاہیاں ہوئی ہوں شہادت یا جان کی قربانی سے سب کی تلافی ہوجاتی ہے۔ البتہ بندوں کے حقوق اگر کسی کے ذمہ ہیں تو وہ اس سے ساقط نہ ہوں گے۔ اس لیے حقوق العباد کی طرف سے کسی حال میں بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ اس میں تساہل سنگین ترین جرم ہے۔

آدابِ جنگ

﴿۱﴾ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنْطَلِقُوْا بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا تَقْتُلُوْا شَيْخًا فَانِيًا وَلَا طِفْلًا صَغِيْرًا وَلَا امْرَأَةً وَلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوْا غَنَائِمَكُمْ وَ اَصْلِحُوْا وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”(جہاد کے لیے) اللہ کے نام اور اللہ کی تائید و توفیق کے ساتھ اور رسولِ خدا کی ملت (دین) پر قائم رہتے ہوئے نکل کھڑے ہو۔ (لیکن جنگ میں) نا تواں بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ نہ چھوٹے بچے کو اور نہ عورت کو قتل کرنا۔ نہ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا، جنگ میں جو کچھ تمہارے ہاتھ آئے جمع کرنا۔ نیکی اور احسان کی روش اختیار کرنا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ خوب کاروں کو پسند فرماتا ہے۔“

تشریح: اس حدیث میں جنگ اور جہاد کے سلسلے میں اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔ بتایا گیا کہ جنگ ان ہی سے کرنی چاہیے جو تم سے لڑیں۔ دوسروں پر ہاتھ اُٹھانا درست نہیں جو تمہارے مقابلے میں میدان میں نہیں اترتے۔ معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں اور نہ سن رسیدہ

بوڑھوں کو قتل کرنا درست ہے جو تم سے لڑتے نہیں ہیں۔

﴿۲﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: حَدَّثَتْنِیْ اُمُّ هَانِیْ بِنْتُ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّهَا اَجَازَتْ رَجُلاً مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ یَوْمَ الْفَتْحِ فَاَتَتِ النَّبِیَّ ﷺ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لَهٗ. قَالَ: فَقَالَ قَدْ اَجَرْنَا مَنْ اَجَرْتَ وَ اَمَّنَّا مَنْ اٰمَنْتَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ حضرت اُمِّ ہانی ابو طالب کی بیٹی سے روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن انھوں نے (حضرت ام ہانیؓ نے) ایک مشرک کو پناہ دے دی پھر اس کا ذکر انھوں نے نبیؐ کے پاس کیا تو آپؐ نے فرمایا: ”اسے ہم نے پناہ دی جس کو تم نے پناہ دی اور اسے ہم نے امن دیا جس کو تم نے امن دیا۔“

تشریح: حضرت ام ہانیؓ نے اپنے خاوند کے رشتہ دار کو پناہ دی تھی۔ حضرت علیؓ نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس کا ذکر انھوں نے نبی ﷺ سے کیا۔ اس موقع پر نبی ﷺ نے وہ بات فرمائی جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ عورت بھی اگر کسی کو امان دیدے تو اسلامی حکومت اس کا بھی احترام کرے گی۔

﴿۳﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ كَانَ بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا یَحُلَّنَّ عَهْدًا وَّلَا یَشُدَّنَّهٗ حَتّٰى یَمْضِیَ اَمَدُهٗ اَوْ یَنْبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ”جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس کا بند نہ کھولے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی کرے جب تک کہ معاہدہ کی مدت ختم نہ ہو [illegible] یا پھر برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا عہد ان کی طرف پھینک دے۔“

تشریح: اگر کسی قوم سے معاہدہ ہوا ہے تو اس معاہدہ کا پاس ولحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی شخص یا گروہ سے جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ ہے، ہمیں شکایت بھی ہو اور ہم یہ دیکھتے ہوں کہ اسے اپنے عہد کی پابندی کا خیال نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ وہ غداری کر جائے پھر بھی ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم اپنی جگہ معاہدہ کو ختم کرلیں اور اس کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار

کریں جیسے ہمارے اور اس کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فریق ثانی پر یہ واضح کر دیں کہ ہم معاہدہ ختم کرتے ہیں۔ فسخ معاہدہ سے فریق ثانی کو مطلع کیے بغیر اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی جائز نہیں ہے۔ قرآن میں بھی ہے: وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ (انفال:۵۸) ''اور اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو تو تم بھی اسی طرح ایسے لوگوں کے معاہدہ کو علانیہ ان کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ ان کو پسند نہیں کرتا جو خیانت کرتے ہیں۔''

قیدی

(۱) عَنْ اَبِیْ عَزِیْزِ بْنِ عُمَیْرٍ اَخِیْ مُصْعَبِ بْنِ عُمَیْرٍ قَالَ: کُنْتُ فِی الْاُسَارٰی یَوْمَ بَدْرٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِسْتَوْصُوْا بِالْاُسَارٰی خَیْرًا وَ کُنْتُ فِیْ نَفَرٍ مِنَ الْاَنْصَارِ فَکَانُوْا اِذَا قَدَّمُوْا غَدَائَهُمْ اَوْ عَشَائَهُمْ اَکَلُوا التَّمَرَ وَاَطْعَمُوْنِی الْخُبْزَ بِوَصِیَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِیَّاهُمْ. (المعجم الصغیر للطبرانی)

ترجمہ: حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابوعزیز بن عمیرؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں جنگ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا۔ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔'' میں انصار کے کچھ لوگوں کے یہاں تھا وہ جب صبح اور شام کا کھانا نکالتے تو خود تو کھجور کھاتے اور مجھے روٹی کھلاتے۔ ایسا وہ رسولِ خدا ﷺ کی تاکید کے سبب کرتے تھے۔

تشریح: قیدی مجبور اور بے بس ہوتے ہیں۔ ان کی بے بسی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا سلوک انتہائی مہربانی کا ہو۔ قیدی خواہ اہلِ کفر میں سے سخت دشمن ہو پھر بھی وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ حتی الامکان نیک سلوک کیا جائے۔ اسلام مجبوروں اور کمزوروں کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ ایک حدیث ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُقَدِّسُ اُمَّةً لَا یُؤْخَذُ لِلضَّعِیْفِ فِیْهِمْ حَقُّهٗ (شرح السنہ) ''اللہ کسی ایسی امت کو پاکیزگی عطا نہیں کرتا جس کے لوگوں میں کمزوروں اور ناتواؤں کو ان کا حق نہ دلایا جائے۔'' یعنی جن میں کمزوروں کے حقوق کو تحفظ حاصل نہ ہو۔

معافی اور درگزر

(۱) عَنْ عَائِشَةَ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَقِیْلُوْا ذَوِی الْهَیْئَاتِ عَثَرَاتِهِمْ اِلَّا

الْحُـــدُوْدَ. (ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حیثیت رکھنے والوں کی لغزشیں معاف کرو، البتہ (خدا کے مقرر کیے ہوئے) حدود کی بات اور ہے۔''

تشریح: حیثیت سے مراد یہاں درحقیقت وہ اعزاز اور مرتبہ ہے جو کسی شخص کے حصے میں اس کی عظیم قربانیوں اور اپنی خدمات کی وجہ سے آتا ہے۔ ایسے شخص سے اگر کوئی خطا ہو جاتی ہے تو اسے نظر انداز کر دینا ہی انسب ہوگا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت حاطبؓ سے ایک غلطی ہوگئی تھی انھوں نے کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے نبی ﷺ کا ایک راز اہلِ مکہ پر ظاہر کرنا چاہا تھا۔ لیکن ان کا یہ سنگین جرم نبی ﷺ نے معاف فرما دیا، اس لیے کہ وہ بدری صحابہ میں سے تھے جو جنگ بدر میں دشمنانِ دین کے مقابلے میں اپنی جان کی بازی لگانے میں ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹے تھے۔

اسلام میں جہاں مجرم کو سزا دینے کا حکم پایا جاتا ہے وہیں اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ قصور کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بڑے سے بڑے دشمن دین کو بھی معاف کرنے اور اسے چھوڑ دینے میں کوئی بڑی مصلحت ہو تو اسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں نبی ﷺ کے اسوۂ مبارکہ میں ملتی ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال قبیلہ بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کی ہے۔ اسے گرفتار کر کے لایا گیا تھا وہ اپنی رہائی کے لیے کثیر مال دینے کو تیار تھا۔ لیکن نبی ﷺ نے بغیر کچھ لیے اسے رہا کر دیا۔ وہ مسلمان ہو گیا اور حضور ﷺ سے کہا کہ بہ خدا آپ کے دین سے زیادہ مبغوض دین میری نگاہ میں کوئی دوسرا دین نہ تھا۔ لیکن اب آپؐ کے دین سے محبوب تر میری نظر میں کوئی دین نہیں ہے۔

خیال رہے کہ حدود اللہ یعنی شرعی حدود کا نفاذ اگر کسی پر لازم آ گیا ہو تو اسے ٹالا نہیں جاسکتا۔